حجاب
کراچی
فروری 2020
www.pklibrary.com

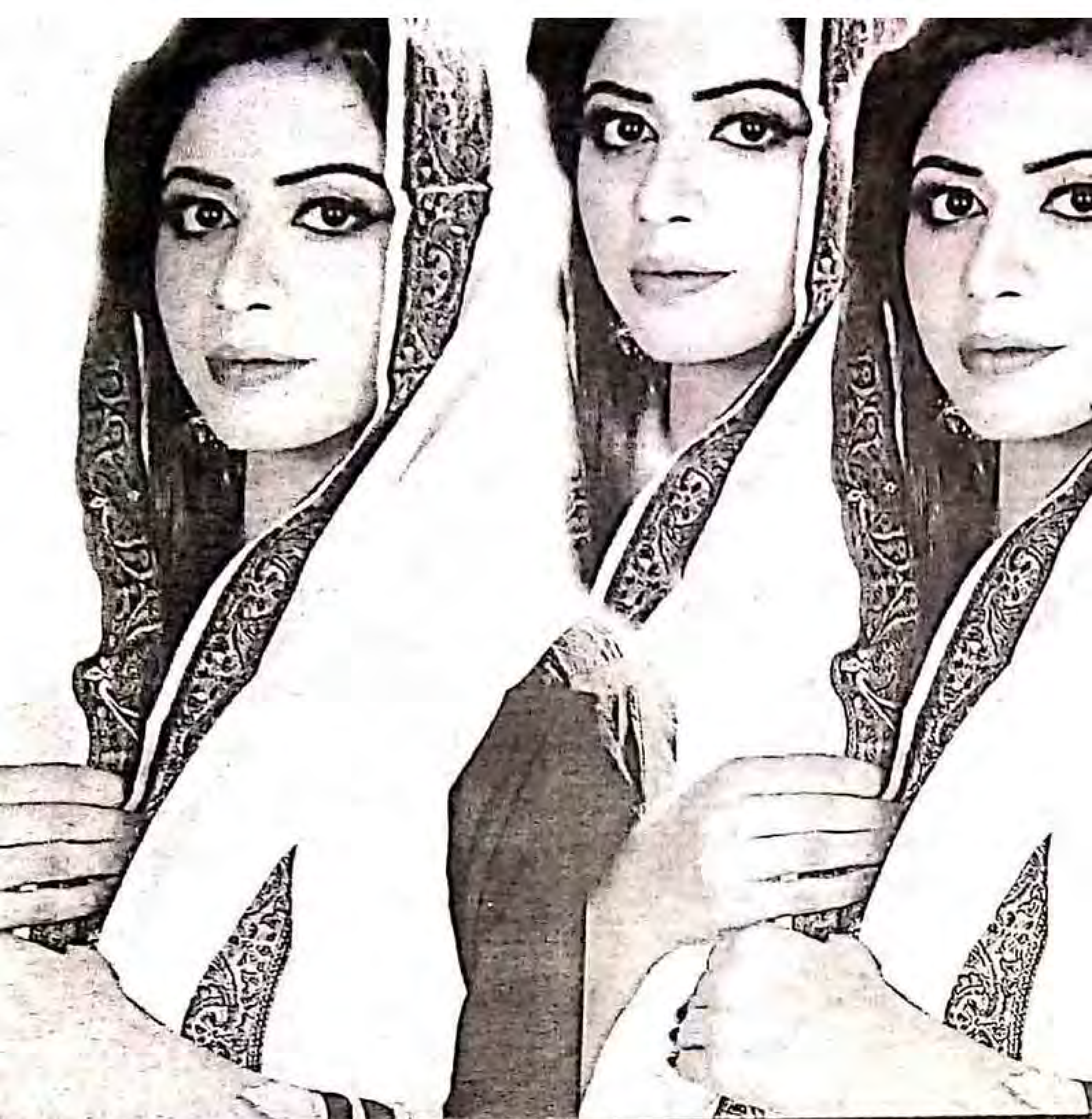

سرورق: جیا طلحہ خان .... عکاسی: موسیٰ رضا

مستقل سلسلے

بزم سخن	سمیہ عثمان	202	شوخیٔ تحریر	حماد ذوالفقار	211
کچن کارنر	زہرہ جبین	204	حسن خیال	جوہی احمد	214
عالم میں انتخاب	زینب احمد	207	دوست کا پیغام آئے	ملیحہ احمد	223

خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2

03008264242 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل Info@naeyufaq.com

خوشبو کے دیے

فرحین اظفر

موسم بہار کی ایک روشن صبح تھی۔ جب اس کی آنکھ پھولوں کی مہکار سے کھلی اور اس نے سرخ گلابوں کا بے حد خوب صورت گلدستہ اپنے سرہانے رکھا ہوا پایا۔

"ارے......!" حیرت سے مسکراتی ہوئی وہ اٹھ بیٹھی اور مندی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گلدستہ اٹھالیا۔ قریب لاکر ایک گہری سانس کھینچی۔ جسم وجاں میں تازگی بھری مہک اتر گئی۔ گلدستہ گود میں رکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر قیاس کے گھوڑے ادھر ادھر دوڑانے کے بعد مایوس ہوکر سر جھٹک دیا۔ نئے سال کے آغاز کے بعد یہ تیسرا گلدستہ تھا جو کسی اجنبی شخص کی طرف سے اس نے وصول کیا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے ایک بار پھر گلدستہ اٹھایا اور سرخ گلابوں کے درمیان اٹکا ہوا ننھا سا کارڈ کھولا۔

"آمد موسم بہار مبارک ہو۔" سنہرے رنگ کی خوب صورت لکھائی میں لکھے گئے الفاظ نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول بکھیر دیئے تھے۔ اسی پل دروازے پر دستک ہوئی۔

"باجی ناشتے کے لیے آجائیں۔" اجازت ملنے پر سلمٰی اندر آکر بولی۔

"اوکے آتی ہوں۔" اس نے خوشوار موڈ میں سر ہلایا۔ سلمٰی پلٹنے لگی تو اچانک ہی اسے خیال آیا۔

"سنو سلمٰی...... یہ بکے کون لایا...... میرا مطلب ہے کس نے بھیجا؟"

"پتا نہیں باجی...... شاید مختار بھائی کو پتا ہوگا۔" اس نے چوکیدار کا نام لیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اسے معلوم تھا مختار سے پوچھنا بے سود ہے اس سے پہلے آنے والے دو گلدستے بھی بالکل اسی طرح کے تھے اور کوریئر سروس والے سے لے کر مختار تک انہیں بھیجنے والے نے اپنا نام راز ہی میں رکھا تھا۔

جو بھی تھا یہ گلدستہ اور ان کے بھیجنے والے اجنبی شخص کا سلسلہ اس کی طبیعت کو خوشگوار ضرور کررہا تھا۔ اب بس انتظار تھا تو اس وقت کا جب انہیں بھیجنے والا خود ہی سامنے آجائے۔

"اوہو اماں...... بس بھی کرو کیا نئی نویلی دلہنوں کی طرح کاجل، چوٹی کرنے لگیں۔" سونے کے ریپر کے اندر چھپی کوئلے کی کان بول پڑی۔

"اے ہٹ بے غیرت......" شمیمہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"شرم نہیں آتی ماں کو اس طرح کہتے۔" اس کی آواز اس لمحے مزید پاٹ دار ہوئی۔

"لو اس میں شرم کیسی، سچ ہی تو کہا ہے۔" تانیہ کی بے نیازیاں عروج پر تھیں۔

"رہن دے...... جانتی ہوں، زمانے بھر کی بچی ہے تو اور وہ تیرا نکھٹو بھائی۔ یہی اولادیں میری قسمت میں رہ گئی تھیں۔"

"ارے اماں...... اولادوں سے یاد آیا......" بے نیاز بنی تانیہ آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

"میرے کالج میں داخلے کے پیسے بھی مانگ لینا۔" شمیمہ نے چادر درست کرتے ہوئے آئینے میں ناگواری سے اپنے شانے کی پشت سے جھانکتا اس کا چہرہ دیکھا۔ شدت شوق، خواہش کی سرخی بن کر اس کے گندمی چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ لو...... ایک اور آئیں۔" اس نے مختصر الفاظ میں تانیہ کے کھلے ہوئے چہرے کو مرجھا دیا۔

"اری کم بخت، جس کام سے جارہی ہوں، وہ بھی تیرا ہی کام ہے اور وہ ہوجائے ناں تو سمجھو سارے دکھ دور ہوجائیں گے۔" شمیمہ نے پلٹ کر بستر سے اپنا بٹوہ اٹھا کر نوٹ گنے۔

"پر اماں...... جہاں اتنا بول گئی وہاں اگر میرے داخلے

کی بات بھی کر لے تو کیا حرج ہے۔" اس نے بدمزہ ہوکر رخ بدلا اور ہٹ دھرمی سے پیر پٹخے۔

"زیادہ بکواس کی ناں تو ساتھ لے کر بھی نہیں جاؤں گی اور ہاں یہ بتا رکشے والا کتنا کرایہ لے گا' کچھ یاد ہے پچھلی بار کتنا لیا تھا۔"

"ڈیڑھ سو روپے۔" تانیہ نے منہ بسورا کر کہا۔

"چل ٹھیک ہے ایک سو ستر رکھ لیتی ہوں' واپسی پر تو آپا گاڑی میں بھجوائے گی ناں۔" اس نے نوٹ گن کر بٹوہ گریبان میں اڑس لیا۔

"چل جلدی کر...... کتنی دیر سے یہاں کھڑی ہے' چادر اوڑھ جا کر...... جا بھی۔" شمیمہ نے تانیہ کی ناراضی کو اہمیت دیے بغیر اسے ہلکے سے باہر دھکیلا۔

"جا رہی ہوں' ایک تو یہ چادر بھی بس مصیبت ہی ہے۔ زمانے بھر کی لڑکیاں ایسے ہی پھرتی ہیں اور ایک ہم ہیں' پردے کی بوبو......" پیر پٹخ کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس کی بڑبڑاہٹ شمیمہ کے کانوں میں منتقل ہوئی۔

شمیمہ نے سر جھٹک کر چادر اوڑھی' نفیس کپڑے اور دیدہ زیب کڑھائی والی یہ چادر بھی اسے تحفے میں ہی ملی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی تھی۔

❁......❁......❁

"السلام علیکم ماما۔" ناشتے پر ہمیشہ کی طرح نورالزماں بیگم اس سے پہلے ہی اس کی منتظر تھیں۔ اس نے سلام کر کے محبت سے پہلے ان کو خود سے لگایا پھر اپنی کرسی سنبھالی تب تک نورالزماں بیگم نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ سلمیٰ ناشتہ لگا رہی تھی۔

"آؤ سلمیٰ...... تم بھی ہمارے ساتھ ہی کرلو ناں۔" اس نے بریڈ اٹھاتے ہوئے فراخدلی سے سلمیٰ کو پیشکش کی۔ سلمیٰ ذرا کی ذرا رکی پھر نورالزماں بیگم کو دیکھا جو بظاہر بڑی سنجیدگی سے جھکے سر کے ساتھ اخبار سامنے پھیلا کر مطالعہ کر رہی تھیں پھر دھیرے سے بولی۔

"نہیں باجی آپ کریں ناشتہ میں نے تو سویرے ہی کرلیا تھا جی۔" سلمیٰ کہہ کر پلٹ گئی' اس کے جانے کے بعد نورالزماں بیگم نے اخبار لپیٹا۔

"یہ کیا حرکت ہے بیٹا؟" وہ بڑے تحمل سے مخاطب ہوئیں۔ وہ مگن سی ناشتہ کرتے ہوئے چونکی۔

"کون سی حرکت ماما؟"

"یہی سلمیٰ کو ناشتے کے لیے کہنے کی...... بیٹا یہ ملازم لوگ ہیں' ان کو ان کی حد میں ہی رکھو تو بہتر رہتا ہے۔"

"ماما......!" اس نے ہمیشہ کی طرح ان کی بات سے متفق نہ ہونے کے باوجود فقط یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا' سر پر چڑھ جائے گی یہ عورت...... ہر وقت ہاتھ پھیلانے لگے گی۔" وہ محبت بھرے انداز میں مگر قدرے زچ ہو کر کہہ رہی تھیں جبکہ وہ مسکراتے ہوئے ناشتہ کرنے لگی۔

جانتی تھی نورالزماں بیگم کا زندگی گزارنے کا اپنا انداز ہے' جس پر وہ سمجھوتا نہیں کرسکتیں۔ ان کا رہن سہن اور معیار زندگی انہیں ملازمین سے فاصلہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے مگر وہ خود ایسی نہیں تھی۔ اسے گھر میں موجود واحد خاتون ملازمہ سلمیٰ سے نہ کوئی پرخاش تھی' نہ جھجک اور نہ کوئی الجھن' اس کا رویہ اور برتاؤ بہت نرم اور دوستانہ تھا۔ وہ نورالزماں بیگم کے جیسی ہوتا تو دور کی بات وہ عادت و مزاج میں ان سے بالکل الٹ تھی۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی شاید وہ ان کا اپنا خون نہیں تھی شاید اس لیے۔

❁......❁......❁

اس نے سرہانے رکھی ادھ کھلی کتاب بند کر کے میز پر رکھی اور گلاب کے پھول گلدان میں سجا دیے۔ قریب تھا کہ مہکتے گلاب انہیں بھیجنے والے اجنبی کے خیال میں دھکیل دیتے کہ دروازے پر ہونے والی دھیمی دستک نے اسے چونکا دیا۔

"السلام علیکم آپی۔" آنے والی تانیہ تھی۔

"ارے تانیہ تم۔" وہ اسے دیکھ کر ایک دم سے کھل اٹھی اور قریب جا کر محبت سے گلے لگا لیا۔

"کب آئیں تم؟"

کے دل میں کھد بدسی ہو رہی تھی' تب ہی صدف اور تانیہ نے ایک ساتھ ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' صدف انہیں سلام کر کے بڑے سلیقے سے ان کے گلے لگی' وہ اسے دعائیں دینے لگیں۔

''جیتی رہو..... خوش رہو..... اللہ سکھی رکھے' ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنو۔'' صدف کے دل و جان کسی میٹھی پھوار سے بھیگنے لگے۔

''ذرا اس کو بھی تھوڑی عقل دے دو۔'' وہ ان سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھی تو شمیمہ نے تانیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہر وقت قینچی کی طرح زبان چلتی رہتی ہے۔ ضد بحث میں سب سے آگے۔ مجال ہے جو کوئی بات آرام وسکون سے مان جائے۔'' وہ شکایت تو کر رہی تھیں مگر ممتا کی محبت بھرے انداز میں پھر بھی تانیہ کو برا لگا۔

''اماں کو تو بس موقع چاہیے میری برائیاں گنوانے کا۔''

''اگر جھوٹ بولوں تو کہو۔'' صدف ان کی باتوں پر مسکراتی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نورالزماں بیگم آ گئیں' ان کے آتے ہی شمیمہ اور تانیہ چپ ہو گئیں۔ دونوں کی نظریں ان کے ہاتھوں میں موجود مخملیں ڈبوں پر تھیں' جن کی ساخت سے ظاہر تھا کہ وہ زیورات کے ڈبے ہیں۔

''میں یہ زیور لینے چلی گئی تھی..... تم آئی ہو تو تمہیں دکھا بھی دوں کیسے بنے ہیں۔'' انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تمام ڈبوں کو درمیانی شیشے کی میز پر رکھ دیا' شمیمہ کا دل اچھل پتھل ہونے لگا' وہ خود بخود سوچنے لگی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ان زیورات میں سے ایک آدھ تانیہ کے لیے بھی ہو مگر ایسا کہاں ممکن تھا۔

نورالزماں بیگم انہیں زیورات دکھانے لگی۔ ایک طرح سے اپنی عمارت کا روب ڈال رہی تھیں۔ ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ اپنے سے کمتر کو وہ کیڑے' مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھیں گو کہ ان کی مدد بھی کرتی تھیں' ایک طرح سے دنیا دکھاوے کا احسان کرتیں انہیں جتاتی بھی تھیں۔

اب وہ نگینوں سے بنا ہار جو گلے میں پہننے پر سینے سے بھی نیچے تک آ جاتا اور اسی کے ساتھ خوب بھاری اور خوب صورت آویزے' انگوٹھی کے ساتھ ہی خوب صورت چین سے جڑا ہوا بریسلیٹ' خوب چوڑا اور بھاری تھا وہ شمیمہ کو فخر سے دکھا رہی تھیں۔

''تم شمیمہ یہ دیکھو..... پازیب میں نے خاص طور پر بنوائی ہیں۔ اپنی صدف کے لیے۔'' شمیمہ کے وجود پر اوس سی پڑ گئی۔ اتنا سب کچھ صرف صدف کے لیے تھا۔

صدف نے ڈرائنگ روم سے باہر جاتے ہوئے ان کی آواز سنی تو خود بخود ایک سرخ گلابوں سے مہکتا گلدستہ دھیان میں آ گیا اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی تھی۔

✿.....✿.....✿

واپسی کے سفر میں ماں بیٹی دونوں خاموش اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ شمیمہ کا موڈ کسی حد تک خراب تھا۔

''حرکت دیکھو ذرا اس عورت کی اتنے بھاری بھاری سیٹ دکھا کر دیا کیا یہ.....'' وہ گھر آ کر بٹوے سے چیک نکال کر تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی' جس پر لاکھ روپے کی رقم درج تھی۔

جاتے وقت شمیمہ نے اتنی رقم کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر اب واپس آ کر امید سے زیادہ ملا تو بھی ناشکری کر رہی تھی۔

''ہائے اللہ..... اماں وہ پازیب دیکھی تھی کتنی خوب صورت تھی۔'' تانیہ کی نگاہوں میں نفیس اور نازک بناوٹ والی سنہری پازیب گھوم رہی تھی۔

''تجھے پازیب یاد آ رہی ہے۔'' شمیمہ نے ناگواری سے بیڈ پر برابر میں بیٹھی تانیہ کو گھورا۔

''وہ سیٹ بھول گئی' بڑا والا اور وہ چھوٹا والا..... کس قدر مہنگے اور کتنے حسین' سب بس اپنی لاڈلی کے لیے بنوا کر رکھ چھوڑے اور ہمیں کیا ملا یہ.....'' وہ منہ بنا کر چیک دیکھنے لگی۔

''اماں..... میری پیاری اماں۔'' تانیہ مکھن لگانے کے سے انداز میں شمیمہ کے قریب ہو کر کندھے سے آن لگی۔

''مجھے بھی ویسی ہی پازیب بنوا دو ناں' آپی کے جیسی۔'' شمیمہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھ

رہی ہو۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تیرا..... پتا بھی ہے کیا قیمت تھی ان کی جوڑی تو چھوڑ میں تو ایک بھی نہیں بنوا سکتی۔"

"اماں.....اماں بنوا دو ناں آج کل تو ایک کا ہی فیشن ہے.....ایک ہی بنوا دو۔"

"چل ہٹ پرے۔" شمیمہ نے اس کی بے وقت کی راگنی سے تنگ آ کر اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"تیرے باپ کی ملیں لگی ہیں ناں جو بنوا دوں۔" وہ بیزار سی اٹھ کر الماری میں بٹوار کھنے چل دی۔

"اور اگر میں دے دوں پیسے تو......" شمیمہ کے ہاتھ رکے اور حیرت سے پلٹ کر دیکھا جو اب اپنے گریبان سے نوٹ نکال کر چمکتے چہرے کے ساتھ ایک ایک کر کے گن رہی تھی۔

وہ چند لمحے تو سکتے کی مانند اسے دیکھتی رہی پھر چیل کی طرح جھپٹی مگر دوسری طرف اس کی اپنی ہی اولاد تھی چوکنی اور ہوشیار عین وقت پر جھکائی دے گئی۔ شمیمہ کا حملہ بیکار گیا وہ خالی ہوا میں غوطہ کھا کر رہ گئی تھی۔

"ادھر آ تانیہ......میں کہہ رہی ہوں مجھے بتا کہاں سے آئے یہ پیسے؟"

"تم نے تو منع کر دیا تھا ناں میں نے داخلے کا بول کر لیے ہیں آپی سے۔" تانیہ نے رخ موڑے موڑے احتیاط سے شمیمہ کو جواب دیتے ہوئے ہاتھ چلائے۔ شمیمہ نے دانت پیسے پھر بڑھ کر اس کے بال دبوچ لیے۔

"چل.....چل میرے حوالے کر۔"

"اماں..... اماں چھوڑ دو۔" اس نے بمشکل خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"پہلے پیسے مجھے دے۔"

"ایک شرط پر دوں گی میرے لیے پازیب بنوا کر دو گی۔" شمیمہ نے اس کی بات سن کر بال اور زور سے دبوچے۔ تانیہ کی چیخ نکل گئی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ مجال ہے جو مٹھی میں دبے نوٹ ذرا سے بھی ڈھیلے کیے ہوں۔

"نہیں دوں گی......نہیں دوں گی۔"

"اچھا..... اچھا ٹھیک ہے بنوا دوں گی پائل...... لا دے اب پیسے۔" شمیمہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضوں کے آگے بہت جلد ہار مان گئی تانیہ نے بال چھوٹتے ہی جھٹ سے نوٹ گن کر نکالے کچھ اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کچھ واپس اندر۔

"پر یاد رکھنا اماں اگر نہیں بنوائی ناں تو آپی کو بتا دوں گی۔" ذرا سی کھینچا تانی سے اس کے بال الجھ گئے تھے۔ کاجل پھیل گیا تھا اور چہرہ پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

"ہاں ہاں...... بولا ہے ناں بنوا دوں گی اور زیادہ منحوسیت نہیں پھیلا ابھی بھی آدھے سے زیادہ تو تُو نے ہی رکھ لیے ہیں۔" شمیمہ اب نوٹ گنتے ہوئے ذرا بدمزہ سی ہو کر بولی۔

"میں نے خود لیے ہیں آپی سے پیسے، تمہارے ہاتھ پر رکھنے کے لیے تھوڑی ہیں۔" وہ تنک ہی تو گئی۔

"چل بے شرم......اب جا کر کچھ ہانڈی روٹی کی فکر کر لے بھائی آتا ہوگا۔" شمیمہ نے ناک پر سے مکھی اڑائی اس کا پائل بنوانے کا دور دور تک بھی کوئی ارادہ نہ تھا تانیہ کی شادی جلد از جلد جو کرنی تھی۔

❀......✿......✿......❀

انسان کی زندگی میں سارے جھگڑے صرف دو الفاظ کے گرد گھومتے ہیں۔

قدرت اور قسمت......قدرت انسان کو اپنی مرضی پر چلاتی ہے اور انسان قسمت کے الٹ پھیر کو سیدھا کرتے کرتے ہی موت کے منہ میں اتر جاتا ہے۔ سالہا سال پہلے نور الزماں بیگم اور شمیمہ بھی ایسے ہی قدرت اور قسمت کے چکر میں پھنسی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب شمیمہ کے گھر ان کی پہلی اولاد یعنی صدف نے جنم لیا تھا۔ گو کہ اللہ نے انہیں رحمت سے نوازا تھا مگر انہیں اس رحمت کی ضرورت تھی نہ خواہش......انہیں نہ ان کے شوہر کو نہ سسرال والوں کو سب لوگ بمع میکہ اور سسرال والے پہلوٹی کے بیٹے کے انتظار میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صدف کی پیدائش کی خبر

سن کر جب انہیں پتا چلا کہ ان کے شوہر اکرام علی نا صرف ان کے پاس آئے بلکہ اپنی اماں کو لے کر گھر بھی چلے گئے۔ شمیمہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ خدانخواستہ پیدائش کی نہیں مرگ کی خبر سن لی ہو۔

اسی ہاسپٹل میں اسی وارڈ میں نورالزماں بیگم بھی زیرِ علاج تھیں۔ ان کے ساتھ بالکل ہی الٹ کھیل ہوا تھا۔ وہ کئی سال سے بیٹی کے وجود کی منتظر تھیں، پہلے ان کو اللہ نے بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔ ان کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد پہلی پیدائش کے وقت ہونے والی پیچیدگی کی وجہ سے انہیں ڈاکٹر کے مشورہ پر کئی سال انتظار کرنا پڑا۔ قریباً پانچ سال بعد انہیں دوبارہ ماں بننے کی خوش خبری ملی اور اس کے ساتھ ہی ان کے شوہر محمد اقبال بیگ صاحب کو نوکری میں ترقی کی خوش خبری ملی۔ ابھی نورالزماں بیگم اپنی آنے والی بیٹی کی خوش خبری کو بیگ صاحب کی ترقی سے نتھی بھی نہیں کر پائی تھیں کہ ان کی بیٹی زندگی ملنے کے چند گھنٹوں بعد ہی دم توڑ گئی۔ وجہ وہی پیچیدگیاں تھیں، جنہوں نے ان کے بیٹے کی دفعہ میں بھی انہیں پریشان کیا تھا۔

"یہ عورت...... اس قدر رو کیوں رہی ہے؟" بیٹی کو کھونے کے کئی گھنٹوں بعد جب انہیں صبر آیا تو ان کی توجہ اس روتی بلکتی عورت کی طرف گئی۔

"بیٹی ہوئی ہے بے چاری کی، پہلی اولاد ہے اس لیے۔" جواب سن کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

وہ اللہ کی رحمت چھن جانے پر آبدیدہ تھیں اور وہ عورت اس رحمت کے مل جانے پر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھی، یہی قدرت کے کھیل ہیں جس کی وہ دونوں فقط ایک مہرہ تھیں۔ یہی قسمت کا لکھا تھا جسے اگر بدلا جاسکتا تھا تو شاید صرف دعا سے۔ وہ اپنے نڈھال درد سے دکھتے وجود کو لے کر اٹھیں اور شمیمہ کے پاس آ بیٹھیں۔

خالق و مالک حقیقی نے اگلے سال ہی شمیمہ کو نعمت سے نواز دیا تھا مگر نورالزماں بیگم کے ساتھ یہ المیہ تھا کہ ڈاکٹر نے انہیں مکمل طور پر مایوس کر دیا تھا۔ بیٹی کو کھونے کے بعد وہ ماں بننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوگئی تھیں۔ ان دنوں انہیں اپنا آپ دنیا میں سب سے زیادہ غمگین اور قابل رحم لگتا تھا اور وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے کبھی خیرات، زکوٰۃ کے نام پر لوگوں میں خوشیاں بانٹتی پھرتی تھیں، قدرت انہیں ایک بار پھر شمیمہ کے گھر لے آئی تھی۔

شمیمہ تیسری بار امید سے تھی اور تین سال کی بچی، گھر والوں کی بے رحم ٹھوکروں اور رویوں پر پل رہی تھی۔ کوئی اس کی ظاہری حالت دیکھ کر فقط چند منٹوں میں گھر میں اس کی حیثیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ بے حد گندے کپڑوں میں دھوپ میں چارپائی پر لال بھبھوکا چہرہ لیے مکھیوں سے نبرد آزما تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں روتے ہوئے ماں کو بلانے کی ناکام کوشش بھی کر رہی تھی۔ نورالزماں بیگم کو چند لمحوں کے لیے اس سے بے پناہ کراہیت محسوس ہوئی مگر ازراہ ہمدردی جب نزدیک جا کر چھوا تو یوں اچھلیں جیسے بجلی کے تاروں کو چھولیا ہو۔ اسے نہ صرف شدید بخار تھا بلکہ اس حال میں بھی وہ دھوپ میں پڑی تھی۔ نورالزماں بیگم کے دل میں حقیقی معنوں میں اس روز پہلی بار اس کے لیے مشروط محبت نے جنم لیا اور اسی روز وہ شمیمہ کے دل میں یہ بات ڈال کر وہاں سے نکلیں کہ اگر وہ صدف کو نورالزمان بیگم کی گود ڈال دے تو یہ یقیناً ان تینوں کے لیے بہتر ہوگا۔

"میں جس رحمت کے لیے اللہ کے آگے دن رات جھولی پھیلائے گڑگڑا رہی ہوں، دنیا والوں کے مایوس کردینے کے بعد بھی اللہ سے لو لگا کر بیٹھی ہوں تو شاید صرف صدف کے لیے ہی۔" شمیمہ نے چند دنوں میں اپنے سسرال والوں خصوصاً صدف کے باپ کا صدف کے ساتھ رویہ دیکھ کر ہی نورالزماں بیگم کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گو کہ شروع میں اس کی ساس اور شوہر نے دنیا والوں کے طعنے تشنے سہنے سے معذوری کا اظہار کیا لیکن ان ہی دنوں نورالزماں بیگم کے شوہر ملک سے باہر چلے گئے، ابھی صدف کے قدم ان کے گھر پڑے بھی نہیں تھے کہ ان کی خوش نصیبی کا ستارہ جگمگانے لگا، یہی وجہ تھی کہ

ان کے ہاتھوں میں دبے نوٹوں نے ان کو مزید کچھ اور سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

صدف نورالزماں بیگم کی گود میں کیا آئی۔ نورالزماں بیگم کو جیسے دنیا کی ساری خوشیاں مل گئی تھیں۔

جاڑے کا موسم دل کو ایک اداسی بھری خاموشی میں مبتلا کردیتا ہے۔ گرما کی نارنجی شامیں شوخ کردیتی ہیں..... خزاں کی رت جہاں بچھڑے ہوؤں کی یاد اور زندگی کا فلسفہ سمجھاتی ہے وہیں بہار کا موسم دل اور مزاج کو نئے رنگ اور نئی جولانیاں عطا کردیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دل کا اپنا ہی موسم ہوتا ہے مگر باہر کا موسم بھی کہیں نہ کہیں اندر کے موسم پر بھی ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے دل کا موسم تو پہلے ہی خوشگوار تھا' اس پر موسم بہار کی دستک نے مزید چار چاند لگا دیئے تھے۔ جب ہی ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی اور آنکھوں میں شرارت سی مچلتی رہتی۔ تصور کسی کے رنگین خیال سے مہکا رہتا اور دل..... وہ تو ہے ہی بچہ۔ اس وقت بھی بھابی کے بلاوے پر ان کے کمرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے لبوں پر ایک شوخ سی دھن تھی۔

آواز دو ہم کو..... ہم کھو گئے۔

"بھابی آپ نے بلایا مجھے۔" سیٹی کی آواز سن کر بھابی کو شوخ نظروں سے خود کو تکتے ہوئے پایا تو سنجیدہ ہونا پڑا۔

"جی ہاں..... اگر آپ گانے کا شوق فرما چکے ہوں تو ذرا مجھے ڈراپ کردیں گے۔"

"آپ کہیں جارہی ہیں.....؟ کہاں۔"

"صدف کی طرف۔" اس نے کانوں میں ٹاپس پہن کر خود کو تنقیدی نظروں سے آخری بار دیکھا اور پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کیا۔

"خیریت تو ہے..... اپنی فرینڈ کی طرف تو آپ جاتی رہتی ہیں' مگر یہ تیاریاں کچھ خاص نہیں آج؟"

"ہاں..... آج اس کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آرہے ہیں۔" اس کا لہجہ سرسری تھا مگر مقابل پر گہرا اثر کر گیا تھا۔

"اتنی اچانک....." ثانیہ نے کلائی میں چوڑی ڈالتے ہوئے ذرا سی نگاہ اٹھا کر اپنے اکلوتے دیور کے تاثرات بغور ملاحظہ کیے۔

"اچانک سے کیا مراد ہے تمہاری..... کیا اسے تمہیں پہلے سے انفارم کرنا چاہیے تھا؟"

"نہیں..... نہیں..... سوری بھابی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ پھر کیا مطلب تھا جناب کا؟" ثانیہ نے سینے پر بازو لپیٹے..... دل میں ایک گدگداتا ہوا سا خیال اچانک ہی بیدار ہوا تھا۔

"کوئی مطلب نہیں تھا بھابی میرا..... کیا ہوگیا ہے چلیں بھی۔" وہ سنبھل کر ہنسا اور پھر نظریں چراتا ہوا باہر نکل گیا۔ ثانیہ لب کا کونا دانتوں میں دبائے بڑی دلچسپی سے اس کی حرکتیں ملاحظہ کررہی تھی۔

آج جن خاص مہمانوں کو انہوں نے صدف کے رشتے کے سلسلے میں بلوایا تھا گو کہ انہیں وہ خاص بھائے تو نہیں تھے مگر ان کی آمد اور تواضع کے انتظامات نے انہیں بہرحال تھکا دیا تھا۔ صدف ان کی اسی تھکن کا خیال کرکے ان کے پیر دبانے بیٹھ گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے گرم دودھ' سکون آور گولی اور مہمانوں کے بارے میں پوچھ بھی رہی تھی۔

نورالزماں بیگم نے نا صرف اسے اپنی بیٹی کہا تھا بلکہ بنا کر بھی دکھایا اور ثابت بھی کردیا تھا۔ جب سے اس کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تھا' وہ ہر آنے والے رشتے کے بارے میں اسے تفصیلاً آگاہ کرتی تھیں' لڑکے کی تصویر بھی دکھاتیں اور آزادانہ اس کی رائے لیتی تھیں۔ انہوں نے زندگی بھر اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا تھا۔ کسی معاملے میں زور زبردستی نہیں کی تھی تو اب بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں' کیونکہ یہ تو بہرحال پوری زندگی کا معاملہ تھا۔ آج اسے دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ جہاں انہیں خود ہی پسند نہیں آئے تھے وہیں صدف کو کسی اور کی بھی یاد دلا گئے

تھے۔

"کوئی اجنبی...... جو گاہے بگاہے کسی عام دن کو خاص بنانے کے لیے اسے سرخ گلابوں کا تحفہ بھیجا کرتا تھا۔

"تم سب باتیں چھوڑو بس یہ بتاؤ کہ کب آ رہے ہو؟" نورالزماں بیگم اس وقت بیرون ملک مقیم اپنے بیٹے سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ صدف ان کی آواز پر چونک کر اپنے خیال سے باہر آئی۔ نورالزماں بیگم کا چہرہ خوشی اور جوش سے تمتما رہا تھا۔

"کیا واقعی......!"

"صدف...... صدف میں بے انتہا خوش ہوں میری بچی...... اشعر واپس آ رہا ہے ہمیشہ کے لیے۔" نورالزماں بیگم صدف کو دیکھ کر خوشی سے بولیں۔

"اوہ ماما...... واقعی یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔"

"ہاں بس...... اب تم کل ہی سلمٰی سے کہہ کر اشعر کا کمرہ بالکل صاف ستھرا کروا دینا ٹھیک ہے۔" انہوں نے جوش و مسرت سے صدف کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے اور دھیرے دھیرے ان پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں سب کروا دوں گی مگر ماما......" وہ محبت سے بولی تو نورالزماں بیگم مسکرا دی تھیں۔

......✿......✿......

دن کافی چڑھ گیا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد سے اشعر کے کمرے کی صفائی کرنے جو آئی تو اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ صفائی مکمل ہو گئی تھی۔ بس وہ آخر میں میز پر رکھی چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دے رہی تھی جب نورالزماں بیگم نے کمرے میں جھانکا۔

"کب سے لگی ہوئی ہے میری بیٹی۔" صاف ستھرے کمرے کی سجاوٹ نے ان کی آنکھوں کی چمک کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ وہ تھکی تھکی سی مسکرا دی۔

"ماما...... وارڈ روب میں سے بہت سے پرانے کپڑے بھی میں نے الگ کر دیئے ہیں۔ دکھاؤں آپ کو پھر آپ کسی کو دے دیجیے گا۔" وہ انہیں اندر آتے دیکھ کر وارڈ روب کی طرف بڑھی لیکن نورالزماں بیگم نے اسے بازوؤں سے تھاما اور بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"اوہو...... وہ میں دیکھ لوں گی، تم ادھر آ کر بیٹھو ذرا مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" ان کے لہجے میں کچھ خاص تھا۔ صدف کچھ کہے بغیر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ نورالزماں بیگم چند لمحے اس کو دیکھتی رہی تھیں پھر بولیں۔

"بیٹا جو بات میں کہنے جا رہی ہوں اسے ذرا حوصلے اور دھیان سے سننا کیونکہ مجھے نہیں پتا کہ وہ بات سننے کے بعد تمہارا ردعمل کیا ہوگا، ہو سکتا ہے...... اس کے بعد تم مجھ سے بدگمان ہو جاؤ یا پھر میں تمہیں کھو دوں۔" ان کی آنکھوں میں نمی چمکی۔

صدف کے مسکراتے ہوئے لب سکڑ گئے۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو ہلکے سے دبایا اور ان کے چہرے کو محبت سے دیکھ کر بولی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ماما کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے آپ کا انداز دیکھ کر کہ آپ جو بات مجھے کہنے جا رہی ہیں وہ میں پہلے سے جانتی ہوں۔" نورالزماں بیگم کو جھٹکا لگا، انہوں نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر الجھن سے بولیں۔

"تم......! تم بھلا کیا جانتی ہو کہ میں کیا کہنے والی ہوں؟"

"میں جانتی ہوں ماما۔" وہ ان کے مزید نزدیک ہوئی۔

"میں جانتی ہوں کہ میں آپ کی نہیں، شمیمہ آنٹی کی اولاد ہوں اور آپ نے بچپن میں مجھے ان سے لے لیا تھا، اپنی بیٹی بنا کر......" نورالزماں بیگم کے لب نیم وا رہ گئے، ان کی حیرت و استعجاب بھری آنکھیں کسی سکتے کے عالم میں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں صدف سے اس انکشاف کو سننے کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف وہ تھی جو بمشکل خود پر قابو رکھ کر انہیں دیکھتی مسکرا رہی تھی۔

گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا اس وقت ان دونوں کے درمیان اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اگر نورالزماں بیگم کے لیے اس حقیقت کو صدف کے سامنے بیان کرنا مشکل تھا تو صدف کے منہ سے سن کر تکلیف دہ بھی بنا تھا۔ صدف نے

خاموشی سے سر جھکایا ہوا تھا۔

"میں نے ایک بار آپ کی اور ان کی باتیں سن لی تھیں۔ میں بہت ڈسٹرب بھی رہی تھی چند دن تک مگر پھر آپ کی بے غرض اور بے انتہا محبت دوسرے رشتے اور جذبے پر غالب آ گئی...... آپ میری ماں ہیں اور میں آپ کی بیٹی ہوں..... آپ نے مجھے ان سے بہت بہتر اور بڑھ کر پالا ہے اور محبت دی ہے۔ اس لیے اب مجھے فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کس نے جنم دیا' میرے لیے بس آپ ہی کافی ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کہاں سے ہلکی سی نمی اس کی آنکھوں پر بھی آ گئی تھی۔

نورالزماں بیگم ابھی بھی سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ صدف نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور دھیرے سے سرگوشی کی۔

"آئی لو یو ماما۔" آنسو نورالزماں بیگم کی آنکھوں میں بھی تھے۔

"میری بچی......" ان کی بانہیں وا ہوئیں اور صدف بے اختیار ان میں سما گئی۔ نورالزماں بیگم خود پر سے اختیار کھو بیٹھیں اور دھیرے سے سسک اٹھیں۔

"بہت سخت ناامیدی کے دن تھے وہ' جب میں ایک دن یونہی شمیمہ کے حال جاننے اس کے گھر کی طرف گئی تھی' بہت برا حال تھا تمہارا...... میں بیٹی کے لیے ترس رہی تھی' اس لیے اس گھر میں تمہاری درگت بنتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے تمہاری ماں سے تمہیں مانگ لیا تھا۔" ان کا بھرایا ہوا لہجہ صدف کو بھی غمزدہ کر گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا چلا کہ تم کب اور کیسے اس حقیقت کو جان گئیں۔ نہ صرف جان گئیں بلکہ خود پر جھیل بھی گئیں' میری بیٹی میری بچی...... تمہیں جو تکلیف پہنچی اس کے لیے مجھے معاف کردو......" ان کے لہجہ میں بے بسی تھی۔ صدف بھی بے اختیار ہو کر سسکنے لگی' نورالزماں بیگم کی بات پر اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"نہیں...... نہیں ماما' میرا مقصد آپ کو کسی احساس جرم میں مبتلا کرنا نہیں تھا' میں تو صرف آپ کو اس مشکل سے نکالنا چاہ رہی تھی جو یہ بات کرتے وقت آپ کو جھیلنی پڑتی' آپ کے دل میں مجھے کھونے کا ڈر کیوں پیدا ہوا ماما۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی اتنی محبت لینے کے بعد' ساری زندگی آپ کے سائے میں پرورش پانے' اتنی بہترین زندگی گزارنے کے بعد آپ کی بیٹی صرف اس بات پر آپ کو چھوڑ کر چلی جائے گی کہ آپ نے اسے جنم نہیں دیا......

نہیں ماما' میں صرف اور صرف آپ کی بیٹی ہوں اور میرے دل میں جو جگہ' محبت اور مقام آپ کا ہے وہ کسی اور کا کبھی بھی نہیں ہوسکتا' کبھی بھی نہیں۔" اس کے آنسو قطار در قطار بہہ کر چہرہ بھگو رہے تھے اور نورالزماں بیگم کی ہتھیلیوں میں رکھا اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ نورالزماں بیگم نے اسے پھر سے اپنے سینے میں چھپا لیا اور بے حد محبت سے اس کا سر تھپکنے لگیں۔

"چلو خیر...... پھر یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگئی کہ میری پیاری بیٹی کو سب سچائی کا بہت پہلے سے علم تھا۔ اب مجھے دوسری بات کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔"

"کون سی دوسری بات ماما......؟" نورالزماں بیگم نے گہری سانس لے کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"جب تم نے ریلائز کر ہی لیا تھا کہ میں تمہاری سگی ماں نہیں ہوں تو یہ بھی سمجھ گئی ہوگی کہ اشعر تمہارا سگا بھائی نہیں ہے۔" صدف ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اگلی بات کیا کرنے والی ہیں۔

"بیٹا میں چاہتی ہوں مجھے تمہیں کبھی بھی ایرے غیرے لوگوں کے ساتھ اس گھر سے رخصت نہیں کرنا پڑے' بیٹی تو میری تم ہو ہی اور اگر بہو بن کر ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ تو......" انہوں نے مسکرا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تو صدف کو لگا انہوں نے اصل دھماکا اب کیا ہے۔

"ماما......!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی نورالزماں بیگم اسے سوچنے کا کہتی کمرے سے نکل گئی تھیں۔

"حیرت کی بات ہے آنٹی نے اس طرح کی بات سوچ کیسے لی؟" وہ اس وقت اپنی واحد اور قریب ترین دوست ثانیہ سے محو گفتگو تھی۔

"وہ سمجھتی ہیں کہ جیسے ان کے اور آنٹی کے معاملے میں میں نے اپنا مائنڈ میک اپ کرلیا تھا بالکل ویسے ہی اشعر بھائی کے بارے میں بھی میرا مائنڈ بن چکا ہوگا کہ وہ میرے سگے بھائی نہیں ہیں۔" اس کا اشارہ نورالزماں بیگم اور شمیمہ کی طرف تھا۔

"تو تم پریشان کیوں ہو نور آنٹی سے صاف کہہ دو ناں کہ تم ایسا نہیں سوچتیں وہ بھی نہ سوچیں۔" ثانیہ اپنی دوست کو سیدھا سادہ مشورہ خلوص نیت سے دے کر مطمئن ہوگئی لیکن صدف کی پریشانی کچھ اور تھی۔

"نہیں کہہ سکتی میں...... وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں اگر میری بات کو دل سے لگالیا تو اور اصل پریشانی تو یہ ہے کہ اگر اشعر بھائی بھی سچائی جانتے ہیں اور وہ بھی ایسا ہی سوچ بیٹھے ہوں تو......" وہ بولتے ہوئے ٹیرس پر نکل آئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کے وجود سے ٹکرا کر اسے تروتازہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔

"نہیں مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا سوچتے ہوں گے کیونکہ اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی تو وہ اتنا عرصہ انتظار کرتے کیا اور تمہاری ماما بھی ان کے واپس آنے کا انتظار نہیں کرتیں وہ دونوں آپس میں مشورہ کر کے بہت پہلے ہی تمہیں آگاہ کرچکے ہوتے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"اور کیا...... تمہیں نہیں لگتا کہ ان کی اچانک آمد پر ہی آنٹی نے تم سے یہ بات کی ہے۔"

"ہاں ایسا ہی ہے...... تو پھر اب میں کیا کروں؟" ثانیہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

صدف کی پریشانی خودساختہ نہیں تھی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے کبھی ماما کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی وہ ان کی بے حد فرماں بردار اولاد تھی۔ دوسری وجہ تھی ان کی بیماری...... ان کو جب سے انجائنا کی تشخیص ہوئی تھی صدف ان کی ہر چھوٹی بڑی بات اور کاموں کا بے حد خیال رکھنے لگی تھی اس طرح کی باتیں نہیں کرتی تھی کہ جس سے ان کو ذرا سی بھی پریشانی ہو یا رنج پہنچے۔

"تم اشعر بھائی سے خود بات کرلو۔"

"واٹ......! پاگل ہوئی ہو کیا میں خود سے کیسے کہہ سکتی ہوں؟" صدف فوری طور پر بدکی۔

"تو پھر ایک کام کرو اس بات کو یہیں رہنے دو ابھی تو آنٹی تم سے جواب نہیں مانگ رہیں ناں جب مانگیں تب کہہ دینا کہ تم ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں...... اشعر بھائی کے آنے تک ان کو ٹالتی رہو ہوسکتا ہے وہ آئیں تو خود ہی انکار کردیں۔" ثانیہ کی بات اس کے دل کو لگی۔

"ہاں یہی ٹھیک رہے گا بعد میں میں تم سے کہلوا دوں گی جو بھی بات ہوگی۔" اس نے ہمیشہ کی طرح مشکل میں ثانیہ کی مدد لینی چاہی ثانیہ دل و جان سے تیار تھی۔

"ہاں ہاں تم بے فکر ہوجاؤ......" ثانیہ سے اپنے مسائل شیئر کر کے وہ پُرسکون ہوگئی تھی۔

"باجی......" ابھی الوداعی کلمات کہہ کر فون بند ہی کیا تھا کہ سلمٰی نے پکارا۔

"وہ...... شمیمہ آنٹی آئی ہیں ثانیہ بی بی بھی ساتھ ہیں۔" اس نے تعجب سے سلمٰی کی شکل دیکھی۔

"ابھی تو چکر لگایا تھا انہوں نے۔" اس کے انداز میں بیزاری نہیں تفکر تھا۔

"اللہ کرے سب خیریت ہو۔" سلمٰی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی تھی۔

نورالزماں بیگم بے حد سنجیدگی سے سنتے ہوئے شمیمہ کا کندھا سہلا رہی تھیں اور شمیمہ کی حالت غیر ہوئے جا رہی تھی۔

"آپا میں بتا نہیں سکتی میں کس منہ سے اور کس دل سے آپ کے پاس آئی ہوں مجھے معاف کردیں آپا میں...... میں حفاظت نہیں کرسکی آپ کی امانت آپ کی

حلال کی کمائی گئی میں حفاظت نہیں کرسکی۔'' شمیمہ کے رنج و غم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

''پتا نہیں کب' کس وقت میں گھر سے نکلی اور کوئی منحوس مارا میری الماری کا صفایا کرگیا۔ہائے میں تو لٹ گئی جو تھوڑا بہت جمع تھا' آسرا تھا سب چلا گیا' ارے کوئی ان ظالموں سے پوچھے ہم غریبوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔'' ابھی محض پندرہ دن پہلے ہی تو وہ ایک لاکھ کا چیک لے کر گئی تھیں۔کیش کروا کر خریداری کے لیے الماری میں رکھے تھے کہ کسی نے چوری کرلیے۔

صدف تو منہ پر ہاتھ رکھ کر رہ گئی۔تانیہ بھی چپکے چپکے سسک رہی تھی۔صدف کو شمیمہ کی حالت پر بے انتہا ترس آرہا تھا۔کیا زندگی تھی ان لوگوں کی بھی۔جب سے ہوش سنبھالا تھا ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتے دیکھا تھا۔بے حد مشکلوں سے کہہ سن کر کہیں اس کا رشتہ ہوا تھا اور اب جب شادی میں کچھ ہی مہینے باقی تھے تو یہ حادثہ پیش آ گیا۔صدف جھکے سر اور اچٹتی نظروں سے حال سے بے حال ہوتی شمیمہ اور بے حد پُرسوچ گہری سنجیدگی لیے بیٹھی نورالزماں بیگم کو دیکھ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے پولیس میں اطلاع کروا دیتے ہیں' چھوٹا سا تو محلہ ہے اور اگر دن کے وقت چوری ہوئی ہے تو تفتیش سے چور پکڑا بھی جاسکتا ہے۔'' نورالزماں بیگم اپنے مخصوص پُروقار اور سنجیدہ انداز میں جب کافی دیر کے بعد بولیں تو شمیمہ کے چہرے کی رنگت اڑگئی۔

''پپ...... پولیس......لیکن آپا......میری تو پورے خاندان اور محلے میں بڑی عزت ہے' اگر پولیس میرے دروازے تک آئے گی تو لوگ کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے۔'' اس نے فی الفور ہاتھ میں تھامے ٹھنڈے مشروب کا گلاس میز پر رکھا۔

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی......'' تانیہ نے بھی اس موقع پر ماں کا ساتھ دینا ضروری سمجھا۔

''وہ تو مجھے پتا ہے کہ یہاں کی پولیس کی حالت کیا ہے' لیکن پھر بھی میں چاہ رہی تھی کہ پولیس ایک بار چکر لگا لے تو اگر چور نہیں بھی پکڑا جاتا تب بھی محلے والوں میں سے کسی کی حرکت ہے تو اسے ذرا سا خوف تو محسوس ہوگا۔''

''لیکن آپا' اس وقت تو خود مجھے پولیس کے نام سے خوف آرہا ہے' تانیہ کے سسرال والے تو بہت نکتہ چینی کریں گے اور اگر انہوں نے وجہ بنا کر رشتہ ہی ختم کردیا تو نہیں......نہیں آپا...... میں ان سب چکروں میں نہیں پڑسکتی۔غریبوں کو کہاں انصاف ملتا ہے' ہمارا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔ ہائے تانیہ...... میری بیٹی کے کھوٹے نصیب۔'' شمیمہ منہ پر دوپٹا رکھ کر اس طرح سسکیں کہ تانیہ نے بھی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک کر رونا شروع کردیا۔

صدف اور نورالزماں بیگم دونوں ہی کچھ بوکھلا سی گئیں پھر صدف نے ہی نورالزماں بیگم کا ہاتھ دبا کر کچھ اشارہ کیا۔ دونوں ماں بیٹی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو صدف......! میرا دل نہیں مانتا۔''

''دل کو منا لیجیے ناں ماما' آپ جانتی ہیں اماں کی ساری فکریں صرف تانیہ کے جہیز اور زیور تک ہی ہیں۔ ہمیں اللہ نے اتنا نوازا ہے میرا کیا ہے میری تو ابھی شادی بھی سر پر نہیں ہے۔'' نورالزماں بیگم ہونٹ بھینچ کر رہ گئیں۔

صدف کی دی گئی تجویز ماننے میں انہیں اندیشہ تھا وہ یہ کہ جو سیٹ وہ تانیہ کو دینے کا کہہ رہی تھی' وہ انہوں نے بے حد چاؤ سے صدف کے لیے بنوایا تھا' ان کا دل یوں کسی اور کو دینے کے لیے راضی نہیں ہورہا تھا اور دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ انہیں شمیمہ کی بات پر ابھی پوری طرح یقین ہی نہیں آیا تھا مگر وہ اس وقت کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں تھیں' شمیمہ کی تانیہ کے سسرال والی بات بھی ٹھیک تھی اوپر سے صدف نے بالکل اچانک ہی یہ کہہ کر انہیں کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اس کے لیے بنائے گئے سیٹ میں سے ایک تانیہ کے لیے دے دیا جائے تاکہ فی الفور شمیمہ کا غم غلط ہوسکے۔

''اور ہمارا کیا ہے' ہم تو ایسے ایک چھوڑ دو دو بنوا سکتے

ہیں۔" کچھ دیر کے لیے نورالزماں بیگم صدف کا فکر مند چہرہ دیکھتی رہیں۔ بہت عرصہ پہلے انہوں نے خاندانی جوش اور خون کے اثر پر بہت باتیں پڑھی اور سنی تھیں اس لمحے صدف کو دیکھتے ہوئے انہیں یہی لگا کہ صدف کے دل میں بھی سگے خون کی محبت اس وقت ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ اس وقت اسے منع کرنا یا اپنے دل کی بات کرنا خود کو اس کی نظروں میں نیچا کرنے کے مترادف ہوگا۔

"ماما پلیز...... جلدی سے فیصلہ کرلیں...... انہیں اس وقت ہم سے صرف زبانی نہیں مالی ہمدردی کی بھی بہت ضرورت ہے۔" گو کہ ان کے حالات بہترین سہی مگر اب اتنے بھی کھلے نہیں تھے کہ لاکھوں کا زیور اٹھا کر دے دیتیں اور پھر فوراً ہی دوسرا لے آتیں لیکن صرف اور صرف صدف کے اسرار پر انہیں اپنی رضامندی کا یہ ترش گھونٹ پینا ہی پڑا تھا۔

......✿......✿......

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی صدف؟" ثانیہ کا ردعمل بھی اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ہفتہ پندرہ دن میں ایک بار صدف سے ملنے آتی تھی اور اگر کسی وجہ سے وہ نہیں آپاتی تو صدف خود ثانیہ کی طرف چلی جاتی تھی۔ نورالزماں بیگم نے اس کے کہنے پر ثانیہ کے لیے گولڈ کا سیٹ شمیمہ کے حوالے کر تو دیا تھا لیکن اس دن کے بعد سے وہ کچھ خاموش سی ہوگئی تھیں اور صدف اسی پریشانی کے لیے اس دن اچانک خود ہی ثانیہ کی طرف چلی آئی تھی۔ حسب توقع ثانیہ نے پوری بات سن کر اسے جھاڑ دیا تھا۔

"عقل نام کی کوئی شے تمہارے اندر سرے سے موجود ہی نہیں۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ سچ ہی کہہ رہی تھیں؟" ثانیہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔

"ثانیہ......! وہ میرے گھر والے ہیں۔" صدف نے کچھ خفگی سے جتایا۔ ثانیہ کو بھی اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"جانتی ہوں گھر والے ہیں۔" وہ نرمی سے بولتی ہوئی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"لیکن انسان ہیں اور وہ بھی زمانے اور حالات کے ستائے ہوئے۔" اس نے تاسف سے گہری سانس بھری۔

"اور یہ جو غربت ہے ناں یہ انسان سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔" صدف سر جھکا کر رہ گئی۔ حقیقتاً اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

"لیکن انہوں نے کبھی بہانے بازی سے ماما سے پیسے نہیں نکلوائے۔" اس کا لہجہ بے حد تھکا ہوا اور پسپائی والا تھا۔

"اوکے...... چھوڑو اب اس بات کو...... آنٹی کا موڈ وقتی طور پر خراب ہوا ہے ٹھیک ہوجائے گا تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔" ثانیہ کے جانے کے بعد اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر ٹیرس پر آ گئی۔

نیچے پورچ میں ایک اور گاڑی کھڑی نظر آرہی تھی۔ جو یقیناً ثانیہ کے دیور کی تھی۔ وہ یونہی لان کی رونقیں اور موسم کی خوب صورتی کو انجوائے کرتے ہوئے اس گاڑی کو دیکھ کر چونکی بلکہ...... نہیں وہ گاڑی نہیں تھی جس نے اسے چونکایا تھا...... ثانیہ کا دیور بھی نہیں تھا کیونکہ وہ اسے جانتی تھی اور بارہا مل بھی چکی تھی۔ وہ کوئی اور چیز تھی جس نے اس کی توجہ کھینچی تھی۔ وہ اس شخص کے ہاتھوں میں تھاما ہوا سرخ گلابوں کا گلدستہ تھا۔ جو اس وقت اس کی مکمل توجہ کا مرکز بن گیا تھا کیونکہ وہ گلدستہ ہو بہو ان ہی گلدستوں جیسا تھا جو بذریعہ کوریئر اسے بھیجے گئے تھے۔

......✿......✿......

شام مغرب کے دھندلکوں میں ڈھل رہی تھی گھر کے چھوٹے سے دالان میں اس وقت نیم روشنی اجالا بکھیرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ اندرونی کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ اور بند دروازہ اس بات کی طرف اشارہ کررہے تھے کہ اندر کوئی خاص کام ہورہا ہے۔ اس نے چائے کے کپ ٹرے میں رکھے اور یونہی بے دھیانی میں جا کر بند دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اپنے دھیان میں مگن

شمیمہ بری طرح بوکھلائی اور جلدی میں اس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی پر یہ کوشش ناکام رہی۔ بے دھیانی میں اندر آنے والی تانیہ اب بڑے دھیان سے شمیمہ کی بوکھلاہٹ اور زمین پر بکھر جانے والے نوٹ دیکھ رہی تھی۔ جو شمیمہ جلدی جلدی ہاتھ مار کر اکٹھے کر رہی تھی۔

"اماں...... کہاں سے آئے یہ پیسے؟" لمحہ بھر میں وہ بنی سے تھانیدارنی میں بدل گئی تھی۔ شمیمہ نے اپنے تئیں بڑا الجھ کر اسے دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر آخری نوٹ اٹھا کر بٹوے میں ٹھونس دیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے اماں؟" اس نے شمیمہ کے انجان بننے پر چائے کی ٹرے تپائی پر پٹخ دی۔

"تجھے مطلب۔" اب کے شمیمہ کو بولنا ہی پڑا۔

"مطلب ہے جب ہی پوچھ رہی ہوں۔" وہ آگے بڑھی شمیمہ جلدی سے الماری بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہوگئی۔

"سچ بتا دے اماں...... وہ چوری والی کہانی جھوٹی تھی ناں؟"

فقط چند لمحے لگے تھے اسے شمیمہ کے انداز سے سچ کو جاننے میں۔

"اے لو...... ان کی سنو...... پاگل ہے کیا تو...... میں جھوٹ کیوں بولوں ایویں میں۔" وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تو پھر اتنے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس...... سیٹ بیچ آئی ہو کیا؟" اس نے مشکوک ہو کر پوچھا۔

"دماغ پھر گیا ہے کیا تیرا...... سیٹ بیچ کر میں نے ذلیل و خوار ہونا ہے آپا کے ہاتھوں۔"

"تو پھر کیا بات ہے بتاتی کیوں نہیں؟" وہ اب ذرا بلند آواز میں بولی۔

"کوئی بات نہیں ہے کہہ تو دیا۔" جواباً شمیمہ بھی چلائی۔

چند لمحے اس کے ارادوں کو تولنے کے بعد تانیہ فیصلہ کن انداز میں بولتی ہوئی واپس مڑی۔

"نہیں بتائے گی ٹھیک ہے میں ابھی آپی کو فون کرتی ہوں کہ اماں کو پیسے مل گئے ہیں چھپی بیٹھی ہوئی تھیں تم......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شمیمہ نے پاگل اچانک اسے پیچھے سے بازو سے پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچی۔

"منحوس ماری...... بھر مر۔" اس نے بازو سے گھسیٹ کر تانیہ کو بیڈ پر پٹخا۔ تکلیف سے تانیہ کے چہرے کا زاویہ بگڑ گیا۔ چند لمحے اس کے سامنے میں بیٹھ کر شمیمہ کینہ توز نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر گہری سانس بھر کر یوں بولی جیسے انگارے چبا رہی ہو۔

"بائیک دلانی ہے سجاد کو...... پیسے کم پڑ رہے تھے۔"

"کیا......؟" تانیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "تو تم نے اماں...... جھوٹ بولا نوراں آنٹی سے؟"

"ہاں بولا...... جھوٹ۔" شمیمہ نے کہنے کے ساتھ ہی تانیہ کو دو تین تھپڑ رسید کیے۔ "بول اب کیا کرے گی؟"

"میں نے کیا کرنا ہے...... میں کون سا کسی کو بتا رہی ہوں پر اماں ایک بات سن لے تو اب کان کھول کے...... سیٹ تو لے آئی ہے پیسے تیرے پاس ہیں اب تو مجھے میری پازیب بنوانی ہی پڑے گی۔" اس نے تنبیہہ کی اور شمیمہ کا جی چاہا کہ اس کی انگلی توڑ کر رکھ دے۔

"مر جا تو منحوس ماری۔" شمیمہ کے کوسنے ایک بار پھر جاری ہوگئے جن کا تانیہ کی سماعت پر چنداں اثر نہ ہوا تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔ شمیمہ کا بھی بول چکنے کے بعد مزاج ذرا بہتر ہوگیا تھا۔

"ویسے اماں...... ایک بات ہے کمال کی ایکٹر ہے تو؟" اس کے انداز میں واضح ستائش تھی۔ شمیمہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کے چہرے پر شرارت دیکھ کر خود بھی جھینپ گئی جیسے بڑی قابل فخر تعریف ہو رہی ہو۔

"چل اب اٹھ جا...... بھائی کے لیے روٹی ڈال جب دیکھو بیٹھی باتیں بناتی رہتی ہے۔"

❀......❀......❀

اشعر اسی ہفتے پاکستان واپس آ رہا تھا لیکن اس نے دن

اور فلائٹ کا وقت نہیں بتایا تھا۔ خیال یہی تھا کہ سرپرائز دینے کے چکروں میں ہے۔ نورالنساء بیگم نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور رہ گئی صدف تو اس کا دل اور دماغ آج کل ایک عجیب سی خوشگوار الجھن میں تھا۔

اس دن ثانیہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے اس کا گزر ثانیہ کے دیور شہروز کے کمرے کے سامنے سے ہوا اور وہ بلا ارادہ ہی اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی اور وہ بھی یوں اکیلے اور بلا اجازت مگر گلابوں کی خوشبو نے اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا تھا یا پھر وہ اس اجنبی کا بھید جاننا چاہتی تھی جو اسے یکے بعد دیگرے تین گلدستے بھیج چکا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ یہ چوتھا گلدستہ اسی کے نام آنے والا ہو۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ سامنے ہی ڈریسنگ پر وہ گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اس کے قریب گئی۔ سرخ گلابوں کی بے حد نفیس اور من موہنی ترتیب کے درمیان ہی کہیں وہ ننھا منا سا کارڈ رکھا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں تر ہونے لگیں ان میں واضح لرزش اتر آئی مگر پھر بھی اس نے وہ کارڈ باہر نکالا اسی دم اس کی پشت پر کوئی کھنکھارا تو وہ بری طرح چونک کر پلٹی اور کارڈ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

"آ...... آئی...... ایم سوری...... میں...... مجھے یہ روز...... مجھے اچھے لگے تو میں دیکھنے کے لیے اندر آ گئی۔" وہ وجیہہ لمبا چوڑا پُرکشش وجود سامنے ہی تھا صدف کو اس سے پہلے اس سے اتنی جھجک اور شرمندگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"کوئی بات نہیں...... گلاب کے پھول ہیں سب ہی کو اچھے لگتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولتے ہوئے نزدیک آیا اور اس کے قدموں میں گرا کارڈ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"غالباً آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ دوسروں کے نجی پیغامات پڑھنا کوئی قابل تعریف عمل نہیں۔"

"میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔" اس نے شرمندگی سے کہا اور سر جھکا لیا۔

"نہیں...... نہیں پلیز معذرت کی ضرورت نہیں میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔" اس کے لہجے میں سچائی بول رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔" اس نے جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

"ویسے آپ چاہیں تو یہ بکے ساتھ لے جاسکتی ہیں۔" پشت پر اس کی خوب صورت آواز ابھری تو وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"جی......؟"

"ہاں......" وہ بے نیازی سے کھڑا تھا۔

"مجھے کسی نے دیا تھا تحفتاً تو میں گھر لے آیا اگر آپ کو اچھے لگ رہے ہیں تو لے جائیں...... نو پرابلم۔" صدف کے چہرے پر ناگواری سی در آئی جسے اس نے کمال مہارت سے چھپایا۔

"جی نہیں میں کسی اور کا تحفہ لے جانا مناسب نہیں سمجھتی اور آپ کے لیے بھی یہ ٹھیک نہیں...... کیا آپ سب کے دیئے ہوئے گفٹس کی اسی طرح ناقدری کرتے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں...... کچھ لوگوں کے تحفے میں بہت زیادہ سنبھال کے بھی رکھتا ہوں۔" وہ حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

وہ ڈریسنگ کے پاس کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پُراثر شخصیت صدف کو اس لمحے اپنے حواسوں پر چھائی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی آج سے پہلے تو اس نے کبھی غور سے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔

"دینے والے پر ڈیپینڈ کرتا ہے اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ دو قدم آگے آیا اور بے حد دھیمے سے بولا۔

"تحفہ دے کر دیکھ لیں۔"

"جی......؟" وہ ہونق سی ہوئی۔ وہ سامنے ہی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ صدف سے مزید ٹھہرنا محال ہوگیا تو وہ تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

اشعر اپنے وعدے کے مطابق ایک دن بالکل اچانک آ گیا تھا۔ مگر خلاف توقع بات یہ ہوئی کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔

وہ اور نورالثرماں بیگم آتی گرمیوں کی ایک نارنجی شام کو انجوائے کرنے لان میں بیٹھی تھیں، چائے سلمٰی ابھی ابھی ان دونوں کے درمیان رکھ کر گئی تھی۔ وہ اور نورالثرماں بیگم بدلتے موسم اور موسم میں دھیرے دھیرے در آتی حدت کے بارے میں بات کر رہی تھیں جب چوکیدار کے دروازہ کھولنے پر ایک اجنبی لڑکی نما عورت نے اندر قدم رکھا۔

صدف چائے کا سپ لیتے ہوئے چونکی، نورالثرماں بیگم کی اس جانب پشت تھی لیکن انہوں نے صدف کا چونکنا محسوس کر لیا تھا۔

"کیا ہوا...... کوئی آیا ہے کیا؟" صدف کے بولنے سے پہلے ہی انہوں نے مڑ کر دیکھا اشعر کے ساتھ کھڑی خاتون کو دیکھ کر وہ بھی الجھ گئی تھیں۔ چوکیدار ان دونوں کے سفری سوٹ کیس گھسیٹ کر اندر لا رہا تھا اور وہ دونوں قدم بہ قدم ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ صدف اور نورالثرماں بیگم بے اختیار کھڑی ہوئیں۔

اشعر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر ان دونوں کے چہرے کسی بھی قسم کے تاثرات سے نہ صرف خالی تھے بلکہ ایک الجھن سی مترشح تھی۔ قریب آنے پر اشعر نے گرم جوشی سے نورالثرماں بیگم کو سلام کیا، جس کا انہوں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اشعر بھی ان کے ردعمل پر سنبھل گیا تھا اور صدف کی طرف متوجہ ہوا، صدف نے بھی جلدی سے سلام کیا۔۔۔۔ یوں لگتا تھا وہ سالوں بعد امریکہ سے نہیں بلکہ محض چند گھنٹوں بعد شاپنگ سے تھک کر واپس آیا ہے۔

"صدف میری چھوٹی بہن ہے اور صدف یہ تمہاری بھابی شمرین۔" اس نے ذرا ٹھہر کر بڑے سکون سے اس کے سر پر بم پھوڑا، صدف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اس نے محتاط نظروں سے نورالثرماں بیگم کو دیکھا جو چہرے پر ناگواری اور پتھریلے تاثرات سجائے انہیں گھور رہی تھیں۔ اشعر نے اپنی بات مکمل کر کے فوراً ہی نورالثرماں بیگم کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔

"امی......" مگر مزید ایک لفظ بھی سنے نورالثرماں بیگم نے قدم بڑھا دیے۔

"امی...... پلیز میری بات تو سنیں۔" اشعر انہیں پکارتا رہ گیا مگر وہ اندر کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

"چلو چھٹی ہوگئی۔" اشعر اور صدف پر چھا جانے والی شرمندگی کی کیفیت کو شمرین کی بھاری اور طنزیہ آواز نے توڑا، اشعر نے خفگی سے اس کو دیکھا۔

"وہ ناراض ہوگئی ہیں، میرا خیال ہے مجھے ان کو پہلے انفارم کر دینا چاہیے تھا۔"

"اوکم آن اشعر، کمرز..... منانے کے لیے بہت وقت ملے گا تمہیں۔ میں بہت تھک گئی ہوں، کیا تم ہمارا کمرہ دکھاؤ گے۔" اس کا انداز بے حد سرد تھا۔ ان دونوں کی شکل دیکھتی صدف جیسے کسی منظر کا حصہ بن گئی تھی۔

"اوکے...... اوکے...... چلو اندر۔" اشعر کو نورالثرماں بیگم کے رویے سے یقیناً دھچکا پہنچا تھا۔ جب ہی وہ سنکڑ سا اندر بڑھ گیا لیکن شمرین نے اشعر کی تقلید کرنے سے پہلے ایک ترچھی نظر صدف پر ڈالی تھی۔ اس ایک نظر میں کیا کچھ نہیں تھا۔ صدف کو اس کے نزدیک اپنی حیثیت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

نورالثرماں بیگم اپنے کمرے میں منہ موڑے بیٹھی تھیں اور اشعر مسلسل انہیں منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ماما پلیز مان جائیں۔ یقین کریں میرا بالکل ارادہ نہیں تھا اس طرح آپ کو بتائے بغیر یہ سب کرنے کا، اگر میں ان چکروں میں پڑتا تو شاید دیر ہو جاتی۔۔۔۔ شمرین کی مدر کو ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا اور وہ شمرین کے معاملے میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کر رہی تھیں سوائے میرے، ایسے میں اگر میں پاکستان آتا آپ کو انفارم کرتا اور پھر لے کر جاتا تو تب تک بہت دیر ہو جاتی۔" نورالثرماں بیگم نے اس کا پورا بیان سن کر ایک ترچھی نظر سے اسے دیکھا۔

"ہاں اور اس قدر قیمتی ہیرے جیسی لڑکی تمہارے ہاتھ سے نکل جاتی تو تم تو کہیں کے نہیں رہتے بیٹا۔"

"ماما پلیز...... وہ واقعی بہت اچھی ہے۔"

"وہ تو مجھے کل اس کا حلیہ دیکھ کر ہی پتا چل گیا تھا۔" اشعر اب کی بار خاموش رہا۔ شہرین جیسا حلیہ واقعی شریف گھرانوں میں پسند کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔ چست جینز مختصر بلاؤز' کھلی پنڈلیاں اور دوپٹہ ندارد۔

"میں میں اس سے کہہ دوں گا بلکہ اسے بتادوں گا کہ کس طرح کے کپڑے پہننے ہیں' کس طرح یہاں رہنا ہے وہ سب مان جائے گی' سب جان جائے گی' فرسٹ ٹائم آئی ہے آپ کا روڈلی بیہیو دیکھ کر پہلے ہی بہت ڈس ہارٹ ہے۔" نورالزماں بیگم کے کمرے کے سامنے سے گزرتی صدف اشعر کی بات سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ شہرین کتنی دل برداشتہ تھی اس کا اندازہ اسے کل رات ہی کھانے کی میز پر ہوگیا تھا جب وہ اشعر اور شہرین کو ڈنر کے لیے بلا کر واپس آرہی تھی تو شہرین کے کچھ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے تھے۔

"اونہہ...... میں بیڈروم میں ہی کھانا کھاؤں گی' مجھے نہیں جانا تمہاری اماں کی بگڑی ہوئی شکل دیکھنے۔"

"شہری بی ہیو یور سیلف۔" شہرین کے الفاظ نے جہاں اس کے قدم روک دیئے تھے' وہیں اشعر کی اس قدر ہلکی سرزنش نے اسے حیرت سے دوچار کردیا تھا۔ نورالزماں بیگم اس کی ماں تھیں اور وہ کس قدر بدتمیزی سے ان کے بارے میں بات کررہی تھی۔

"واٹ بی ہیو اشعر' شادی کی ہے ہم نے اپنی پسند اور مرضی سے۔ کوئی مرڈر تو نہیں کردیا کسی کا' بیٹے ہو تم ان کے ملازم نہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید تنک جاتی' صدف جلدی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

اور آج اشعر کہہ رہا تھا کہ شہرین کا دل نورالزماں بیگم کے رویے پر دکھا ہے۔ حیرت کی بات تھی کہ شہرین کی بدزبانی پر اشعر کا دل نہیں دکھا وہ تاسف سے سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

......❁......❁......

نورالزماں بیگم کی ناراضی ختم ہوگئی تھی انہیں کرنا ہی تھی' آخر کو اشعر ان کا بیٹا تھا پھر بیٹا تو ماؤں کی طاقت ہوا کرتا ہے۔ انہیں بھی اپنی طاقت پر ناز اور بھروسا تھا' لیکن تب تک جب تک اس کی زندگی میں شہرین نہیں آئی تھی' شہرین کے آجانے اور اشعر کے مجبور کرنے پر اسے بطور بہو کے قبول کرلینے کے بعد ان کے اندر سے طاقت و توانائی جیسے یک دم ختم ہوتی جارہی تھی۔ وہ دن بدن کمزور ہونے لگی تھیں۔ زیادہ تر وقت کمرے میں گزارتیں۔ صدف سے دھیمے لہجے میں بات کرتیں۔ شہرین کو اول تو مخاطب ہی نہیں کرتیں' شہرین ہی اگر کوئی بات کرلیتی تو بے انتہا مختصر جواب دیتیں۔ انہوں نے شہرین کو اپنی بہو کے طور پر قبول تو کرلیا تھا لیکن دل میں اسے جگہ نہیں دے پارہی تھیں۔ اس میں کچھ قصور شہرین اور اشعر کا بھی تھا۔ شہرین حد درجہ خود سر اور اپنی مرضی کی مالک تھی۔ اپنے وقت اور مرضی کے مطابق سونا جاگنا' اٹھنا' کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا' اس کے معمولات اور شخصیت میں رتی برابر تبدیلی نہیں آئی تھی اور اشعر جس نے اولین دنوں میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ شہرین کو یہاں کے ماحول کے مطابق ڈھال دے گا اب خود بھی اس کے معمولات اور رویے کے متعلق کوئی تردد کرتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صدف کو تو شہرین نے پہلی نگاہ میں ہی مسترد کردیا تھا' اس بات کا اندازہ صدف کو بخوبی ہوگیا تھا لیکن اگر کچھ الجھن زدہ تھا اس کا پل پل روپ بدلتا رویہ' کبھی وہ صدف کے ساتھ بے حد دوستانہ انداز میں پیش آتی تو کبھی بے حد روکھی ہوجاتی۔ خاص کر نورالزماں بیگم سے کسی تلخ کلامی کے بعد تو اس کا رویہ بے حد ہتک آمیز ہوجاتا۔ نتیجتاً صدف نے اس سے دور رہنے میں ہی عافیت جانی اور آہستہ آہستہ وہ بھی اپنے خول میں سمٹ کر نورالزماں بیگم کی طرح کمرے تک محدود رہنے لگی تھی۔ البتہ ثانیہ سے اس کی دوستی اپنی جگہ قائم تھی۔ ہر دوسرے روز وہ اسے فون کرکے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتی اور ہفتہ پندرہ دن

میں اس کی طرف چکر بھی لگالیتی۔ اس وقت بھی وہ اسی ارادے سے باہر آئی تو پتا چلا کہ شہرین اسی وقت کہیں باہر سے آئی تھی۔ صدف کو اس کی روٹین پر بے حد حیرت ہوتی تھی۔ اشعر کہتا تھا کہ وہ پہلی بار پاکستان آئی ہے لیکن جس حساب سے وہ ہر جگہ گھومتی پھر رہی تھی اس سے تو لگتا تھا کہ وہ ہر سال پاکستان آتی رہتی ہے۔ یہاں آنے کے بعد سے لے کر اب تک اس نے سوائے شاپنگ کے دوسرا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ بطور خاص پاکستان صرف شاپنگ کے لیے ہی آئی ہے۔ ایک سے ایک مہنگا ڈیزائنر اور ویسٹرن اسٹائل لباس اس کے تن پر سجا ہوتا تھا' صدف سوچنے پر مجبور تھی کہ جب اسے مستقل گھر پر ہی رہنا تھا تو اس قدر کپڑوں کی ضرورت آخر کیوں پڑ رہی تھی مگر یہ اور اس جیسی کتنی ہی باتیں جو شہرین کے حوالے سے اسے پریشان یا حیرت زدہ کرتی تھیں وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی کہنے کی ہمت کبھی نہیں کرسکی تھی۔

"ہیلو۔" صدف خاموشی سے اس کے پاس سے گزر جانا چاہتی تھی مگر وہ راستے میں کھڑی جس انداز میں اس سے مخاطب ہوئی اسے رکنا پڑا۔

"کہاں کی تیاری ہے دن ڈھلے؟"

"میں ذرا ثانیہ کی طرف جارہی ہوں۔" اس نے سرسری سے انداز میں بتایا۔ شہرین نے ہونٹ سکیڑ کر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

گلابی اور سفید رنگوں کے لان کے سوٹ میں ملبوس اس کا نازک سراپا اور نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اسی حساب سے میک اپ اور جیولری بھی بے حد نفیس اور نازک پہنی ہوئی تھی۔ پوری آستینیں' شیروانی کالر' چوڑی دار پائجامہ اور سر پر آنچل کی وجہ سے وہ سر سے پیر تک مشرقی حسن کا شاہکار معلوم ہورہی تھی۔ اس کے برعکس شہرین ہمیشہ کی طرح ٹخنوں سے اونچی جینز اور شارٹ شرٹ میں گلے میں جھولتا اسکارف' سنہری زلفوں اور بے حد مختصر آستینوں سے نکلی سڈول بازوؤں میں وہ خود مغربی بے باکی تصویر کی مانند تھی۔

"ویل..... تیاری بہت خاص معلوم ہوتی ہے کل چلی جانا۔" اس کی بات بے حد غیر متوقع تھی۔ صدف نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر اس کی بے نیازی بڑی مستقل سی تھی۔

"کیوں..... کل کیوں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے دیکھ نہیں رہی..... شام ہورہی ہے ماما تو بہت برا مناتی ہیں ناں اس ٹائم گھر سے باہر جانا۔" نجانے وہ کیا جتانا چارہی تھی۔ صدف گڑبڑائی۔

"جی لیکن وہ میری بچپن کی دوست ہے اور میں اکثر اسی وقت اس کے گھر جاتی ہوں۔" اس نے وضاحت دی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ اگر میں بھی اکثر اسی ٹائم جانے لگوں تو آنٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

"اس کا گھر قریب میں ہی ہے اور ماما اسے بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔" شہرین نے ایک ادا سے اسے دیکھا۔

"اور اس کے دیور شہروز کو بھی....." صدف بھونچکا رہ گئی جبکہ شہرین ایک طنزیہ مسکراہٹ اس پر اچھال کر اندر چلی گئی۔

صدف کا سارا موڈ غارت ہوگیا تھا اگر وہ فون کر کے ثانیہ سے کہہ نہ چکی ہوتی تو یقیناً وہیں سے پلٹ جاتی مگر نہ جانا یقیناً ٹھیک نہ ہوتا۔ ثانیہ نے اسے بے حد خوشی اور جوش بھرے جذبات سے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ اس کے لیے کوئی سرپرائز ہے۔ وہ بہرحال اس کی خوشی میں شریک ہونا چاہتی تھی اس لیے بادل نخواستہ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

ثانیہ نے اسے کھانے تک روکا' اس کا شوہر عارض اور دیور شہروز دونوں ہی کسی کام کے سلسلے میں باہر تھے۔ وہ بے حد خوشی سے صدف سے ملی اور کھانے تک چمکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی' صدف اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھی۔ اس لیے خود سے قیاس آرائی کرنے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد اسے بیڈروم میں

لاکر ثانیہ نے اس کے کانوں میں جو سرگوشی کی تھی وہ حیران ہوکر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"رئیلی ثانیہ......؟" اس نے ملی جلی حیرت وخوشی سے پوچھا۔ ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور صدف نے اسے گول گول گھما ڈالا۔

وہ شادی کے کئی سال بعد ماں بننے جارہی تھی۔ اس کی شادی کم عمری میں عارض سے کردی گئی تھی۔ فی الوقت اس کی ازدواجی زندگی میں فقط یہی ایک کمی تھی مگر صد شکر کہ اللہ نے اسے زیادہ عرصے مایوس نہیں رکھا تھا۔ اس کی دعائیں اور امیدیں رنگ لارہی تھیں اور صدف ان رنگوں میں جی جان سے شریک تھی۔ دونوں سہیلیاں آنے والے وقت کا تصور کرکے کھلکھلارہی تھیں۔

"میں اس سے خود کو آنی کہلواؤں گی مجھے بڑا پسند ہے یہ لفظ۔"

"ہاں ہاں فکر مت کرو نام بھی تمہاری اور شہروز کی مشاورت سے ہی رکھا جائے گا۔" روانی میں ثانیہ کے منہ سے نکلا اور صدف چونک گئی۔

"کیوں......میری اور......اور شہروز کی کیوں؟" اس کا سراپا نگاہوں میں لہرایا تو وہ نام لیتے ہوئے ذرا اٹکی۔

"اوہو......اب اس کا کوئی اور رشتہ تو ہے نہیں قریبی تم ہی اس کی خالہ ہو اور شہروز ہی اس کا چاچو ہوگا ناں......اس لیے۔" ثانیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس بات کا اسے اکثر ہی احساس رہتا تھا کہ بہن بھائی نہ ہونے کی وجہ سے اس نے کئی مواقع پر ان کی کمی بہت محسوس کی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے دھیانی میں اسی طرح کی بات کرگئی تھی۔ صدف نے اسے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

"سب سے قریبی رشتہ تو ماں اور باپ کا ہوتا ہے تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں کم سے کم یہ رشتہ تو مکمل اور بھرپور ملے......" اس نے مسکراتے ہوئے جس انداز میں ثانیہ سے کہا ثانیہ کے مسکراتے لب اچانک ہی سکڑ گئے تھے۔

......✿......✿......

نورالزماں بیگم بیٹھی اپنے بیٹے اشعر کو جائیداد کی تفصیل سے آگاہ کررہی تھیں۔ اس وقت صدف کی غیر موجودگی میں انہوں نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنی وصیت سنانے کے لیے ہی بلوایا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ کوٹھی جو کہ تقریباً ہزار گز کے طویل وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اشعر کے نام تھی جبکہ دو دکانیں جن کا ماہانہ کرایہ اچھا خاصا آجاتا تھا وہ صدف کے نام تھیں۔ شہر کے متوسط علاقے میں نسبتاً کم رقبے کے دو پلاٹس تھے جن میں سے ایک اشعر کے اور دوسرا صدف کے نام تھا۔ اشعر اور وہ دونوں ان کی وصیت اور جائیداد کے بٹوارے کی تفصیلات سننے کے بعد جب ان کے کمرے سے نکلے تو کافی رنجیدہ تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی شہرین نے مزاج کے مطابق اشعر پر طنز کرنے میں دیر نہیں کی۔

"کیا منصفانہ تقسیم ہے۔" فکرمند تو اشعر بھی تھا مگر وہ اس کی طرح اپنی ماں سے متنفر نہیں ہوا تھا۔ شہرین اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔

"میں تو شکر ادا کررہی ہوں کہ تم لوگ جدی پشتی رئیس نہیں۔"

"کیوں......؟" اشعر اس کی بات سن کر چونکا۔

"کیونکہ اگر نورالزماں آنٹی......" (وہ جب بھی ان کا نام لیتی تو ایک خاص طنزیہ انداز میں جیسے 'ملکہ عالیہ' کہہ رہی ہو) کے پاس خاندانی زیورات کے نام پر جو بھی ہیرے جواہرات ہوتے آئی ایم شیور سب کے سب صدف کے حصے میں جاتے۔" ناک اور منہ چڑھا کر اس نے بے انتہا چڑ کر کہا۔

وہ واقعی بے حد چڑی ہوئی تھی کیونکہ اشعر نے اسے اپنے باپ کی جس دولت وجائیداد کی تفصیلات سنائی تھیں اور درحقیقت جنہیں سن کر وہ متاثر ہوکر اشعر کی زندگی میں شامل ہوئی تھی وہ دولت اور جائیداد اس وقت صرف ایک مذاق محسوس ہورہا تھا۔

"صرف ایک یہ بڑا سا مکان دو دکانیں اور دو پلاٹس اور بس......" اس کی جھنجلاہٹ اب رفتہ رفتہ غصے میں تبدیل ہورہی تھی۔

''ڈونٹ بی سلی۔'' اشعر نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

''آئی ایم ناٹ سلی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ ''یو آر ٹوٹلی اسٹوپڈ اینڈ لائیر۔'' (میں بے وقوف نہیں ہوں اصل میں تم احمق اور جھوٹے ہو)

''کیوں...... میں نے کیا جھوٹ بولا ہے تم سے؟'' اشعر کو اس کا اتنا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ پاکستان میں تمہارے باپ کی اتنی جائیداد اور اتنی آمدنی ہے کہ ہم وہاں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں امریکہ کی مشقت بھری لائف چھوڑ کر یہاں کی لگژریز میں آ جانا چاہیے اور یہاں...... یہاں جائیداد کے نام پر ہے کیا تمہارے لیے صرف یہ...... یہ ایک گھر اور ایک پلاٹ ہمارے کس کام کا؟'' وہ اشعر کے سامنے اونچا بول رہی تھی۔

اشعر کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شہرین واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے پاس شہرین کی بات کا کوئی جواب ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے سوچا نہیں تھا کہ نورالزماں بیگم جو ہمیشہ ہر معاملے میں صدف کو اس کے برابر لاتی رہی ہیں یہاں بھی یہی معاملہ کریں گی۔ اگر انصاف سے دیکھا جاتا تو انہوں نے برابری کی تقسیم میں واقعی برابری سے ہی کام لیا تھا۔

اشعر مرد تھا گھر سے نکل کر کھا اور کما سکتا تھا' اس لیے یہ گھر اس کے نام تھا مگر صدف لڑکی تھی' کل کو اس کی شادی اور جہیز کی تیاری اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی' اس لیے دکانیں اس کے نام کی تھیں تاکہ ابھی اور آنے والے وقت یعنی سسرال میں بھی اسے کسی قسم کا احساس کمتری یا غیر محفوظ ہونے کا احساس نہ ہو' ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اسے اپنی کفالت کے لیے کسی کا محتاج نہ بننا پڑے۔ وہ صرف صدف کو اپنے پیروں پر کھڑا دیکھنا چاہتی تھیں' اس لیے مستقل آمدنی کے ذرائع صدف کو دیئے۔ دوسری اور اہم بات یہ کہ صدف ان کی سگی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے اپنی زندگی میں ہی بٹوارہ کر دیا تھا ورنہ جس طرح کی شہرین کے تیور اور اشعر کی زبان بندی وہ دیکھ رہی تھیں اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ شہرین کے علم میں آ جانے اور نورالزماں بیگم کے گزر جانے کے بعد وہ صدف کو چورا ہے پر کھڑا کر دیتی اور اشعر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ شہرین کا انداز دیکھنے کے باوجود نہیں جانے کیوں دل سے یقین تھا کہ شہرین صدف کی خیر خواہ نہیں جبکہ دوسری طرف شہرین سے زیادہ اشعر اس سوچ میں تھا کہ آخر ماما نے اس کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں کی۔

''کوئی بات نہیں...... ابھی کون سا صدف کی شادی ہوئی ہے' ابھی تو گھر کا خرچا دکانوں کے کرائے سے ہی چلتا ہے ناں۔'' اشعر نے شہرین سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ وہ اس معاملے میں اپنی لاپروائی کو مورد الزام ٹھہرانے کو تیار نہ تھا جس کی وجہ سے اس نے سالوں کی کمائی امریکہ میں کمائی اور دونوں ہاتھوں سے وہیں لٹا بھی دی تھی' آرام دہ اور پرآسائش رہائش' بے فکری' کھانا پینا اور گھومنا پھرنا...... اس نے امریکہ میں اپنی تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے بہترین نوکری کی تھی لیکن پاکستان کے پچانوے فیصد نوجوانوں کی طرح مستقبل کی کوئی فکر نہیں کی' اس کی ماں اور بہن اب تک باپ کے خون پسینے کی کمائی سے خریدی گئی دکانوں کے بل بوتے پر زندگی گزار رہی تھیں۔

''اچھا......'' شہرین نے بے حد طنز سے اسے دیکھا۔

''اور تین سالوں کے بعد جب اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ اپنی دکانیں اور پراپرٹی لے جا کر اپنے شوہر کو گفٹ کر دے گی تو ہم کیا ہوا کھائیں گے یہاں بیٹھ کر......'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ صدف اور نورالزماں بیگم کو کچا چبا جائے۔

''پلیز تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو سکتی ہو۔'' اشعر بالآخر جھنجلا گیا۔

''نہیں بالکل نہیں' کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ...... لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔''

''تو کیا کروں مر جاؤں۔'' اشعر کا ضبط جواب دے گیا۔

"مرنے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ اگر تم واپس وہیں دفعان ہوجاؤ جہاں سے آئے ہو۔" بات مکمل کر کے وہ کمرے سے چلی گئی جبکہ اشعر سر تھام کر بیٹھا رہ گیا تھا۔

"آ گئی تمہیں بہن کی یاد۔" اس نے مسلسل بجتے اپنے موبائل فون کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کال ریسیو کرلی تھی لہجے میں طنز سے زیادہ زہر بھرا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی تم کون سا میری یاد میں مری جارہی ہو...... تم وہاں کی رنگینیوں اور لگژری کو انجوائے......" دوسری طرف بھی شہرین کا بھائی ہی تھا۔

"بس بھائی بس...... انف از انف یار......"

"کیوں کیا ہوا؟" دوسری جانب تعجب ابھرا۔

"کوئی لگژری لائف نہیں ہے یہاں۔" اس نے خوب جما جما کر جملہ ادا کیا۔

"تو پھر......"

"تو پھر صرف ہرے ہرے باغ تھے...... بنڈل آف لائز۔" (جھوٹ کے پلندے) دوسری جانب خاموشی رہی۔

"بڑی بی نے ساری ارننگ پراپرٹی بیٹی کے نام کررکھی ہے اور اشعر کو صرف یہ گھر ملا ہے اولڈ دس ہاؤس ڈویو ریجن۔ (کیا تم تصور کرسکتے ہو) اور پراپرٹی بھی کوئی خاص نہیں ہر چلتے پھرتے کے پاس ہوتی ہے۔ ایک دو پلاٹ اور دکانیں...... اس نے پتا نہیں کون سے گئے گزرے آرفنا یج میں آنکھ کھولی تھی جو اسے اپنے باپ کی جائیدادیں نظر آتی تھیں۔"

"پھر...... یہ تو بہت برا ہوا...... یعنی اشعر صاحب کی عیاشیاں صرف امریکہ کی حد تک محدود تھیں۔" اس نے حیرت ودکھ کا اظہار کیا۔

"ارے کیا عیاشیاں اور کیسی عیاشیاں ذرا سا اوڑھ پہن کیا لیا اور بڑے نواب ہوگئے ہم۔" وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی نیت کبھی نہیں بھرتی اور جن کی بھوک خزانے کھا کر بھی سیر نہیں ہوتی۔

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ویسے تو لوگ بڑے مسلمان بنے پھرتے ہیں مگر وصیت کرتے وقت ان کے نام نہاد اسلام کو موت پڑ جاتی ہے۔" اس کا طرز تخاطب کہیں سے بھی ایک امریکہ پلٹ عورت کے لب ولہجے سے میل نہیں کھا رہا تھا۔

"اوکے...... اوکے۔" دوسری طرف شہری عرف شہرین نے اس کے بھوکی شیرنی جیسے انداز کو ٹھنڈا کیا۔

"کرتے ہیں کچھ اور سوچتے ہیں کچھ...... تم بتاؤ تم نے اپنے شوہر نامدار سے میرے پاکستان آنے کے متعلق کوئی بات کی؟"

"ماما ثانیہ کے گھر خوشی آنے والی ہے اس نے آپ سے بہت سی دعاؤں کا کہا ہے۔" دوسرے دن ناشتے کی میز پر صدف نے خوشی سے چہکتے لہجے میں نورالزماں بیگم کو خبر دی۔ سلائس پر مارجرین لگاتے ہوئے شہرین نے ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی اور ہمیشہ کی طرح طنز سے مسکرادی۔

(خوش تو ایسے ہورہی ہے جیسے اس کے بجائے خود......) اس نے اپنی سوچ سے خود ہی حظ اٹھایا اور دوبارہ ایک اڑتی ہوئی نگاہ حاضرین پر ڈالی۔

"ہاں بھئی بے شک بے چاری نے بہت سال اس خوشی کے لیے انتظار کیا ہے بس اللہ سب کی مرادیں پوری کرے سب کے آنگن میں رونق آئے۔ اللہ سب لوگوں کو اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازے۔" نورالزماں بیگم پُروقار سنجیدہ اور نرم انداز میں بات کررہی تھیں جب اچانک ہی شہرین کی آواز گونجی۔

"خیریت تو ہے آج سب لوگوں کا خیال کیسے آ گیا؟" اس کی آواز میں طنز کی گہری کاٹ تھی صدف ہکا بکا رہ گئی۔ اشعر جو ناشتے میں مگن تھا۔ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کس انداز میں بات کررہی ہو تم؟" بہت کم ایسے مواقع آئے تھے جب نورالزماں بیگم نے اسے خود سے مخاطب کیا ہو۔

"کیوں...... کیا ہوا؟" اس نے بے حد معصومیت

سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ”میرا انداز آپ کے انداز سے تو بہتر ہی ہے۔“ اس نے اسی جلے کٹے انداز میں سلائس کترا۔

”کیوں...... میرے انداز کو کیا ہوا؟“ انہیں تعجب گزرا۔

”او...... اتنی معصوم کیوں بن رہی ہیں...... اشعر کے سامنے خود کو سیدھا سادا پوز کرنے کے لیے...... صاف کیوں نہیں کہتیں کہ سب لوگوں کی بات کرکے آپ دراصل ہماری طرف اشارہ کررہی ہیں۔“

”تمہاری طرف......!“ ان کی حیرت بجا تھی۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ جس عورت سے وہ الجھ رہی ہیں وہ تو چالاک ومکار ہے اور وہ تو پھر ایک صاف دل اور عمر رسیدہ خاتون تھیں۔

”اور نہیں تو کیا...... کہہ دیں اب کہ آپ باتوں ہی باتوں میں میری اور اشعر کی طرف اشارہ نہیں کررہی تھیں؟“ اس نے سلائس پٹخا نورالزماں بیگم اس کو منہ کھولے حیرانگی سے دیکھ رہی تھیں دوسری طرف اشعر وہ بات سمجھنے کی کوشش میں تھا جو آدھی سے زیادہ اس نے سنی ہی نہیں تھی۔

”شہری...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ پھر بھی اس نے شہرین کو ٹوکا۔

”بدتمیزی...... تمہیں تو لگے گی بدتمیزی کیونکہ تمہاری تو ماں ہیں ناں تمہیں ان کے الفاظ میں چھپے معنی کیوں دکھائی دینے لگے ارے میں کیا اپنی مرضی سے ماں نہیں بن رہی کیا اگر میرے بچے نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔“ آن کی آن میں اس کی آنکھیں بھر آئیں آواز تو تھی ہی بلند بھرا بھی گئی۔ نورالزماں بیگم ایک شاک کے عالم میں اشعر کی طرف مڑیں۔

”تم دیکھ رہے ہو اشعر...... یہ کس طرح......“ ان کی بات مکمل نہیں ہوسکی شہرین ایک جھٹکے سے کرسی پیچھے کرکے اٹھی۔

”دیکھ تو یہ سب رہے ہیں...... اللہ کرے کچھ سمجھیں بھی۔“ وہ دھپ دھپ کرتی باہر چلی گئی۔

”ماما...... پلیز آپ ناشتہ کریں۔“ صدف نے ماحول پر چھائی کثافت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اشعر اپنی جگہ چپ بنا بیٹھا رہا۔

”بھائی پلیز...... آپ بھی ناشتہ کریں۔“ اشعر نے غصے سے پلیٹ سرکائی۔

”اس ماحول میں کون کرسکتا ہے ناشتہ۔“

”ہاں تو ماحول تمہاری بیوی نے خراب کیا ہے اسے سمجھاؤ جاکر۔“ نورالزماں بیگم مزید برداشت نہیں کرسکیں۔

”اسے تو میں سمجھا ہی لوں گا مگر ماما...... آپ...... پلیز آپ بھی تو کچھ سمجھیں...... کیوں اشاروں کنایوں میں اسے جتا رہی ہیں۔“ نورالزماں بیگم کو صدمہ تو اصل میں اب ہوا تھا شاک شہرین کی نہیں اشعر کی باتوں سے لگا تھا وہ اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکیں لیکن صدف سے خاموش رہنا مشکل ہوگیا۔

”اشعر بھائی...... کس طرح بات کررہے ہیں آپ ماما سے؟ ماما نے ایسا کچھ نہیں کہا کہ......“ اس کا انداز صورت حال کے برعکس بے حد دھیما تھا پھر بھی اشعر سے پوری بات نہیں سنی گئی۔

”رہنے دو تم بس...... تمہیں کیا پتا جو کچھ بھی کہنا تھا وہ تو کل ہی کہہ چکی ہیں ماما۔“ بات مکمل کرکے وہ رکا نہیں اس کا رخ بھی اپنے بیڈروم کی طرف تھا۔

نورالزماں بیگم پے درپے ہونے والے حملوں سے پسپا سی ہوگئیں ان کے آگے کب کسی نے اپنی آواز اتنی بلند کی تھی اور خصوصاً ان کی اپنی اولاد نے۔ انہوں نے سر ہاتھوں میں گرالیا صدف نرمی سے ان کا شانہ سہلانے لگی لیکن بولنے کے لیے الفاظ تلاشنا مشکل ہورہے تھے۔ وہ جانتی تھی اس وقت شہرین نے بالکل فضول بات پر ہنگامہ کیا ہے لیکن کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا لیکن نورالزماں بیگم شہرین سے زیادہ اشعر کی بدتمیزی پر دکھی تھیں۔ یہ بات اسے اچھی طرح پتا تھی۔

پورا دن نورالزماں بیگم کے سر میں شدید درد رہا تھا' صدف ان کے سرہانے سے لگی ان کا سر دبائی رہی تھی اور شہرین اپنا خون جلا رہی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ نورالزماں بیگم کے سر درد کی اصل وجہ بھی وہ خود ہی تھی اور اگر غیر جانب داری سے دیکھا جاتا تو ساری غلطی شہرین کی تھی جو بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی مگر وہ کیا کرتی اپنی ذہنیت کا جس میں لالچ اور حسد کوٹ کوٹ کر بھرے ہوا تھا۔ نورالزماں بیگم کے ہی زور دینے پر صدف بہ مشکل اپنے کمرے میں آئی تھی اور اس کے بعد نورالزماں بیگم دوا کے زیراثر گہری نیند میں چلی گئی تھیں۔

کئی گھنٹوں بعد جب سارا گھر خواب خرگوش میں تھا۔ اشعر کے کمرے کا دروازہ بے حد آہستگی سے کھلا اور شہرین موبائل کان سے لگائے باتیں کرتی دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر کچن میں چلی آئی۔

"ہاں ہاں مجھے سب پتا ہے' میں کیا شو آف کو سمجھتی نہیں۔" جانے کون موضوع گفتگو تھا۔

اسی دم علاقے میں پہرہ دیتے چوکیدار کی تیز سیٹی کی آواز پوری فضا میں گونجی اور گہری نیند سوتی نورالزماں بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے تو انہیں اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنی کیفیت کا اندازہ کرتے گزرے پھر پیاس سے حلق میں پڑتے کانٹے سب پر حاوی ہوگئے۔ میز پر رکھا جگ خالی ہوچکا تھا۔ کافی دیر آرام کرلینے کے بعد اب انہیں اپنی طبیعت بھی کافی بہتر لگ رہی تھی۔ چنانچہ خود اٹھ کر کچن تک جگ لے کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ بے حد مدہم قدموں سے کچن کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رکیں۔

کچن خالی نہیں تھا' رات کے اس پہر وہاں پہلے سے کوئی موجود تھا۔ یقیناً شہرین جس کی بھاری آواز کو وہ اب ہزاروں میں پہچان سکتی تھیں۔ یقیناً اب وہاں ان کا مزید ٹھہرنا سخت کٹھن ہوتا وہ وہیں سے پیاسی واپس پلٹ جاتیں اگر جو شہرین کی خوشی اور جوش بھری آواز نہ سنتیں۔

"واؤ...... واٹ آ گریٹ آئیڈیا۔" اس کی آواز کچھ ایسا انوکھا جوش دبا ہوا تھا کہ وہ وہیں رک کر سننے پر مجبور ہوگئیں۔

"پہلے تم آ کر اسے دیکھ تو لو ایسا نہ ہو کہ تمہیں پسند ہی نہ آئے...... ویسے ایسا ہوگا نہیں کیونکہ کم بخت ہے بہت خوب صورت۔" نورالزماں بیگم نے قریب رکھی کرسی کو تھاما۔ جانے کیوں انہیں یہ ذکر کوئی خاص اشارہ دے رہا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے تم پاکستان آنے کی پلاننگ کرو' ایسا نہ ہو کہ بڑی بی اس کا کہیں اور رشتہ طے کردیں اور اچھی خاصی گولڈن آپرچیونٹی ہاتھ سے نکل جائے۔" نورالزماں بیگم کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوگئی۔ ان کے نتھنے پھولنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ بات صدف کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"ہاں ہاں...... اب تو صرف دو دکانیں رہ گئیں' بیٹا تیرے لیے بہت ہیں۔ تجھے تو کوئی کھوکھے والا اپنی بیٹی نہ دے......" وہ اب شوخی سے دوسری طرف موجود شخص کو چھیڑ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔

نورالزماں بیگم پر یہ خاموش لمحے قیامت کا شور مچاتے ہوئے گزرے۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اندر جا کر اس قابل نفرین عورت کی شکل پر تھوک دیں۔ منہ نوچ لیں' جس نے ان کی پاک باز بیٹی پر گندی نظر رکھی تھی۔ صرف چند ٹکوں کے عوض۔ ان کی سانس پھولنے لگی۔

"اب صرف یہی ایک آخری راستہ بچا ہے شیری...... آئی ایم ڈیم سیریس...... فوافٹ پاکستان آنے کی کرو' یہ نہ ہو کہ بڑھیا اس چلتی پھرتی نوٹوں کی دکان کو کسی اور کے ساتھ چلتا کرے اور ہم دونوں منہ دیکھتے رہ جائیں۔" شہرین کی آواز غیر متوقع طور پر ہلکی ہوگئی تھی۔ یقیناً وہ اپنا کام اور بات مکمل کرچکی تھی اور اب باہر کی طرف آرہی تھی۔

نورالزماں بیگم ہوش میں آئیں۔ گو کہ اس وقت سارے گھر میں بے حد ہلکی روشنی تھی' جس میں کسی شخص کا نظروں میں آنا اتنا ممکن نہ تھا پھر بھی انہوں نے اپنے اتھل پتھل ہوتے تنفس اور سینے میں اچانک اٹھنے والے درد کو نظر انداز کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ کمرے میں

آ کر وہ مسلسل شہرین کی باتوں کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کی عورت ہے اور وقت آنے پر کیا کچھ کرنے والی ہے اس لیے وہ صدف کی طرف سے فکر مند ہوئیں اور اسی دوران ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ پیاس کی شدت کے ساتھ دل کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔

''ماما...... آپ کی ٹیبلیٹ تکیے کے نیچے ہے۔ رات میں اگر ذرا سی بھی بے چینی ہو تو نکال کر زبان کے نیچے رکھ لیجیے گا۔'' ان کی عزیز از جان بیٹی کی ملائم آواز سماعت گونجی اور ہر ہر مسام سے پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔

''اف...... گولی...... بیڈ کے اوپر...... اور وہ نیچے قالین پر......'' اس مشکل گھڑی میں یہ ذرا سی اونچائی کا فاصلہ ساتویں آسمان کے برابر لگ رہا تھا۔

''یااللہ...... یااللہ...... مدد کر...... مدد کر میری......

صرف ذرا سی اونچائی ہی تو تھی...... فقط ذرا سی......'' اور وہ کسی کے کردار سے' کسی کے ذہن کی پستی کو بے نقاب کرنے کے لیے اس بلندی کو ماپ نا سکیں۔

انہوں نے اونچا ہو کر تکیہ سرکایا...... سامنے ہی گولیوں کا پتا رکھا تھا' جس میں ان کی زندگی بند تھی بس ایک گولی زبان کے نیچے بس چند لمحے اور...... اور پھر...... ان کا کانپتا ہاتھ آگے بڑھا لیکن ٹیبلیٹ تک نہ پہنچ سکا...... پیغام اجل پر لبیک کہنے کا حکم آن پہنچا تھا۔

آخری ہچکی اور...... مہلت تمام شد۔

***

''تین دن ہو گئے ہیں آج...... باجی نے ایک لقمہ منہ میں نہیں رکھا۔'' اس نے ہاتھ میں تھامے سپارے پر سے نظریں ہٹا کر خلا میں گاڑ دیں۔

''تین دن...... اتنی جلدی۔'' خود سے سوال کرتے ہوئے وہ رو دی۔

نورالزماں بیگم کے جانے کا جتنا صدمہ اسے ہوا تھا' اتنا کسی اور کو ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ شاید دنیا میں وہ واحد بچی تھی جو ان سے اس درجہ محبت کرتی تھی کہنے کو تو اشعر بھی ان ہی کی اولاد تھا لیکن اس کے دل میں ماں کے لیے وہ بھرپور محبت کب کی دم توڑ چکی تھی' جو شہرین سے ملنے سے پہلے اس کے دل پر قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ اب وہاں شہرین کا راج تھا اور شاید یہاں بھی۔ ایک گہری سانس تھرتھراتی ہوئے اس کے وجود سے نکلی اور وہ سر جھکا کر سسکنے لگی۔ نزدیک بیٹھی شمیمہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور جلدی سے نزدیک ہوئیں۔

''بس کرو دو بیٹی اب...... کب تک یوں بھوکی پیاسی رہ کر آپا کا غم مناتی رہو گی...... جانے والوں کو تو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے' ان کے پیچھے رہ جانے والے زندگی سے ناتا توڑ نہیں لیا کرتے۔ میری بچی بس کرو۔'' انہوں نے شفقت اور محبت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ قریب کھڑی کسلٹی کھانے کی ٹرے لیے بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

صدف کا دکھ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا اور کیسے آتا محبت کرنے والی ہستی جو چلی گئی تھیں۔ صرف پیدا نہیں کیا تھا پالا تو تھا اور پیدا کرنے والے سے پالنے والا زیادہ افضل ہوتا ہے پھر وہ کیوں نہ غم مناتی۔ ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا تھا۔ نورالزماں بیگم اسے بن کہے سب پورا کر دیا کرتی تھی۔ اس کے برعکس شہرین تھی جو مطمئن تھی، اس راہ کا کانٹا نکل گیا تھا اور اب اس کو اس کے مقصد سے کوئی نہیں روک سکتا تھا، اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

***

کمرے میں داخل ہوتے ہی جس پہلی چیز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی وہ ایک نازک و نفیس بیش قیمت انگوٹھی تھی۔ باریک سے چھلے میں رکھا ہوا جگمگاتا ہیرا اس قدر نمایاں اور خوب صورت تھا کہ پہلی نظر کے بعد ہی اس کا دل اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کو مچل گیا۔ صاف ستھری ڈریسنگ پر وہ انگوٹھی محض یونہی پڑی ہوئی تھی مگر پھر بھی پوری شان سے جگمگا رہی تھی۔ جس دم وہ کمرے میں داخل ہوئی تو الجھن کا شکار تھی لیکن اب اس کی ساری جھجک اس انگوٹھی کی جگمگاہٹ اور خوب صورتی نے نکال دی تھی۔ اب

اس کے لبوں پر صرف ایک استعجاب آمیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اسی ہیرے سے مشابہہ جگمگاہٹ۔

وہ جس قدر آہستگی سے اندر داخل ہوئی تھی اسی آہستگی سے اس نے نزدیک جا کر اس انگوٹھی کو اٹھایا' انگلی میں ڈال کر ہاتھ نچا کر دیکھا' ایک دو پوز دیئے' آئینے میں خود سے خود ہی کے لیے داد سمیٹی اور پھر اسی آہستگی سے انگوٹھی اتار کر رکھنے کے بجائے بالکل قریب سے دیکھنے لگی۔ وہ اس قدر مگن تھی کہ پشت پر کسی ذی نفس کی موجودگی کو محسوس تک نہ کرپائی۔

''اچھی رنگ ہے ناں......؟'' آواز اتنی اچانک تھی کہ وہ باقاعدہ اچھل ہی پڑی اور انگوٹھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دبیز قالین پر جا گری۔ اس نے تھوک نگل کر پلٹ کر دیکھا اس کی پشت پر شہرین کھڑی تھی۔ سینے پر ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

''چچ...... چچ اتنی نازک اور خوب صورت چیزوں کے ساتھ اتنی لاپروائی......'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں بولتی ہوئی نزدیک آئی اور انگوٹھی اٹھا کر اسے جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''تمہیں تو قیمتی چیزیں سنبھال کر رکھنا بھی نہیں آتیں شاید'' اس نے ایک نظر اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا' مگر انداز ابھی بھی دوستانہ ہی تھا۔

''نن...... نہیں...... نہیں بھابی...... میں تو بس دیکھ رہی تھی۔'' وہ ہکلائی۔

''میں بھی دیکھ ہی رہی تھی تمہیں کتنی پسند آرہی تھی ناں یہ؟'' اس نے پھر معصوم و نوعمر چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''لو...... تم رکھ لو۔'' اس کے سر پر بم پھٹا اور وہ ڈر گئی۔

''جی......! میں......؟'' اس کی آنکھیں ممکنہ حد تک پھیل گئی تھیں۔

''ہاں بھئی تم...... کیوں تمہیں یقین نہیں آرہا کہ یہ میں تمہیں دے رہی ہوں...... اوہ ہو رکھ بھی لو بھئی بلکہ پہن ہی لو......'' اس نے زبردستی اس کے دائیں ہاتھ کو تھام کر اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

وہ اب کھلے منہ اور کھلی آنکھوں سے کسی خواب کی مانند اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ جسے اس بیش قیمت انگوٹھی نے سجا دیا تھا۔

''تم کسی کام سے آئی تھیں یہاں؟'' شہرین اس سے زیادہ یہ منظر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

''اوہ ہاں۔'' اس نے ایک ادا سے کہا۔

''میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ چائے پئیں گی...... میں سب کے لیے بنانے جارہی تھی۔'' اس کا لب و لہجہ خود بخود کھل اٹھا تھا۔

''نو تھینکس......'' شہرین کا انداز بدل چکا تھا' وہ اب سنجیدہ تھی۔

''جی ٹھیک ہے۔'' تابعداری سے سر ہلا کر باہر نکلتی ثانیہ کا دل اس وقت بلیوں اچھل رہا تھا۔

''پوچھ سکتی ہوں کہ مزید کتنے دن قیام کا ارادہ ہے آپ کا؟'' ابھی اس نے لاؤنج میں آکر شمیمہ کو انگوٹھی کے بارے میں بتایا بھی نہیں تھا کہ شہرین چلی آئی۔

اس کی آمد اس قدر اچانک اور بات اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھی کہ شمیمہ ہکا بکا سی ہوکر اسے دیکھنے لگیں۔

''کیوں بھئی...... تمہیں کیا تکلیف ہے ہمارے یہاں رہنے سے...... ہیں؟'' کافی دیر بعد وہ جواب دینے کے قابل ہوئیں۔

''آپ کو نہیں پتا' کسی کے گھر مہمان زیادہ دن ٹھہر جائے تو میزبان کو کیا کیا تکلیفیں ہوتی ہیں۔'' اس نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں بہت گرم چوٹ ماری تھی۔ شمیمہ نے منہ کھولا لیکن شہرین نے موقع نہیں دیا۔

''سلمٰی......'' اس نے اتنی بلند آواز میں سلمٰی کو پکارا کہ اپنے کمرے میں بیٹھی صدف اور ثانیہ سمیت چونک گئیں اور شمیمہ کے برابر میں بیٹھی ثانیہ اٹھ کر اس کے نزدیک آگئی۔ سلمٰی بوتل کے جن کی مانند حاضر ہوئی تھی۔

''جی باجی...... کیا ہوا خیریت؟'' شہرین نے اپنے ناخن بے نیازی سے دیکھتے ہوئے حکم صادر کیا۔

"تمام کمروں کی ٹھیک طرح سے صفائی کرو کونا کونا جھاڑو اور جس قدر ہو سکے فرنیچر بھی یہاں وہاں ہٹا کر......"
تانیہ نے یک دم بے حد ہمدردی اور محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"کیا بات ہے بھابی کیا ہو گیا...... سب خیریت تو ہے ناں؟" شہرین نے بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پھر دوبارہ اپنے ناخنوں کو۔
"دراصل...... میری کچھ جیولری نہیں مل رہی...... ذرا دھیان سے......" سلمٰی سر ہلا کر پلٹنے لگی۔
"کون سی جیولری بھابی مجھے بتائیں...... میں......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔
شہرین نے اچانک اسے دیکھا پھر اپنے شانے پر دھرے اس کے ہاتھ کو اور بری طرح چونکنے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے ایک بار پھر سلمٰی کو پکارا۔
"ارے سلمٰی رکو...... اب صفائی کی ضرورت نہیں رہی......" اس نے تانیہ کا ہاتھ تھاما۔
"کیونکہ میری گم ہوئی انگوٹھی مس تانیہ کے ہاتھ میں ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے تانیہ کے ہاتھ سے انگوٹھی کھینچی، سلمٰی اور شمیمہ تو ہونق ہوئیں، تانیہ کا تو منہ ہی سفید پڑ گیا۔
"یہ......! یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابی آپ......؟"
"کیوں یہ انگوٹھی میری نہیں یا تمہارے ہاتھ سے نہیں اتاری۔" تانیہ جواب دینے کے قابل نہیں رہی تھی...... وہ سمجھ گئی تھی کہ شہرین نے اس کے ساتھ کیا گیم کھیلا ہے لیکن اسے سمجھنے میں دیر ہو گئی تھی۔
قصور اس کا بھی نہیں تھا اس کے پاس اتنا دماغ نہیں تھا کہ شہرین جیسی عورت کو سمجھ سکتی اب تک تو وہ صرف خود اور اپنی ماں کو اور صدف کو ہی سمجھتی تھی اور سمجھاتی آئی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ اس دنیا میں شہرین جیسے انسان بھی ہیں۔ جنہیں انسان کم اور شکاری جانور کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا جو باقاعدہ دانہ ڈالتے، جال بچھاتے اور پھر اپنے شکار کو پھانس لیتے ہیں۔ تانیہ وہ معصوم چڑیا تھی جس نے گھر کے والانوں میں اڑنا اور روشن دانوں میں گھونسلا بنانا سیکھا تھا جنگل اور جنگل کے قانون کی بھلا اسے کیا خبر وہ تو بس منہ کھولے آنکھوں میں آنسو لیے شہرین کو پھنکارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ شمیمہ تیں تیں کرتی رہ گئیں اور اوپر نیچے کمرے کے دروازے سے جھکی صنیف کو جب صورت حال کا علم ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔
"کل...... لیکن بھابی...... یہ تو آپ نے خود ہی......" وہ بوکھلائی۔
"کیا آپ نے خود ہی...... ہاں میں نے خود ہی لاپروائی سے ڈریسنگ پر چھوڑ دی تھی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میرے ہی گھر میں میری چیزیں محفوظ نہیں۔"
"نہیں...... نہیں بھابی ایسا مت کہیں، میں تو زیور چرانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اب وہ اپنی صفائی میں ایسے الفاظ منہ سے نکال رہی تھی جو اسے بری الذمہ کرنے کے بجائے ملزم سے مجرم ٹھہرا رہے تھے۔
"سوچ نہیں سکتی تھیں اگر یہ انگوٹھی میرے بجائے صدف کی ہوتی تب...... کیونکہ اس سے تو تم مانگ کر بھی لے سکتی تھیں ناں لیکن تم نے سوچا کہ میں تو اتنی آسانی سے تمہارے حوالے کروں گی نہیں اس لیے تم نے سیدھے سیدھے میرے ہی کمرے سے اڑا لی...... یہی سوچا ہوگا ناں کہ اتنے لوگ کل پرسوں میں آئے گئے مجھے کیا پتا چلے گا کہ چیز گئی کہاں؟" شہرین کی زبان کے خندق اللہ کی پناہ۔
تانیہ کا چہرہ اس بے عزتی پر لال بھبھوکا ہو گیا تھا وہ تڑپ کر بے اختیار اماں کی طرف آئی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
"اماں...... اماں قسم لے لیں...... میں نے نہیں اٹھائی وہاں سے...... بھابی نے خود دی تھی۔"
"ارے واہ...... میں کیا پاگل ہوں جو اتنی قیمتی چیز تمہیں دوں گی وہ بھی مفت میں۔" شہرین کسی کو کچھ بھی بولنے کا موقع دیے بغیر چیخ رہی تھی۔
"واہ بھئی واہ...... یقین دلانے بھی کس کو چلی ہیں اپنی

ہی اماں کو...... بند کرو یہ ڈرامے میرے سامنے اور ان سے کیا کہہ رہی ہو کیا پتا انہوں نے ہی بھیجا ہو تمہیں۔"

"اب تو میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتی...... بدتمیز عورت الزام لگاتی ہے ہم پر اور میری بیٹی اتنی معصوم...... ارے ہم کوئی ایرے غیرے ہیں برسوں کا آنا جانا ہے ہمارا۔" شمیمہ طیش میں آ کر بولیں۔

"یہی تو......" شہرین نے سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں برسوں کے آنے جانے میں انسان دوسرے کے گھر کے کونے کونے چپے چپے سے واقف ہو جاتا ہے بالکل اپنے گھر کی طرح...... جب ہی تو شاید آپ کی بیٹی بھی اس گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی اور یہاں کی چیزوں کو اپنی چیزیں...... کیوں ثانیہ؟" اس نے بے حد پیار بھرے انداز میں ثانیہ کو مخاطب کیا تھا اپنی آنکھیں صاف کرتی اس وقت کو کوس رہی تھی جب وہ شہرین کی باتوں میں آ گئی تھی۔

"ارے بکواس بند کر...... صدف...... صدف......" شمیمہ کی آواز گھر میں نقارے کی طرح گونجی صدف تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

"ادھر آ...... ادھر آ دیکھ ذرا یہ تیری بھابی کیا الزام لگا رہی ہے ثانیہ پر...... بتا ذرا اس کو ہم کوئی چور اچکے ہیں جو یہ کل کی لڑکی بکواس کیے جا رہی ہے میں کہتی ہوں منہ بند کر کے اس کا ورنہ میں سارے لحاظ بھول کر اس کا حشر بگاڑ دوں گی۔" صدف ان کی زبان کی ہی تیزی سے اترتی نیچے آئی اس کے پیچھے پیچھے ثانیہ بھی تھی۔

"منہ اور بکواس آپ بند کریں اور چلتی پھرتی نظر آئیں یہاں سے...... ایسا نہ ہو مجھے پولیس بلوانی پڑے اور آپ کا حشر بگڑ جائے۔ یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں بہت بڑی بات ہے جسے میں عزت سے دبا رہی ہوں چوری ہوئی ہے میرے زیور کی......" شہرین اب کی بار پوری طرح اپنے خول سے باہر نکل کر پھنکاری اور اس کی پھنکار کی گرمی سے سب لوگ جیسے جھلس سے گئے تھے۔ چند لمحے یونہی منجمد رہنے کے بعد صدف آگے بڑھنے لگی تھی کہ ثانیہ نے بروقت اس کا ہاتھ دبایا۔

"شہرین بھابی آپ اس وقت غصے میں ہیں آنٹی فی الحال آپ گھر چلی جائیں اگر شہرین بھابی کو کوئی غلط فہمی ہوئی بھی ہے تو غصہ اترنے کے بعد خود ہی دور ہو جائے گی۔" اس پورے منظر نامے میں اگر کوئی صحیح معنوں میں اپنے حواسوں میں تھا تو وہ ثانیہ ہی تھی۔ صدف نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں صدف۔" اس نے صدف سے کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کا دباؤ اس کے شانوں پر ڈال کر کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"جاؤ...... اوپر اپنے کمرے میں...... تم آرام کرو...... آنٹی اور میں اپنے گھر جاتے ہیں آنٹی پلیز۔" اس نے بے حد نرمی سے کہہ کر معاملہ نمٹایا۔

شمیمہ بڑبڑاتی اپنی چادر اٹھا کر اوڑھنے لگیں ثانیہ سسکیاں بھرتے ہوئے لاؤنج کے ایک کونے سے اپنا بیگ اٹھانے لگی۔ شہرین اس وقت تک وہیں کھڑی ان ماں بیٹی کو گھورتی رہی جب تک کہ وہ دونوں لاؤنج سے باہر نہیں نکل گئیں۔ صدف اس منظر کی تاب نہیں لا سکی تھی اس لیے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ ثانیہ اپنا بیگ لے کر واپس آئی تو شمیمہ اور ثانیہ لاؤنج سے باہر نکل رہی تھیں۔ شہرین نے ان کے جانے کے بعد ثانیہ کو دیکھا۔

"ہونہہ......" اور اسی کروفر سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

❁......✿......✿......❁

کچی پکی نیند میں مدغم شمیمہ نے کروٹ بدلی اور وہ جیسے اسی موقع کے انتظار میں تھی۔

"اماں...... اماں قسم لے لو جو میں نے چوری کی ہو۔" اس نے جلدی سے ماں کے پیر پکڑے۔ شمیمہ کی آدھی ادھوری نیند اڑن چھو ہو گئی تھی۔

"اری چل...... پرے مر...... مردود کمینی بے غیرت...... چرائی نہیں تو کیا ہوا مانگ تو لی......"

''مانگی بھی نہیں تھی میں نے اماں۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی اور بھاری تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے رو رہی ہے۔

''بکواس بند کر...... تیری کسی بھی بات کا یقین نہیں کروں گی میں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور انگلی اٹھا کر دبے دبے لہجے میں اس کو جتا کر بولی۔

''اگر تو اتنی ہی معصوم ہوتی ناں تو اس ڈائن کو موقع نہ ملتا یوں ہمیں بے عزت کرنے کا۔'' شمیمہ کی بات پر تانیہ اور رو دی۔

دوپٹا سرہانے پڑا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ بات اس کے لیے بھی معمولی نہیں تھی اور اگر واپسی کا پورا راستہ وہ خاموش رہی تھی اور گھر آ کر بھی کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کا ذہن بھی خاموش تھا۔ اس کی سوچیں بھی اس کی ظاہری حالت کی طرح پُرسکون تھیں۔

''بڑی تیز طرار نکلی نور آپا کی بہو...... میرے اندازوں سے بھی زیادہ۔'' اس کا انداز گہری سوچ کا عکاس تھا۔

''کوئی کسی کو اپنے گھر سے جانے کے لیے کہے بڑی بداخلاقی کی بات ہے مگر ممکن تو ہے...... پر اس نے سیدھے سیدھے نہیں بولا' الزام لگایا اور پھر گھر سے نکال دیا۔'' وہ اب جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی...... سسکیاں بھرتی تانیہ منہ اٹھائے ہلکی روشنی میں اس کی باتوں کا مفہوم جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے' اس نے ہم پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ اب کیا جواز رہ گیا وہاں جانے اور ان سے ملنے کا؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''تو کیا اب ہم کبھی اس گھر میں نہیں جائیں گے؟'' تانیہ کے لیے یہ صدمہ بھی کم نہیں تھا۔ شمیمہ نے جواب نہیں دیا۔

''یوں بیٹھے بٹھائے تو رشتہ نہیں توڑا جا سکتا...... میری اپنی بیٹی اس گھر میں ہے' اگر میں آج کہہ دوں تو......''

''نہیں...... نہیں اماں......'' تانیہ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

''ایسی غلطی مت کرنا کبھی...... ورنہ وہ صدف آپی کو بھی ادھر ہمارے گھر بھیج دے گی۔'' شمیمہ نے چونک کر تانیہ کی شکل دیکھی' اس کی بات میں وزن تھا۔

''اور اگر صدف نے خود سے بول دیا تو......؟'' ایک ماں کے دل میں اولاد کے حوالے سے خدشات تھے اور فکرمند بھی۔

''ادنہہ...... وہ اتنی پاگل نہیں' اگر کہنا ہوتا تو اسی وقت نہ کہہ دیتیں جب وہ کمینی ہمیں گھر سے نکال رہی تھی۔'' تانیہ کے لب و لہجے میں اپنی ماں جائی کے لیے ناگواری سمٹ آئی۔

شمیمہ نے سر ہلایا جیسے سب سمجھ گئی ہو پھر اچانک خیال آنے پر اس نے تانیہ کو دیکھا' اسے نئے سرے سے جلال چڑھا...... اس نے زمین پر بیٹھی تانیہ کی کمر پر زوردار سا دو ہتڑ لگایا۔

''یہ سب مصیبت تیری لائی ہوئی ہے منحوس' نہ تو اتنی لالچ دکھاتی' نہ اسے موقع ملتا بے غیرت...... مر اب...... بیٹھی رہ ٹکے ٹکے کے لیے۔'' نورالزماں بیگم اور صدف سے ان کا تعلق کسی بینک اکاؤنٹ چیک بک کی طرح تھا' وہ ہر بار چیک میں اپنی مرضی کی رقم تحریر کرتیں مجبوری اور قسمت و حالات کے دستخط ہوتے اور نورالزماں بیگم وہ رقم کیش کرا دیتیں۔

جس صورت حال میں نورالزماں بیگم کے انتقال کے بعد اس گھر سے انہیں نکال کر آئندہ کے لیے دروازے یقینی طور پر بند کیے گئے تھے' اس میں ان کا واحد آخری سہارا صدف ہی تھی۔ عین ممکن تھا صدف سے خون کا رشتہ ظاہر کرنا ان کا جرم بن جاتا اور اس کی پاداش میں انہیں نہ صرف صدف کو وہاں سے واپس لانا پڑتا بلکہ گھر میں ایک اضافی فرد کا خرچا اور برداشت کرنا پڑتا' شمیمہ میں اتنی برداشت نہیں تھی۔ اتنا رسکی داؤ شمیمہ کبھی نہیں کھیل سکتی تھی۔ جبکہ اس کا سب سے اہم مہرہ پٹ چکا تھا اب تو صرف ایک پیادہ باقی تھا۔ وہ اس کے سہارے کتنا اور کب تک آگے

جاسکتی تھیں اس کا انحصار ان کی حکمت عملی پر تھا فی الحال اسی حکمت عملی کا تقاضا تھا کہ خاموش رہ کر وقت کی کروٹ کا انتظار کیا جائے۔

ان کے اکلوتے بیٹے کو نہ صدف کی اہمیت کا پتا تھا نہ خود اپنے رشتے کا' وہ نورالزماں بیگم اور شمیمہ کے رشتے کو صرف اور صرف انسانیت اور خدا ترسی کے آئینے میں منعکس کرتا تھا' اسی لیے مطمئن تھا لیکن شمیمہ کا چین و قرار لٹ گیا تھا۔

"پاگل ہوگئی ہو؟ سوچنا بھی مت...... ابھی تو بالکل بھی نہیں۔" ثانیہ نے اس کی بات کو رد کردیا' وہ ہکا بکا ہی رہ گئی۔

"لیکن کیوں؟" گہری رات کی خاموشی میں اس کے کمرے میں' اس کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

یہ احساس اور بھی زیادہ اسے دکھی کررہا تھا کہ دیواروں کے کان والی بات اس کے اپنے گھر میں جنم لینے والی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جس میں اس نے اب تک ہر طرح کی آزادی دیکھی تھی اور اب اس طرح اپنی بچپن کی سہیلی سے بات کرنے کے لیے اسے بطور خاص رات گہری ہونے کا نہ صرف انتظار کرنا پڑا تھا بلکہ بستر میں دبک کر بھی وہ ایسے چوکنی تھی جیسے شہرین اپنے کمرے کے بجائے اس کے برابر میں محو خواب ہو۔

"حیرت ہورہی ہے مجھے تمہارے خیال اور اس سوال پر...... خود سوچو' جس عورت نے تمہارے گھر والوں کو تین دن برداشت نہیں کیا اپنا منہ لے کر انہیں اس طرح چلتا کیا کہ وہ بے چارے دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے' وہ تمہارا ان سے تعلق جان لینے کے بعد کیا تمہیں اس گھر میں رہنے دے گی۔"

"کیا مطلب...... کیا وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گی؟" صدف کی آواز میں خوف جاگ اٹھا۔

"تمہیں لگتا ہے وہ ایسا نہیں کریں گی؟ اب بھی...... اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لینے کے بعد بھی۔" ثانیہ کو اپنے طنزیہ لب و لہجے کا خود بھی افسوس تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔

"تو پھر میں کیا کروں ثانی...... کیا ہمیشہ کے لیے تم سے اور ان لوگوں سے ملنا چھوڑ دوں...... میری زندگی تو پھر ختم ہی ہوگئی ناں۔" اس کی آواز بھرا گئی' ثانیہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"تم رو مت پلیز اور ہمت کیوں ہار رہی ہو اب ایسی بھی جلاد نہیں ہیں وہ' نہ تم اتنی بے بس ہو۔" اس نے اسے تسلی دی۔

"میرا خیال ہے مجھے اشعر بھائی سے بات کرکے انہیں سب صاف صاف بتا دینا چاہیے۔" ایک تقویت دیتے خیال نے اسے راہ بھائی۔ ثانیہ چند لمحے خاموش رہی۔

"دیکھو اس میں برائی کوئی نہیں لیکن میرا خیال ہے فائدہ بھی کوئی نہیں۔"

"کیوں...... وہ میرے بھائی ہیں' کیا میری بات نہیں سنیں گے؟"

"سنیں گے ضرور سنیں گے لیکن ضروری نہیں کہ سمجھیں اور توجہ بھی دیں۔ تم نے ابھی بھائی کا پُراعتماد انداز نہیں دیکھا' ان کا انداز چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ تمہارے بھائی مرضی اور پسند نہ پسند سراسر ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ ان عورتوں میں سے ہیں جو شادی کے بعد شوہر کو اپنا دیوانہ بنا کر ان پر قبضہ کرلیتی ہیں' اسی وجہ سے ان کی شخصیت اور باتوں سے اتنا کانفیڈنس جھلکتا ہے۔" ثانیہ کے طویل تبصرے میں ایک شادی شدہ عورت کا تجربہ بول رہا تھا۔

"لیکن میں ایک بار ان سے بات ضرور کروں گی۔"

"میں تمہیں منع نہیں کروں گی اب سو جاؤ رات بہت ہوگئی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔" اس کے فکرمند لہجے پر صدف اداسی سے مسکرائی۔

"یہ بات تو مجھے تم سے کہنی چاہیے کہ اپنا خیال رکھنا اور وقت دیکھو کیسا بدلا کہ الٹا تم مجھے کہہ رہی ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کس سے کہے' ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں اور کتنی فکر کرتے ہیں۔" اس کا انداز بہنوں کی سی محبت سے بھرپور تھا۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا اور کھانا' دوائیں اور آرام وقت پر کرنا۔" صدف نے ثانیہ سے کہا۔

فون بند کرتے وقت وہ اسے تاکید کرنا نہیں بھولی......

جانتی تھی ثانیہ ان دنوں ماں بننے کے عمل سے گزر رہی ہے' وہ بھی سالوں انتظار کرنے کے بعد' اس لحاظ سے اسے جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ذہنی آرام کی بھی اشد ضرورت تھی۔ وہ دل سے ثانیہ کی ساس اور اس کے شوہر عارض کی مشکور تھی جنہوں نے ثانیہ کی حالت جانتے ہوئے بھی اسے صدف کی طرف آنے اور اس کی خبر گیری کرنے سے روکا نہیں تھا۔ ثانیہ پچھلے دنوں خود بھی اس کی وجہ سے ذہنی اذیت سے گزرتی رہی تھی۔ اگر نورالزماں بیگم اچانک دنیا سے نہ چلی جاتیں تو یقیناً یہ دن ان دونوں سہیلیوں کے لیے یادگار ہو جانے تھے۔

کبھی کبھی خوش خبریاں تو اپنی جگہ موجود رہتی ہیں لیکن وقت کی قلابازی انسان سے خوش رہنے کا جذبہ چھین لیتی ہیں پھر وہی خوشیاں اور خواہشیں جن کا شدت سے انتظار ہوتا ہے بے معنی ہو جاتی ہیں۔

"ماما......" اس نے بے آواز سرگوشی کی اور پلکیں نم ہو کر جڑ گئی تھیں۔

❁......❁......❁

"کیا سوچا پھر تم نے؟" رات سونے سے پہلے اس نے لیپ ٹاپ میں گم اپنے شوہر کو دیکھا۔

"کس بارے میں؟" سوال بالکل اس کی عدم توجہ کے عین مطابق تھا۔

"کم آن اشعر بند کرو اسے۔" اس نے اپنی بات کہہ کر چند لمحے انتظار کیا پھر اٹھ کر لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کر دی۔

"کیا بات ہے؟" اشعر نے گہری سانس لے کر فوراً ہی ہتھیار ڈال دیئے' جانتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ڈسکس کرنا چاہتی ہے جب تک ڈسکس نہیں کر لے گی اس کی جان نہیں چھوڑے گی۔

"میں نے پوچھا ہے کہ تم نے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں؟"

"جاب کے بارے میں اور کس بارے میں۔" وہ الجھ کر بولی۔ "اور پلیز یہ مت کہنا کہ دکانوں کا کرایہ آ تو رہا ہے۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے اس کی نقل اتاری۔

"تو پھر......اور کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں کرو...... جاب کرو...... کمائی کا کوئی ذریعہ پیدا کرو زندگی گزارنی ہے ڈھنگ سے کہ نہیں۔" وہ بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہا۔

"تم جانتی ہو پاکستان میں اچھی جاب ملنا کتنا مشکل ہے۔"

"یہی تو......" اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ جب یہاں جاب ملنا اتنا مشکل ہے اور ہمیں جاب کی اتنی اشد ضرورت ہے تو تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے اشعر۔" اشعر اس کی تجویز پر بدکا۔

"کیا مطلب...... کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں اور صدف کو اکیلا چھوڑ کر اتنی دور چلا جاؤں؟"

"اوہ مسٹر یہ اکیسویں صدی ہے' عورتیں اکیلی رہتی بھی ہیں اور سروائیو بھی کرتی ہیں اس میں انوکھی بات کیا ہے۔" اشعر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کے نزدیک ہوئی۔

"چند دن...... فقط چند دنوں کی بات ہے پھر صدف کی شادی ہو جائے گی اس کے بعد ہم خالی رہ جائیں گے۔ تب ہم کیا کریں گے کبھی سوچا ہے؟" اس کی آواز بے حد مدہم تھی وہ بہت نرمی اور محبت سے اسے سمجھا رہی تھی۔

"کچھ نہ کچھ تو تمہیں ہر حال میں کرنا پڑے گا ناں تب بھی تو کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ابھی واپس اپنی اسی جاب پر چلے جاؤ جس کو چھوڑ کر آئے ہو اور داد تو تم دو گے نہیں ورنہ میری

دور اندیشی کو مان جاتے کہ میں نے تمہیں ریزائن نہیں کرنے دیا' واپس جاکر تمہیں دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔"

"کہہ تو ٹھیک رہی ہو تم۔" اشعر پُرسوچ انداز میں بولا۔ شہرین ایک ادا سے مسکرائی اور اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

"میں کبھی غلط بات کرتی ہوں کیا؟ دیکھو ناں ہم کوئی ہمیشہ یہاں تھوڑی رہیں گے' صدف کی شادی کرکے واپس چلے جائیں گے۔ اپنی دنیا میں' جہاں سے نکل کر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا...... نہ وہاں جیسی فاسٹ لائف ہے...... نہ وہ رونقیں اور فریڈم۔" پتا نہیں اسے اور کون سی اور کس طرح کی آزادی چاہیے تھی۔ اس نے بڑے ناز سے منہ بسورا تھا۔

وہ ایک چالاک اور طرار عورت تھی۔ اسے معلوم تھا کہاں اسے پیار کی مار دینی ہے' کہاں ناراضی کی دھمکی سے کام چلانا ہے اور کہاں محض حکم دینا ہے۔

"لیکن میں سوچ رہا تھا یہ بہت جلدی نہیں ہوجائے گا' ابھی تو ماما کی ڈیتھ ہوئی ہے اور ابھی......"

"سوواٹ ڈارلنگ...... کیا یہاں لوگ کام نہیں کرتے' نوکریاں نہیں کرتے نیکسٹ ڈے سے ورکنگ پر جانے لگتے ہیں۔" اس کا انداز بے حد سرسری تھا۔

"تمہیں یہ انفارمیشن کہاں سے مل گئی۔" اشعر کا حیران ہونا بجا تھا۔

"ماما کے انتقال میں کچھ عورتیں آئی تھیں تو یہی باتیں کررہی تھیں اور پتا ہے کیا اندازہ لگایا میں نے ان کی باتوں سے۔"

"کیا......؟" اشعر اب اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھنسائے دھیرے دھیرے سہلا رہا تھا اور شہرین کو اندازہ تھا وہ خود بھی اس کی لچھے دار باتوں میں اسی طرح دھیرے دھیرے پھنس رہا ہے۔

"یہاں پر پرائیوٹ جابز والے محنت بہت کرتے ہیں پر ان کو سیلری اتنی نہیں ملتی' زیادہ تر لوگ ڈبل ڈیوٹی کرتے ہیں اور آدھی پے لیتے ہیں۔" اشعر نے سر ہلایا۔

"میں نے سوچا تھا پاکستان آکر عیش وآرام کی زندگی گزاریں گے۔ کوئی ٹینشن ہوگی نہ کوئی اور پریشانی...... بس گھر بیٹھے گزارہ ہوجائے گا لیکن......" اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے نورالزماں بیگم کی وصیت پر سخت اعتراض تھا۔

"اتنے تھوڑے پیسوں میں گزارہ کب ہوتا ہے' ڈارلنگ...... تب بھی تمہیں ہاتھ پیر تو مارنے ہی پڑتے...... ہم ہمیشہ صرف دو تو نہیں رہیں گے ناں' دو سے تین بھی تو ہوں گے کبھی۔" اشعر کو رضامندی کے دائرے میں جاتا دیکھ کر اس نے تابوت کی آخری کیل اس کی من پسند خواہش کی صورت میں ٹھونک دی۔

زندگی ابھی بھی اچھی تھی لیکن اتنی سیدھی اور بے فکری نہیں تھی' اسے کچھ منصوبے بنانے تھے اور ان پر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی عمل کروانا تھا' اگر اس نے جائیداد کی خاطر اشعر سے شادی کر ہی لی تھی' اس جیسی امریکہ کی فضاؤں میں مادر پدر آزاد معاشرے میں پلی بڑھی عورت نے ایک روایتی سوچ رکھنے والے پاکستانی مرد سے نکاح کرکے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال ہی لی تھیں تو پھر وہ اس جائیداد کا نصف تو کیا' ایک تہائی بھی کسی اور کو دینے والی نہیں تھی۔ چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

......

اس کا دل اشعر کے جانے کا سن کر بالکل ہی بجھ گیا تھا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ اشعر اسے اس طرح چھوڑ کر بھی جاسکتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ شہرین نہ صرف اسے پسند نہیں کرتی بلکہ وہ خود بھی شہرین کی موجودگی میں سکون محسوس نہیں کرتی۔ اشعر کی روانگی سے ایک دو دن قبل اس نے اشعر تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش بھی کی لیکن بے سود ہی رہی' اس کے ذہن میں شہرین کی حکمت عملی بھی اور منہ میں اس کی زبان۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ

آنے والے وقت میں وہ شہرین کے کانوں سے سننے اور اسی کی آنکھوں سے دیکھنے بھی لگے گا۔

ہمہ وقت گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے والی صدف جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ اب وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں محدود رہتی تھی...... لان میں اس کے اپنے ہاتھوں سے لگائے گئے پودے اس کی توجہ کو ترسنے لگے تھے۔ گھر کے در و دیوار سے جھلکتی نفاست اور صفائی جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ ملنے جلنے والوں میں ایک شمیمہ کی ذات تھی جس کا اسے پورے دل سے انتظار رہتا تھا اس لیے ان کا پتا بھی صاف ہو گیا تھا۔

پورے گھر پر شہرین کا راج تھا اس کی حکومت تھی یہ گھر اس کی راجدھانی بن گیا تھا اور وہ بغیر تاج کی ملکہ...... اسے خود بھی صدف کی پسپائی کا بخوبی علم ہو گیا تھا جب ہی اشعر کے جانے کے چند ہی روز بعد گھر میں ایک نیا دھماکہ ہوا جس نے صدف کے اعصاب کو بری طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

......✿......✿......

شہرین نے بالکل اچانک اپنے بھائی کو پاکستان بلا لیا تھا نہ صرف بلا لیا تھا بلکہ گھر پر ہی روک بھی لیا تھا۔ پہلے دن جب وہ لاؤنج میں اسے بے تکلفی سے براجمان دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی اور گھبراہٹ میں ڈھنگ سے پوچھ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ کون ہے اور اس طرح ان کے گھر میں کیا کر رہا ہے۔

''یہ میرا بھائی ہے' شیری...... اب یہیں رہے گا۔'' شہرین اپنے بھائی کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔ لاؤنج میں اس کی بھاری اور موٹی آواز اسے اپنے کانوں پر ہتھوڑے کی طرح محسوس ہوئی تھی۔

اس کے سارے سوال ختم ہو گئے اور جواب کی خواہش بھی دم توڑ گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر میں کھڑے کس قدر تمسخر آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ صدف زیادہ دیر وہاں رک نہیں پائی تھی۔ وہ تو اس گندے حلیے والے اس بڑھی ہوئی داڑھی' قلموں اور چھوٹی سی پونی ٹیل والے ہپی نما لڑکے کو دیکھ کر ہی اس قدر پریشان تھی کہ کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار بھی نہ کر پائی تھی۔

''کیا ہوا......؟ لگتا ہے میرا آنا اچھا نہیں لگا تمہاری سسٹر کو......'' اس لڑکے کی آواز بھی شہرین کی طرح بھاری تھی۔

''مسٹر ان لا ڈیئر......اور ڈونٹ وری......اب کسی کو اچھا لگے یا برا آفٹر آل یہ میرا گھر ہے' میرے ریلیٹو یہاں نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔'' اس نے جتا کر اپنا اور اس کا رشتہ یاد دلایا پھر اس سے بھی زیادہ باور کرانے والے لہجے میں کہا۔

صدف کی مٹھیاں بھنچ گئیں یقیناً ان سے کچھ بھی کہنا بیکار تھا بلکہ شاید اپنی شامت بلوانے کے مترادف بھی۔ وہ سرخ چہرے سمیت خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گئی لیکن ثانیہ کو فون کر کے بتانا ضروری سمجھا۔

''او مائی گاڈ......! یہ تو بالکل ٹھیک نہیں ہوا' تم کیسے رہو گی اکیلے گھر میں اجنبی لڑکے کی موجودگی میں؟'' ثانیہ بھی سن کر پریشان ہی ہو گئی۔

''میرا تو سوچ سوچ کر دم گھٹ رہا ہے ثانی' پلیز تم جاؤ ناں امی کے پاس ان کو بتاؤ' ان سے کہو مجھ سے ملنے آئیں یوں رشتہ توڑیں مت۔'' وہ اتنی روہانسی ہو رہی تھی کہ ثانیہ کو سب کچھ بھول کر اسے دلاسا دینا پڑا۔

''اچھا اب اتنا بھی مت گھبراؤ اور ڈر کر کمرے میں بند ہونے کی ضرورت نہیں' یہ گھر تمہارا ہے' کیا کر لے گا وہ...... کھا تھوڑا ہی جائے گا تمہیں۔'' اس نے تسلی دی لیکن خود فکر مند ہو گئی تھی ایک غیر مرد کا اس کے گھر آ کر رکنا نجانے اب کیا قیامت برپا کرنے والا تھا۔

......✿......✿......

زندگی بہت بے اعتبار چیز ہے۔ لمحوں میں آنکھیں پھیر لیتی ہے کہ انسان کو اس کے بدلتے تیوروں سے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل پاتا۔ گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھی۔ ثانیہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"پھنس گئی ہے بے چاری بری طرح' بھابی مطلبی اور خرانٹ ہے اور سگی ماں بہن کو ملنے کی اجازت نہیں۔"

"مگر انہیں ملنے کی اجازت نہیں تو وہ خود چلی جائے ان سے ملنے۔"

"ہاں میں بھی یہی کہتی ہوں مگر وہ پاگل اس معاملے میں بھی اپنی بھابی سے ڈرتی ہے۔"

"اس صدی میں بھی اتنی ڈرپوک لڑکیاں پائی جاتی ہیں؟"

"ارے تمہیں کیا پتا دنیا میں کیسی کیسی اور کس کس طرح کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔"

"مجھے دنیا کی لڑکیوں سے نہیں صرف ایک لڑکی سے مطلب ہے۔" شمیمہ بیگم کے گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے اس نے کہا تو ثانیہ اترتے اترتے رک گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے بغور اسے دیکھا تو وہ مسکرادیا۔

"میرا مطلب وہی ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"جی نہیں میں کچھ نہیں سمجھ رہی اور اب یہ سب تم مجھے سمجھاؤ گے اور وہ بھی پوری تفصیل سے آئی سمجھ۔"

"اوکے......اب جائیں بھی دیر ہورہی ہے۔" وہ اور زیادہ کھل کر مسکرایا۔

ثانیہ کا دل اب شمیمہ کے گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد شہروز کے دل کا بھید جاننا چاہتی تھی اگر وہ واقعی صحیح سمجھ رہی تھی کہ شہروز صدف میں دلچسپی رکھتا ہے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی لیکن جانا ضروری تھا' وہ صدف سے وعدہ کرکے آئی تھی کہ شمیمہ سے بات کرکے انہیں گھر جانے کے لیے کہے گی یا کم از کم اتنا ہی کہ فون پر اس کی خبر گیری ہی کرلیں۔ شمیمہ بیگم ثانیہ کو دیکھ کر پہلے تو خوش ہوئیں پھر کچھ یاد آنے پر ان کا رویہ دکھا سا ہوگیا۔

"آنٹی پلیز' میں جانتی ہوں اس دن گھر میں جو ہوا اچھا نہیں ہوا...... مجھے بھی اس کا بہت دکھ ہے لیکن پلیز آپ تو اس کی مجبوری سمجھ سکتی ہیں۔"

"لو یہ اور بولیں تم......مجبوری میں سمجھوں یا اسے سمجھنی چاہیے۔ آج کل تو ساری مجبوریاں ہی غریبوں کی ہیں پیسے والے کب مجبور ہوتے ہیں۔" ثانیہ ان کی بات سن کر خاموش رہ گئی۔

اس کو امید نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی محبت اور اس کی مجبوری کو غربت اور امارت کے ترازو میں تولیں گی۔ غربت اور امارت کا میزان تو دنیا کا سب سے زیادہ غیر متوازن اور بے عدل میزان ہے۔ ایک پلڑے میں اگر خامیاں اور برائیاں رکھی جائیں تو دوسرے میں جاکر وہی خوبیاں بن جاتی ہیں جبکہ دوسرے میں رکھے جانے والے عیب پہلے میں تولے جائیں تو باعث فخر نکلیں۔

"پھر بھی آنٹی...... دوست ہونے کے ناطے وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ بالکل میری اپنی سگی بہنوں کی طرح ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے وہی انسیت محسوس ہوتی ہے جو اسے آپ سے ہے۔" چھوٹے سے گھر کی پلستر اکھڑی دیواروں' پرانے فرش اور قدیم طرز کے فرنیچر کو دیکھتے ہوئے اس نے خلوص سے کہا۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو پر بیٹی تم خود ہی سوچو ہم تو وہاں سے بے عزت ہوکے نکلے تھے آنا تو اسے چاہیے تھا ناں ہمارے پاس...... تمہیں تو پتا ہے اس گھر کا دال دلیہ نوراً آپا کے دست شفقت سے ہی چلتا تھا۔ وہ دنیا سے کیا گئیں میری تو مانو چادر ہی سر سے چھن گئی۔ اس نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا۔" شمیمہ آن کی آن میں روہانسی ہوئیں۔

"چھوڑیں بھی اماں......ایسے بے مروت لوگوں کے لیے کیوں آنسو بہارہی ہیں۔" ثانیہ نے اندر داخل ہوکر تنک کر کہا اور چائے کی پیالی ثانیہ کے آگے رکھی۔

"وہ بے مروت نہیں ہے ثانیہ' وہ صرف مصلحتاً خاموش ہے وہ اپنی بھابی سے بنا کر رکھنا چاہتی ہے اسی میں اس کی بہتری ہے۔ وہ گھر اس کے بھائی کے نام ہے اور فی الحال اس کا بھائی بھی گھر میں نہیں...... وہ ملک سے باہر ہے اور آپ لوگ جانتی ہیں' صدف کتنی دبو سی لڑکی ہے۔" ثانیہ کا انداز برا لگنے کے باوجود اس نے لجاجت سے کہا۔ درحقیقت اپنے یہاں آنے کا فیصلہ اب اسے بے کار ہی

لگ رہا تھا۔ شمیمہ بیگم کا انداز کافی حوصلہ شکن تھا۔ وہ خود تو اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھیں لیکن انہیں صدف کا اتنا خیال نہیں تھا' نہ اس کی تنہائی کا احساس تھا جتنا اپنی آمدنی بند ہو جانے کی فکر تھی۔ دوسری وجہ شہروز تھا' جس نے ایک ذراسی پھلجڑی چھوڑ کر اس کے آتش شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ جلد ہی ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

❁......❁......❁

وہ بے حد ڈرتے ڈرتے شہرین کے بجائے سلمیٰ کو بتا کر گھر سے نکل آئی تھی کہ وہ ثانیہ کی طرف جارہی ہے۔ شہرین کے بجائے سلمیٰ کو بتانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ شہرین کو یہ باور کرایا جاسکے کہ وہ کبھی بھی کہیں بھی جاسکتی ہے اور اس کے لیے شہرین کے علم میں لانا ضروری نہیں اور دوسرا یہ کہ گھر سے نکلنے کے لیے اسے شہرین سے اجازت لینے جیسی کسی مشکل میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ مشورہ بھی اسے ثانیہ نے ہی دیا تھا۔

"سنو..... گھر میں کسی کو پتا نہ چلے کہ میں یہاں آئی تھی۔" ڈرائیور سے کہتے وقت اس نے ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا' یہ سب نورالزماں بیگم کی زندگی میں رکھے گئے وفادار ملازم تھے لیکن جب سے اس نے زندگی کو جفا کرتے دیکھا تھا اس کا سب پر سے بھروسا اٹھ گیا تھا۔ ایک نوٹوں کی گڈی ابھی شمیمہ کے لیے بھی رکھی تھی۔

شمیمہ اسے یوں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئیں پھر اپنے دل میں امڈتے جذبات کو قابو کر کے خفا خفا سی بیٹھ گئیں۔

وہ خود ہی جا کر ان کے گلے سے لگی تو جانے کہاں سے دو نمکین آنسو اس کا حلق تر کر گئے۔ دل کرتا تھا یونہی ان کے گلے سے لگی رہے اور زندگی بیت جائے لیکن اس خواہش پر خود انہوں نے ہی پانی پھیر دیا۔

"ارے اب کیا یونہی کھڑی رہو گی بیٹھ بھی جاؤ۔" اس نے نم آنکھیں پونچھ کر ثانیہ کو دیکھا' دل میں قدرتی محبت امڈ آئی۔

"تم کیسی ہو ثانیہ؟" وہ آگے بڑھ کر اس کے گلے لگنا چاہتی تھی لیکن ثانیہ دور ہی بیٹھ گئی۔ اس پر بھی اوس پڑ گئی۔

چند لمحے دونوں طرف خاموش رہی' صدف سر جھکائے لب کاٹتے ہوئے یہی سوچ گئی کہ کیا کہے اور کیا نہ جبکہ شمیمہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اندازے لگائے گئیں کہ آیا وہ ایویں میں اٹھ کے ملنے چلی آئی ہے یا اس خشک ملاقات کی تری کا سامان بھی ساتھ لائی ہے۔

"وہ..... آنٹی اس دن آپ کے ساتھ جو ہوا میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔" کھنکھارتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔ ماں کو آنٹی جیسے کسی غیر رشتے سے بلانا بھی کم اذیت نہیں ہوتا مگر اسے یہ اذیت سہنی ہی تھی۔

"جب ہی اتنی جلدی یاد آ گئی ہماری۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گئیں۔

"نہیں..... نہیں ایسی بات نہیں آنٹی..... اصل میں میری بھابی مزاج کی بہت سخت ہیں۔ میں ان کے ڈر کی وجہ سے اتنے دن گھر بیٹھی رہی ورنہ میں تو....." اس سے بات مکمل نہیں کی گئی' آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ شمیمہ بھی اپنی بات کہہ کر اس کی حالت دیکھ کر ذرا کی ذرا جز بز ہوئیں۔

"اچھا..... اچھا بس اب تم روؤ تو مت..... جو ہوا سو ہوا جانے بھی دو..... اب کیا کر سکتے ہیں قسمت میں اگر خواری لکھی ہو تو اٹھانا تو پڑتی ہے۔" اس نے خود ہی اپنے آنسو پونچھ لیے حالانکہ دل میں بڑی شدید خواہش ہوئی تھی کہ آنسو سمیٹنے والی ہتھیلیاں شمیمہ کی ہوتیں۔ اس نے سوں سوں کرتے ہوئے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے نوٹ برآمد کیے۔

"مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن پلیز یہ میں کچھ رقم لے کر آئی تھی آپ کے لیے۔ میں جانتی ہوں ماما آپ کی مدد کرتی رہتی تھیں۔" شمیمہ کی آنکھیں اچانک ہی کھل گئیں ثانیہ بھی ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔ صدف کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا۔ شمیمہ اور ثانیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"پلیز آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں کوئی مدد کرنا چاہ رہی ہوں۔ آپ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔" شمیمہ کے حلق سے پھنسی پھنسی سی ہنسی نکلی۔

''آ......اچھا اگر تم کہتی ہو تو رکھ لیتی ہوں۔ ورنہ اب تو آپا کے بعد میں اس سلسلے کو ختم ہی کرنے والی تھی۔ خاص طور پر اس دن کے بعد تو میں نے سوچ لیا تھا کہ مر جاؤں گی لیکن ایک دھیلہ بھی نہیں لوں گی تم سے کبھی نہیں......''

''ارے آنٹی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' اس کا دل کٹنے لگا اس نے زبردستی نوٹ ان کی مٹھی میں دبا دیئے۔

''تم آرام سے بیٹھو ناں...... تانی جا بہن کے لیے جلدی سے چائے لے کر آ کب سے آئی بیٹھی ہے بے چاری اور تو نے پانی تک نہیں پوچھا۔'' ان کا لب ولہجہ یک دم ہی بدل گیا تھا۔ صدف کے دل کو ذرا ڈھارس سی ہوئی تھی۔

وہ ثانیہ کے گھر کے بجائے اپنے ہی گھر واپس آ گئی۔ راستے میں ثانیہ نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہے اور رات میں فون کر کے ایک ضروری بات کرے گی۔

لاؤنج میں ہی شہری بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ ثانیہ کے سرپرائز کے بارے میں سوچ کر جتنی مگن سی اندر داخل ہوئی تھی اتنی ہی سمٹ کر رہ گئی۔ شہری کا حلیہ کچھ اتنا ہی قابل اعتراض تھا۔ صرف بنیان اور گھٹنوں تک آتی شارٹس میں بال بکھرائے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں جانے کس مشروب کا گلاس پکڑے وہ صوفے کی ایک ہتھی پر ٹانگ پھیلائے آڑھا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ صدف سر جھکائے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

''صدف......رکو۔'' اس سے پہلے کہ اس کا پیر پہلے قدمچے کو چھوتا جانے کہاں سے شہرین اچانک آن ٹپکی۔ صدف کا حلق یک دم ہی خشک ہوا۔ اب شہرین یقیناً اپنے بھائی کے سامنے اس سے باز پرس کرنے والی تھی۔

''کہاں گئی تھیں تم مجھے بتائے بغیر؟'' اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا...... شہرین ایک عورت ہی تھی۔ پتا نہیں وہ اس سے اتنا ڈرتی کیوں تھی۔

''میں سلمیٰ کو بتا کر گئی تھی۔''

''سلمیٰ گھر کی ملازمہ ہے مالکن نہیں...... تم مجھے بتا کر جاتیں۔''

''آپ گھر پر نہیں تھیں۔''

''تو فون کر لیتیں۔''

''لیکن کیوں......؟'' وہ زچ ہوئی۔ ''آخر میں اپنی مرضی سے کہیں آ جا نہیں سکتی کیا؟'' اس سے اس سوال کی امید دونوں بہن بھائی کو ہی نہیں تھی۔ شہرین تو جلتے توے پر ہی بیٹھ گئی۔

''نہیں...... کیونکہ یہ میرا گھر ہے یہاں آنے اور جانے والے ہر شخص کا مجھے علم ہونا چاہیے سمجھیں۔'' اس نے بے انتہا ٹھہرے ہوئے انداز میں جتایا اور صدف کو لگا اس کی ٹانگوں میں لرزش سی آئی ہو۔

''آئی ایم سوری......''

''میں کسی کی مرضی کی پابند نہیں۔'' بدقت تمام اس نے بات مکمل کی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

شہرین وہیں کھڑی مٹھیاں بھینچ کر اسے جاتا دیکھتی رہی اس کا انداز بہت کچھ سوچتا ہوا سا تھا۔ صوفے پر لیٹے لیٹے شہری لوفرانہ انداز میں ہنسا۔

''چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔'' اس نے طنز سے اسے مخاطب کیا۔ شہرین اس کی آواز سن کر چونکی پھر اطمینان سے گھوم کر اس کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''چیونٹی کے پر کترنا مجھے اچھی طرح آتے ہیں۔''

''ہوں......ں......ں۔'' اس نے معنی خیزی سے کہا۔

''لیکن شاید تم بھول رہی ہو پر پرندوں کے کترے جاتے ہیں چیونٹی کے نہیں۔''

''ہاں......تو چیونٹی کو مسلنا کون سا مشکل کام ہے۔'' اگلے ہی پل دونوں بہن بھائی ہنس رہے تھے اور وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر رو رہی تھی۔

شہروز نے صدف کے بارے میں کھل کر نہ صرف اپنی پسند کا اظہار کر دیا تھا بلکہ وہ اسے جلد از جلد اپنی زندگی میں

شامل بھی کرنا چاہتا تھا۔ ثانیہ کو اس روز صدف کو فون کرنا تھا لیکن ڈاکٹر کے یہاں سے واپسی میں خاصی دیر ہوگئی اور اس کے بعد اس کی طبیعت بوجھل سی رہی؛ اس نے دوسرے روز خود جا کر صدف کو یہ خوش خبری سنانے کا سوچا۔ ساتھ ہی شہرین سے مل کر شہروز اور صدف کے رشتے کی بات کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ گو کہ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ شہرین سے اس بارے میں بات کرے مگر اب مجبوری تھی کہ اس کے گھر میں اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا جس سے یہ بات کی جاسکتی لیکن پہلے صدف کے علم میں لانا ضروری تھا۔ ثانیہ جانتی تھی صدف کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ شہروز جیسے قابل خوش شکل اور برسر روزگار لڑکے کے لیے انکار یا اعتراض کی کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔

''بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی کہ تم میری دیورانی بنو۔'' دوسرے دن بھی جب اس کی ہمت نہ ہوسکی کہ خود جا کر صدف سے یہ بات کرتی تو اس نے فون پر ہی اسے پوری بات کہہ سنائی؛ حسب توقع صدف کو کوئی اعتراض تو نہیں تھا البتہ وہ کچھ جھجکی ضرور۔

''کوئی یہ نہ کہہ دے کہ سہیلی کے دیور کے ساتھ شادی یقیناً دونوں کا پہلے سے کوئی چکر رہا ہوگا۔'' اس کے دل میں ابھرنے والا پہلا ہی خیال خدشوں اور وہموں میں لپٹا ہوا تھا۔

''کہنے دو کسی کے کہ کہنے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی ناں اور اگر تھا بھی چکر تو کیا بری بات ہے..... آج کل پسند کی شادیاں کوئی بری بات نہیں اور یہ کوئی گناہ تو نہیں..... ویسے بھی پسندیدگی تو شہروز کی طرف سے ہے تمہاری طرف سے تو نہیں.....'' ثانیہ نے اس کے اعتراض کو ہوا میں اڑا دیا اور طبیعت بہتر ہوتے ہی شہرین سے بات کرنے کا عندیہ بھی دے دیا۔

عرصے بعد اس نے کھل کر سکون کی سانس لیا اور پھر فوراً ہی افسردہ بھی ہوگئی۔ کل تک جس گھر میں اس کی موجودگی اس کے دلی سکون اور اطمینان کا باعث تھی آج اسی گھر سے چلے جانے کا خیال اسے سکون بخش رہا تھا۔

جس روز ثانیہ کو آنا تھا وہ صبح سے ہی مصروف رہی۔ اس کا دل بے وجہ سجنے سنورنے کو چاہنے لگا..... وہ بے حد دل لگا کر تیار ہوئی حالانکہ ثانیہ نے بتادیا تھا کہ فی الحال وہ اکیلی ہی بات کرنے آئے گی۔ جب سلسلہ آگے بڑھے گا تو اس کا شوہر عارض اور شہروز چند ایک رشتے داروں کے ساتھ باقاعدہ بات پکی کرنے اور رسم کرنے آئیں گے۔

شام ڈھلے اس کی آمد کا پتا چلا تو وہ اس سے ملنے ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور شہرین کو سلمیٰ کے ذریعے بتادیا کہ ثانیہ اس سے کسی خاص مقصد کے تحت ملنا چاہتی ہے۔ ثانیہ سے مل کر وہ کچن میں چلی آئی تھی تاکہ سلمیٰ کے ساتھ مل کر اس کی خاطر داری کرسکے۔

''آیئے..... آیئے زہے نصیب۔'' فریج میں ہمیشہ کی طرح فروزن فوڈ آئیٹمز رکھے ہوتے تھے جلدی میں خود سے کچھ بنانے کے بجائے اسے وہی نکالنا مناسب لگا۔

شہرین کی نظریں مسلسل اس پر تھیں اس نے بے حد صبر اور تحمل سے ٹرالی میں چیزیں رکھیں اور جب کچن سے نکلنے لگی تو شہری نے آگے بڑھ کر ٹرالی پکڑلی۔

''اف.....'' وہ شدید احساس بے بسی سے جھنجلائی۔

''بس ایک کباب.....'' اس نے بے حد اطمینان سے پلیٹ سے کباب اٹھا کر پلیٹ واپس رکھی؛ صدف نے گہری سانس بھر کر کبابوں کو واپس سیٹ کیا اور ٹرالی لے کر باہر نکل آئی لیکن ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی اس کا سکون غارت ہوگیا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر آ کر ٹھہر گئی اور اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی کہ اچانک ثانیہ کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''جی.....! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ.....؟'' آواز خاصی بلند تھی جب ہی باہر تک سنی گئی۔

''وہی جو آپ نے سنا میں اور اشعر صدف کا رشتہ شہری سے طے کرچکے ہیں۔'' شہرین نے ثانیہ ہی کے انداز میں بلند آواز لیکن بدتمیزی سے جواب دیا۔ کوئی صور تھا جو پھونکا گیا تھا اور کمرے کے اندر اور باہر دو نفوس کو یکساں منجمد کر

گیا تھا۔

"مطلب...... لیکن آپ...... کیسے کرسکتی ہو اس طرح؟" کافی دیر بعد ثانیہ کی بے یقین آواز باہر آئی لیکن صدف کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

"کیا مطلب کیسے کرسکتی ہوں ارے بھئی وہ میری نند ہے...... میرے شوہر کی بہن ہے اس کے بارے میں ہم نہیں سوچیں گے تو اور کون سوچے گا۔" شہرین کی آواز میں بولتا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہی۔ صدف کی ساکت نظریں اب بالکل بے تاثر ہو کر شہری پر جم گئیں جو خاموشی سے آ کر اس کے اور دروازے کے درمیان کھڑا ہو گیا تھا اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

اسی لمحے ڈرائنگ روم کا پردہ ہلا شہری نے جلدی سے ایک طرف ہو کر ثانیہ کو راستہ دیا تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی خفا سی نظر صدف پر ڈالی صدف بے بسی سے صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ثانیہ نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے مگر اسی وقت اسے اپنی پشت پر شہرین کی آمد کا احساس ہوا اور وہ لب بھینچے سر جھکا کر تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

صدف نے دور تک اسے جاتے دیکھا...... ان ہی ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے پھر ان دونوں کو دیکھا تھا۔ اسے ان کے چہروں پر شیطانیت نظر آنے لگی تھی وہ تیزی سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو بہت خوش تھی پر پل بھر میں ہی اس کی خوشی غارت ہو گئی تھی۔ بھابی کی چال اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ ثانیہ کو بھی بتانا چاہتی تھی جب ہی اسے فون ملایا پر ثانیہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی۔ فون ریسیو کرتی ہی بولی۔

"مگر تمہارے گھر میں اس طرح کی بات چل رہی تھی تو مجھے ذلیل کروانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ثانیہ......!" مارے صدمے کے صدف کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اسے ثانیہ سے اس بات کی امید نہیں تھی۔

"میرا یقین کرو ثانیہ اگر اس بات کا ایک فیصد بھی مجھے پتا ہوتا تو کیا میں تم سے ذکر نہ کرتی۔" بے یقینی کی تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ اس سے ڈھنگ سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

"تو خبر رکھا کرو ناں...... تمہارے اپنے گھر میں رہنے والے تمہارے ہی بارے میں زندگی بھر کے فیصلے کرتے پھر رہے ہیں اور بے خبر بھی سب سے زیادہ تم ہی ہو...... واہ۔" اسے اپنی بے عزتی بھولی تو نہیں تھی۔

لیکن صدف کے لیے اس کا رویہ ہر غم اور صدمے سے بڑھ کر تھا وہ سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

"تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور یہ رشتہ میں اپنے مائیکے سے نہیں سسرال سے لے کر آئی تھی اور سسرال بہرحال سسرال ہی ہوتی ہے۔ میرا امپریشن اس قدر خراب ہوا ہے کہ بس......" ثانیہ نے غصہ سے کال منقطع کردی تھی۔ وہ دکھ و حیرت سے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کو دیکھنے لگی آنسو پلکوں کے بند توڑ کر رخسار پر گر رہے تھے۔

❀ ❀ ❀

آنے والے دن اس لحاظ سے بہتر تھے کہ نہ صرف شہرین کا رویہ بلکہ شہری کا حلیہ بھی کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا۔ رویہ البتہ عجیب سا تھا۔ اس نے ان دونوں بہن بھائیوں کے رویوں میں بہتری تو دیکھ لی تھی لیکن پوری زندگی اس شخص کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرنے کی ہمت بہرحال اس کے اندر نہیں تھی۔ جیون ساتھی کے روپ میں اس نے جب سے شہروز کو سوچا تھا اب اس خاکے میں کوئی اور جچتا نہیں تھا۔ ثانیہ نے اس دن کے بعد سے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ خود صدف کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اتنی باتیں ہو جانے کے بعد وہ اس سے رابطہ کرتی۔

اسے تو یہ تک علم نہیں تھا کہ شہروز کے دلی جذبات اس کے لیے میں کیا ہیں۔ کیا وہ اس کے لیے محبت کی حد تک سنجیدہ تھا یا اس سے شادی کا فیصلہ صرف لمحاتی جذبات کا

تقاضہ تھا۔ ثانیہ کے یہاں جلد ولادت متوقع تھی۔ وہ اب نہ اس کے گھر آتی تھی اور نہ فون پر فرصت سے باتیں کرتی تھی اس کی طبیعت ہی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف شہری کا حلیہ راتوں رات ایک دم بدل گیا تھا۔ ایک شریف باکردار نوجوان دکھائی دینے لگا اور پھر اس نے صدف کو تنگ کرنا بھی بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شہرین نے بھی اپنے رویے سے اسے دوبارہ کبھی احساس نہیں دلایا کہ وہ اس گھر کا حصہ نہیں ہے یا اس کا کوئی عمل انہیں ناگوار بھی گزر رہا تھا۔ یہ تبدیلی اسے اچھی تو لگی تھی پر وہ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ وہ اب ان پر بھروسا نہیں کرسکتی تھی اور کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ان کے انداز میں یہ تبدیلی آئی تھی وہ فی الحال جاننے سے قاصر تھی۔

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ صدف دل کی صاف تھی، سلجھی ہوئی پڑھی لکھی معصوم لڑکی تھی اور پھر نور الزماں بیگم نے بھی اسے دنیا کے سرد و گرم سے بچا کر رکھا تھا، جب ہی لوگوں کو پرکھنا اسے نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ پرانے خیالات بھلا کر ان کے بارے میں اچھا سوچنے پر مجبور ہوگئی یا کردی گئی تھی۔ یہاں تک کہ شہرین اور اشعر کا اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ اسے ٹھیک لگنے لگا تھا۔ تب ہی ایک روز اسے شہروز کی کال موصول ہوئی وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

......✿......✿......

ساحل سمندر کے کنارے بنے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ ماحول بے حد خوب صورت تھا' دن کی چمکیلی دھوپ کی تپش کا زور تیز ہوا نے توڑ دیا تھا۔ اسی تیز ہوا کے جھونکوں میں اس نے' اس کے چمک دار بالوں کو ماتھے پر گرتے اور پھر بکھرتے دیکھا تو نگاہ چرالی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ نے دیر کردی' میں اپنی آنے والی زندگی کا فیصلہ کرچکی ہوں۔'' اس کی آواز میں نہ چاہتے ہوئے بھی کرچیاں سی ٹوٹ رہی تھیں۔ حسب توقع وہ چونکا پھر آنکھیں سکیڑتا ہوا بولا۔

''لیکن کیوں..... اس طرح اچانک کیسے' میں نے دیر کردی یا آپ نے عجلت کا مظاہرہ کیا؟''

''میں نے جو بھی کیا لیکن آپ نے اس دوران کس طرح کا مظاہرہ کیا' ثانیہ کے بقول آپ میری محبت میں مبتلا تھے' تو جب اتنے دن میں غائب رہی آپ کہاں تھے کیا کررہے تھے؟'' وہ نگاہوں میں الجھن بھرے اسے دیکھ رہا تھا' وہ بددل نہیں لیکن بدگمان ضرور تھی۔

''آپ بھول رہی ہیں میں نے سیدھے سبھاؤ پرپوزل بھیجا لیکن آپ کے گھر والوں نے......''

''میرے گھر والوں کی حقیقت سے آپ اچھی طرح واقف تھے شہروز۔'' اس کے لبوں سے اپنا نام سننا ایک اچھا تجربہ تھا لیکن وقت برا چل رہا تھا۔

''ثانیہ نے آپ کو میری اور ان کی آپس کی ناپسندیدگی کے بارے میں بتایا تو ہوگا' آپ کے پرپوزل کو انکار میں نے نہیں میرے گھر والوں نے کیا تھا بہرحال......'' وہ رکی پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اگر آج کے بجائے آپ نے اسی وقت مجھ سے وضاحت مانگی ہوتی تو شاید حالات مختلف ہوتے۔''

''تو اب...... اب کیا حالات بدل گئے ہیں؟''

''بالکل......'' وہ فوراً بولی۔ ''حالات کے ساتھ کیا میری حیثیت بھی بدل گئی ہے؟'' اس کی بات پر شہروز نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

''تم صدف..... میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہو' میں تمہاری طرف سے بدگمان نہیں صرف تھوڑا مصروف تھا۔'' اس نے جواب نہیں دیا' رخ موڑ کر دور شور مچاتی لہروں کو دیکھتی رہی۔

''ماما کے چلے جانے کے بعد' میں نے جتنی تنہائی ان چند مہینوں میں کاٹی ہے اور جس جس انداز میں لوگوں کی شکلوں سے نقاب اترتے دیکھے ہیں' وہ میں ہی جانتی ہوں' اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی نئے رشتے پر بھروسا کرنے کے بجائے آزمائے ہوؤں پر ہی صبر کرلوں۔'' اس کی آنکھوں میں شام اترنے لگی تھی' بہت سارے لہجے

آوازیں اور الفاظ ایک ساتھ گڈمڈ ہوکر اس کی سماعت سے ٹکرانے لگے تھے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے زیادہ وہاں بیٹھنا شاید اس کے لیے مشکل تھا۔

آنکھیں بار بار بھرنے لگی تھیں اور وہ اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ شہروز نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں کھڑا نگاہوں میں الجھن لیے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

⁂

شہروز سے ملاقات کے بعد دل بوجھل ہوگیا تھا اور آنکھیں بھی بلاوجہ ہی بھر آرہی تھیں۔ اس نے گھر جانے کا ارادہ ترک کرکے گاڑی کا رخ شاپنگ مال کی طرف کردیا۔ دل بہلانے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود کو بے مصرف کاموں میں الجھا لیا جائے۔ یوں ہی ایک دکان سے دوسری دکان میں پھرتے ہوئے اس نے آخری بار شہروز کا پیغام ریسیو کیا۔

"وقت زندگی میں ہر شخص کو ایک نہ ایک موقع ضرور دیتا ہے کہ وہ شخص اس موقع سے فائدہ اٹھائے میری دعا ہے کہ زندگی میں کبھی آپ کسی موقع کے ضائع چلے جانے پر کبھی نہ پچھتائیں۔" وہ کتنی دیر اس میسج پر نظریں جمائے کھڑی رہی یہاں تک کہ نظروں کے سامنے اسکرین دھندلی ہوگئی پھر سیل فون بیگ میں ڈالتے ہوئے اللہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ شہرین اور شہری کے لیے وہ بہترین قسم کے سوٹ اور قیمتی پرفیوم خریدنے لگی تھی۔

⁂

رات پھیل چکی تھی۔ پورے گھر کی لائٹس جل رہی تھیں گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے محسوس کیا اسے گھر سے نکلے بہت وقت بیت گیا تھا۔ اس کے قدم بلاوجہ لرزش زدہ ہورہے تھے۔ شاید وہ ایک بڑا فیصلہ خود سے کرلینے کے بعد کچھ الجھ سی رہی تھی۔ لاؤنج کا دروازہ کھولنے سے پہلے ایک گہری سانس بھری پھر دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اسے نہیں پتا تھا کہ خالی لاؤنج کو دیکھ کر اسے سکون سا کیوں محسوس ہوا شاید وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے تحائف ایک طرف رکھے اور خود کو مزید مطمئن کرنے کے لیے شاور لینے چلی گئی۔ باہر نکل کر اس نے بالوں کو سلجھایا پھر یونہی کھلا چھوڑ دیا کندھوں پر آسمانی دوپٹا پھیلاتے ہوئے اس نے خود کو کافی مطمئن سا محسوس کیا۔ تحائف اٹھائے اور لبوں پر مسکراہٹ سجالی۔ شہرین اپنے کمرے میں ہی تھی کیونکہ اس کی بھاری موٹی اور تیز آواز باہر تک آرہی تھی۔ اس کی آواز عموماً تیز ہی نکلتی تھی لیکن آج اس تیزی میں کوئی غیر معمولی پن تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دروازے پر رک گئی۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ اتنی جلدی مت دکھاؤ تھوڑا ٹھنڈا کرکے کھا لینے میں کوئی حرج نہیں۔" پتا نہیں وہ لوگ کس بارے میں بات کررہے تھے۔

"لیکن زیادہ دیر کرنے میں کہیں بنی بنائی بات بگڑ ہی نہ جائے۔" شہری کی آواز آئی۔

"ارے نہیں بگڑتی کوئی نہیں ہے اب اس کا ایک دوست تھی اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا بھائی بیرون ملک ہے......" شہرین کی آواز میں حد درجہ حقارت تھی۔ صدف کو لگا جیسے کسی نے اس کے اوپر ٹھنڈا یخ پانی انڈیل دیا ہو وہ وہیں ساکت کھڑی رہی۔

"دیکھ لو تم...... ایسا نہ ہو بعد میں کوئی اور نکل آئے چڑیا کا سپورٹر۔" کوئی شک نہیں تھا کہ بات اسی کے بارے میں ہورہی تھی۔

"ارے ہمارے علاوہ کون سپوٹ کرتا ہے۔ آج کل کے عاشق تو ویسے بھی سڑک چھاپ ہیں۔ میں نے بھی خوب لتاڑا تھا اس کی فرینڈ کو......" اس کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔ ہاتھ میں پکڑے شاپرز اس نے دور زمین پر پھینکے اور خود سیدھی اندر گھس گئی۔

شہرین اور شہری اسے یوں یک دم سامنے دیکھ کر حیران پریشان رہ گئے۔ اس کا چہرہ اندرونی تپش سے سرخ ہورہا تھا۔

''صدف تم آ گئیں...... ہم ابھی تمہارا ہی ذکر کررہے تھے۔'' شہرین نے لڑکھڑاتی آواز میں صورت حال کو قابو کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''جی اور میں نے سب سن لیا ہے آپ جن الفاظ میں میرا ذکر کررہی تھیں۔'' اس نے رک کر دونوں بہن بھائی کے چہرے دیکھے۔

''شرم آرہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ میں آپ لوگوں کو اپنا جان کر آپ پر اعتبار کرنے چلی تھی' کتنی بڑی بیوقوف ہوں میں۔''

''چلو تم نے جان تو لیا کہ تم کتنی بڑی بیوقوف ہو۔'' شہری فوراً چولا اتار کر اصلی روپ میں آیا اور ایک طنزیہ مسکراہٹ اس پر اچھال کر اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''جی لیکن جب بیوقوفوں کو ان کی بیوقوفی کا علم ہوجائے تو ان کو عقل آجاتی ہے' کبھی کبھی۔'' شہرین ابھی تک حیران پریشان اپنے بھائی اور صدف کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس اچانک بگڑ جانے والی صورت حال کو کس طرح قابو کرے۔

''اچھا...... مبارک ہو بھئی انہیں عقل بھی آ گئی۔'' شہری یوں بولا جیسے اسے کسی بات کا کوئی ڈر نہ ہو'اس نے میز پر رکھا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکالی اور سلگانے لگا۔

''گڈ...... اب یہ بھی بتادیں کہ اس تبدیلی کے بعد آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟'' صدف چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''کس قدر نیچ ذلیل اور گھٹیا ہو تم دونوں بہن بھائی' میں تو مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم دونوں میرے بارے میں اس قدر گھناؤنی سازشیں کرنے میں لگے ہو۔'' شہرین کا ضبط جواب دے گیا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو لڑکی' ورنہ میں اس زبان کو خاموش کروانا اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''یہی تو غم ہے مجھے آپ سب جانتی ہیں اور جسے جاننا چاہیے وہ پردیس میں بیٹھا انجان بنا ہوا ہے' میں ابھی جاکر اشعر بھائی کو فون کرکے آپ دونوں کی اصلیت بتاتی ہوں۔'' شدید غصے نے اس کی ذہنی صلاحیتیں ضبط کرلی تھیں ورنہ وہ کم ازکم اس بات کو ان کے سامنے تو نہ کہتی۔

جتنی تیزی سے وہ جانے کے لیے مڑی'اس سے کہیں زیادہ تیزی سے شہری اٹھ کر اس پر جھپٹا اور اس کے بالوں کو پیچھے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ صدف اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے لڑکھڑائی شہرین کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ شہری اس حد تک گرسکتا ہے اس کی اور صدف کی تیز چیخیں ایک ساتھ ہی نکلی تھیں۔ شہری نے بنا کچھ کہے اس کے بال جکڑے اور پے درپے دو تین لگاتار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیئے تھے۔ تکلیف سے صدف کی جان نکلنے لگی' اسے کبھی کسی نے سخت ہاتھوں سے چھوا تک نہ تھا کہاں یہ جسمانی اذیت۔

''چھوڑ دو مجھے' اللہ کے واسطے...... اف اللہ میرے بال...... یا اللہ......'' کرب واذیت سے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

شہری نے اس پر بس نہیں کیا' وہ اسے لاتوں اور گھونسوں سے بری طرح مارنے لگا تھا اور پھر گھسیٹتے ہوئے اسے اس کے کمرے میں لے آیا۔

''جب تک دماغ ٹھکانے پر نہیں آجاتے مرو یہیں۔'' اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر ایک کش لگایا پھر زمین پر پڑی سسکتی ہوئی صدف کو دیکھ کر مزید ایک لات رسید کی تو وہ درد سے مزید دوہری ہوگئی تھی۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہوئی۔

باہر کے دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ وہ چونکی ہوکر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور سلمٰی اندر داخل ہوئی۔

''سلمٰی...... سلمٰی......'' وہ بے تابی سے اٹھی۔

''باجی......'' سلمٰی کی محبت بھری پکار میں ایک عجیب سا احساس تھا۔ لمحے بھر میں دونوں ایک دوسرے سے بری طرح لپٹی کھڑی تھیں۔

"بس باجی ان دونوں کے آنے سے پہلے آپ یہاں سے نکل جائیں۔"

"نکل جاؤں......!" وہ جیسے ایک خواب سے جاگی۔

"بس باجی کہیں بھی چلی جائیں اپنی امی کے گھر چلی جائیں۔" سلمٰی اتنا کہہ کر ہانپ گئی مالکوں کا خوف سر پر سوار تھا۔ صدف پُرسوچ انداز میں نفی میں سر ہلا کر بڑبڑائی۔

"امی کے یہاں تو نہیں......ثانیہ......"

"ثانیہ باجی اور ان کے میاں گھر پر نہیں ہیں۔ بڑی مشکل سے ان کے گھر کا فون نمبر ملا تھا باجی ان لوگوں نے آپ کا موبائل بھی پتا نہیں کہاں رکھ دیا یا اللہ جانے بیچ دیا آپ بس جلدی سے یہاں سے اٹھ جائیں۔" صدف نے بوکھلا کر اپنے بکھرے بال سمیٹے اور وہ کمرے سے نکلتے ہوئے چونکی۔

"کیا بات ہے سلمٰی تو اتنی گھبرا کیوں رہی ہے۔"

"بس کیا بتاؤں باجی اس منحوس شہری کی آپ پر نیت خراب ہے ابھی باہر جاتے ہوئے وہ دونوں باتیں کررہے تھے تو میں نے چھپ کر سن لی باجی اللہ کے واسطے آپ یہاں سے چلی جائیں نکلیں جلدی۔ موسم بہت خراب ہوگیا ہے وہ دونوں ایسا نہ ہو گھر لوٹ آئیں۔" سلمٰی نے ایک افراتفری کے عالم میں اس کا بازو پکڑ کر باہر گھسیٹا۔ نجانے اسے کمرے کی چابی کہاں سے مل گئی تھی جو اس نے تالا کھول کر صدف کو باہر نکالا تھا۔

"پر......سلمٰی۔" سیڑھیاں اتر کر وہ ایک بار پھر رک گئی۔

"وہ میرے بارے میں یہ سوچ رہے ہیں اور تو مجھے گھر سے بھگا رہی ہے۔ اس طرح تو تُو بری طرح پھنس جائے گی۔"

"ارے باجی نہیں پھنسوں گی کچھ نہیں ہوگا تم فکر مت کرو جاؤ یہاں سے۔" سلمٰی نے اس کو باہر کی طرف دھکیلا۔

"ساری زندگی آپ کا نمک کھایا باجی اگر وقت پڑنے پر حلال نہ کیا تو لعنت ہے ایسی زندگی پر......" سلمٰی بھی جذباتی ہوگئی۔ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں پھر سلمٰی ہی ہوش میں آئی۔

"جائیں باجی...... ڈرائیور انتظار کررہا ہے۔" پورچ میں قدم رکھتے ہی بارش کی بوندوں نے اس کا استقبال کیا۔ اللہ کا نام لے کر اس نے دوپٹا سر پر جمایا اور گھر سے نکل آئی۔

"ہمارے علاقے سے باہر نکل کر رکشہ ٹیکسی دیکھ لینا بی بی صیب اور معاف کردو بی بی صیب......اس سے زیادہ ام کچھ نہیں کرسکتا۔" ڈرائیور نے ہی اسے یہ بٹوہ اور ہدایت پکڑائی اور ایک طرف گاڑی روک دی تھی۔ وہ تیزی سے گاڑی سے اتر گئی تھی۔

......✿......✿......

"ارے اللہ خیر کرے...... اس وقت کون آگیا؟" شمیمہ کی زبان میں خدشات بول پڑے۔

"آپ لوگ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں۔" سجاد ان کو وہیں رکنے کا کہہ کر دروازہ کھولنے بڑھ گیا۔

ثانیہ اور شمیمہ بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر صحن میں آگئی تھیں۔

"صدف......! صدف......؟" دروازہ کھولنے پر صدف کو سامنے دیکھ کر شمیمہ بولی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس وقت کیوں آئی ہے۔ صدف ان سے لپٹ کر بری طرح رودی تھی۔ سجاد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ماجرہ ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس پر گزرنے والے واقعات اتنے مختصر نہ تھے کہ وہ یوں بیٹھے بیٹھے سنا دیتی۔ شمیمہ اس کو دلاسا دینے لگیں۔

"کون ہے اماں یہ اور اس وقت ہمارے گھر میں کیوں آئی ہے؟" سجاد نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ......یہ......" وہ گڑبڑائی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"بتائیں ناں آپ خاموش کیوں ہیں؟" وہ طنز سے بولی اور پھر شمیمہ کو خاموش دیکھ کر خود ہی بولی۔

"شرم نہیں آتی تمہیں' اپنی بڑی بہن پر اس طرح الزام لگاتے ہوئے' اپنی سگی بہن کے کردار پر کیچڑ اچھالتے ہوئے۔" غم و غصے سے اس کی آواز پھٹنے والی ہوگئی' جبکہ اس کی بات کے جواب میں سجاد نے حیرت اور شمیمہ اور ثانیہ نے ٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ہاں...... ہاں...... بڑی بہن...... سگی بہن...... پوچھو...... پوچھو ان سے' یہ کھڑی ہیں' ہمیں جننے والی' ہم دونوں بہن بھائی کو اس دنیا میں لانے والی ہماری ماں' جنہوں نے محض چند روپوں کے لالچ میں میرا سودا کردیا تھا۔ جنہوں نے اپنی ممتا اور میرا ہر خونی رشتہ بیچ ڈالا تھا' آج ان کی وجہ سے میں حالات کے اس بھنور میں پھنس چکی ہوں کہ مجھے کوئی کنارا نہیں مل رہا' اپنی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے انہوں نے میرے لیے وہ فیصلہ کیا' جس نے آج مجھے بھری دنیا میں اکیلا اور بے آبرو کردیا ہے۔ میرا سگا بھائی جانتا تک نہیں کہ اس کا اور میرا رشتہ کیا ہے دنیا میرے ساتھ برا سلوک کررہی ہے اور یہ میرا سگا بھائی مجھ پر شک کررہا اور بدکردار جان رہا ہے اس کے علاوہ یہ کچھ نہیں کرسکتا۔" وہ انگلی اٹھا کر شمیمہ کے طرف اشارہ کررہی تھی' شمیمہ کا نظریں چراتا انداز سجاد کو بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا لیکن اس کے لیے اتنی بڑی حقیقت پر اتنی جلدی یقین کرنا ممکن نہیں تھا' وہ بس بے یقین نظروں سے ماں کو تک رہا تھا۔

"انہوں نے میرا نصیب اپنے ہاتھ سے لکھ کر اسے سنوارنا چاہا اور آج میرا یہ حال ہے کہ اپنی عزت اور زندگی بچانے کی فکر میں' میں کہیں کی نہیں رہی، منہ بولے رشتے چھوٹ گئے اور خون کے رشتوں نے...... یااللہ میں کہاں جاؤں۔" اس کی سکت ختم ہوگئی' وہ بری طرح ہانپنے لگی' اسے زوردار چکر آیا، اس نے سر تھاما اور زمین پر آرہی۔

"صدف......" ثانیہ ایک زوردار چیخ مار کر اسے سنبھالنے کو لپکی۔

......✿......✿......

کہتے ہیں برے کام کا انجام برا ہی ہوتا ہے لاکھ وہ اچھے کی تلاش میں رہے لیکن برا کرنے والا اپنے لیے کنویں خود ہی کھود لیتا ہے اور پھر اس میں اس بری طرح سے گرتا ہے کہ کبھی نکل ہی نہیں پاتا۔ یہ ہی انجام شیرین اور اس کے بھائی شیری کا بھی ہوا تھا۔ خریداری کرنے کے بعد وہ گھر واپس آرہے تھے کہ کار کو حادثہ پیش آگیا۔ ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ گاڑی کی کوئی چیز سلامت نہیں رہی تھی اور وہ دونوں بھی موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے تھے۔ نعش کو اسپتال پہنچایا گیا اور ورثہ کا انتظار کیا جانے لگا۔ پر ان کا کوئی اپنا ہوتا تو آتا ناں اشعر تو ملک سے باہر تھا اور صدف کا موبائل شیری نے توڑ دیا تھا پھر حادثہ میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ملی تھی جس سے گھر پر رابطہ کیا جاتا اور ان کے مرنے کی خبر دی جاتی۔ اتفاق سے پہچان کے لیے آئی ڈی کارڈ موجود تھے جن سے وہ غیر ملکی ثابت ہوگئے تھے۔ پر ان کے ملک سے رابطے کا مطلب تھا کہ اپنے ملک پر الزام لگواتا، اس لیے بہت خاموشی سے انہیں دفنا دیا گیا تھا، ہر ثبوت کے ساتھ، اگر جو کوئی رابطہ کرتا تو پھر یہ بات کھولی جاتی اور تفتیش بھی ہوتی کہ حادثہ کب اور کیونکر پیش آیا ابھی فی الحال اس پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔

کتنی عجیب موت تھی نہ کوئی اپنا شریک ہوا اور نہ کسی اپنے نے کاندھا دیا تھا۔ پیسے کے پیچھے بھاگنے والے دوگز زمین میں اترے بھی تو خیرات میں دیئے گئے پیسوں کی صورت۔ پر انہیں اب ان باتوں سے کہاں فرق پڑتا تھا۔ وہ لوگ تو مرگئے تھے اور اپنے پیچھے بری یادیں چھوڑ گئے تھے۔

سلمیٰ کے ذریعے اشعر کو بھی صدف پر ڈھائے گئے ظلم کی داستان کی خبر ہوگئی تھی اور وہ انتظار میں تھا کہ کہیں اسے شیرین اور اس کا بھائی شیری ملے تو وہ ان کا حشر بگاڑ دے گا۔ اس نے انہیں تلاش نہیں کیا کیونکہ تلاش اپنوں کو کیا جاتا ہے وہ اب ان سے ہر رشتہ ختم کرچکا تھا کیونکہ دیر سے ہی سہی اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اشعر واپس آگیا تھا اور صدف کو بھی شمیمہ کے گھر سے اپنے گھر لے آیا تھا۔

......✿......✿......

ثانیہ کی بیٹی ہوئی..... ثانیہ کئی سال بعد ماں بنی تھی اور اسی کی طرح صدف کے لیے بھی یہ بہت خوشی کی خبر تھی۔ اسے اپنی خودساختہ ناراضی ختم کرنی پڑی تھی۔

آنے والے چند مہینوں میں اس کے اور ثانیہ کے تعلقات پھر سے بحال ہوگئے تھے۔

اس نے ثانیہ خود پر بیتی ہر بات بتائی اور دل کا بوجھ ہلکا کرلیا تھا۔

صدف پر گزرے حالات نے اس کے دل کو دکھی کردیا تھا۔ بہرحال وہ اس قید سے نکل آئی حالات پھر سے گزشتہ سے جڑنے لگے تھے۔ ثانیہ کی بیٹی صرف اپنے ماں باپ کی ہی نہیں بلکہ خالہ یعنی صدف اور چاچو کے لیے بھی بہت خوشیاں لے کرآئی تھی۔ صدف کو مکمل طور پر زندگی کی طرف واپس لوٹتا دیکھ کر ہی ثانیہ نے اس سے وہ بات کرنے کا سوچا جو پچھلے کئی دن سے مسلسل اس کے ذہن میں تھی۔

"تم نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے صدف؟"

"آئندہ زندگی......؟"

"کیا ساری زندگی ایسے گزاروگی؟"

"گزر تو رہی ہے۔" وہ سمجھ رہی تھی ثانیہ کیا کہنا چاہ رہی ہے اس لیے جان بوجھ کرانجان بنتے ہوئے اس کی بیٹی جسے سب پیارے مانو پکارتی تھی سے کھیلنے لگی۔

"جیسی گزر رہی ہے میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اسی طرح نہیں گزر سکتی۔" ثانیہ اسے منانے کا مکمل ارادہ کرکے بیٹھی تھی کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شہروز گھر آیا تھا اور صدف نے جس طرح اسے نظر انداز کیا تھا اس کے انداز نے شہروز کو نہ صرف شرمندہ بلکہ افسردہ بھی کردیا تھا وہ اب بھی اس سے شادی کا خواہش مند تھا اور اپنی پچھلی غفلت پر شرمندہ بھی۔

"دیکھو ثانیہ اگر تمہارا اشارہ اپنے دیور کی طرف ہے تو پلیز...... مجھ سے اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں...... ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی اور دوبارہ کبھی تمہارے گھر نہیں آؤں گی۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اس کا انداز قطعی تھا۔

"تم کیوں خود کو بھری دنیا میں اکیلا کرنے پر تلی ہوئی ہو؟"

"ایسا میں نہیں تم کررہی ہو اللہ حافظ۔" وہ تیزی سے اٹھی لیکن ثانیہ اس سے بھی تیزی سے اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔

"میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی اور اس طرح سے تمہارے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا شرافت سے بیٹھو ادھر......" اس نے صدف کے کاندھوں پر زور دیتے اسے بیڈ پر بٹھایا۔

"دیکھو صدف...... تم زندگی بھر اکیلی نہیں رہ سکتیں ایک بات تو طے ہے تمہیں شادی کرنا ہی ہوگی یہی زندگی کی تکمیل ہے اور اصل مصرف بھی...... گھر شوہر بیوی بچے خاندان یہ انسان کا دائرہ ہے اور جوانی میں طاقت میں پیسے کی ریل پیل مستی اور نشے میں انسان چاہے جتنا بھی دور نکل جائے اسے بلآخر اسی دائرے میں سمٹنا ہوتا ہے اور جو لوگ یہ دائرہ نہیں بناتے وہ بھیڑ میں بھی تنہا رہ جاتے ہیں ابھی تم جوان ہو لیکن گزرتی عمر کے ساتھ ساتھ انسان کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت ایک ساتھی کی ضرورت رہتی ہے اور یہ جیون ساتھی کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔" صدف خاموشی سے سنتی رہی۔

"تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات اور تم کیوں اپنے ساتھ ساتھ اشعر بھائی کو بھی تنہا کرنا چاہتی ہو...... وہ گلٹی فیل کرتے ہیں حالانکہ اگر دیکھا جائے تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔" صدف نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ثانیہ نے ٹوک دیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اپنی طرف سے تو انہوں نے صرف پسند کی شادی کی تھی اب اگر وہ لڑکی ہی غلط نکلی تو اس میں ان کا کیا قصور۔" صدف کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے۔

"یہ تو ان کی انسانیت ہے کہ وہ اب تک تمہارے لیے

سوچتے ہیں اور دیکھو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم ساری زندگی اکیلے تو شاید گزار لو لیکن بحیثیت ایک بہن کے ان کے ساتھ نہیں گزار سکتیں کیونکہ بہر حال تم ان کی بہن نہیں ہو۔'' ثانیہ نے جما جما کر کہا' صدف نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''اس سے پہلے کہ وہ تھک کر دوبارہ شادی کریں اور پھر سے تم ان کی بیوی کی نظروں میں کھٹکو' تم اپنا گھر اپنی زندگی دوبارہ سے شروع کر لو...... اسی میں تمہاری اور تمہارے بھائی کی بہتری ہے۔'' ثانیہ نے بات کے اختتام پر اسے دیکھا...... صدف اب بھی چپ تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''پرانی یادیں دہرا کر خود کو تکلیف دینے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان آگے بڑھ جائے اور اپنے لیے خوشگوار یادیں بنالے پھرسے تاکہ اگر کبھی وہ ماضی میں جھانکے تو اس کے پاس' صرف آنسو نہیں چند خوشیاں بھی ہوں۔'' صدف کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ قائل ہو رہی تھی۔ ثانیہ نے محبت سے اس کا کندھا دبا کر چھوڑا تو وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

اب کی بار ثانیہ نے اسے جانے دیا' وہ اسے سوچنے اور ایک بہتر فیصلہ کرنے کے لیے وقت دینا چاہتی تھی۔ شہروز ابھی تک اس کے انتظار میں تھا اور یہ اس کے خیال میں صدف کی خوش قسمتی تھی۔

صدف لان سے گزر رہی تھی تب ہی شہروز راستہ میں آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر نظریں چرا گئی۔

''اب تک ناراض ہو؟'' شہروز نے اسے بغور دیکھتے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا؟'' اس کے خفگی بھرے لہجے پر شہروز مسکرایا۔

''بالکل ہونا چاہیے اور مجھے منانے کا اختیار بھی ہے۔''

''جی......!'' وہ سمجھی نہیں تھی۔ جب ہی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''بھئی جہاں محبت ہو وہاں ناراضی بھی ہوتی ہے اور مان بھی کہ دوسرا ہمیں ضرور منائے گا۔ اب بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' اس کی وضاحت پر وہ جھینپ گئی۔

''پتا نہیں۔'' وہ کہہ کر جانا چاہتی تھی کہ شہروز نے اس کی کلائی تھام لی۔

''کیا پتا نہیں؟ میری محبت سے انجان ہو یا پھر ان پھولوں سے جن کی مہک آج بھی اپنے اندر محسوس کرتی ہو۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں سرگوشی کر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح یہاں سے نکل جائے' سالے یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی دیکھ نا لے۔

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے جانے دیں۔''

''ایک شرط پر جانے دوں گا کہ تم میری محبت کو قبول کر کے ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آنے کا وعدہ کر لو تو......'' وہ کہہ کر معنی خیزی سے مسکرایا تو وہ جو اس پر نظریں جمائے کھڑی تھی نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ کتنی خوب صورتی سے وہ محبت کا اظہار کر گیا تھا اور وہ یہ ہی تو چاہتی تھی۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی تھی۔

''بولو منظور ہے؟'' اس کو خاموش دیکھ کر اس نے سرگوشی کی اور وہ کیا کہتی۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی اس کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ بس ان خوابوں کو کسی پر واضح نہیں کیا تھا۔ اس لیے بہت آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''یاہو......'' شہروز کے منہ سے بے اختیار نعرہ بلند ہوا اور بے خیالی میں اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی اور ایک نظر پلٹ کر اسے دیکھا۔ جو برستی بارش میں ہاتھ پھیلائے گول گول گھوم رہا تھا۔ محبت کا ہر رنگ اس پر آشکار ہو گیا تھا وہ کھل کر مسکرائی۔ آسودہ مسکراہٹ جس نے اسے ہر غم سے آزاد کر دیا تھا۔

www.naeyufaq.com

ملن اگر ہے گریزاں

سباس گل

تم نیند ہو تو سو کے گزاریں گے یہ حیات
تم خواب ہو تو مجھ کو کہاں صبح کی طلب

علی احمد نے خواب آگیں لہجے میں نیشا سے کہا وہ دوسری جانب اپنے سیل فون سے کان لگائے اپنے شوہر کی محبت کو محسوس کرتی خوشی سے کھلی جارہی تھی۔ ان دونوں کا نکاح ہو چکا تھا عنقریب رخصتی ہونے والی تھی۔

''آنکھیں کھول لیں سرتاج...... صبح ہو چکی ہے۔'' نیشا نے ہنس کر کہا۔

''ہائے...... وہ دن کب آئے گا جب تم سیل فون کے بجائے اپنے سندر کومل ہاتھوں کے مخملیں لمس سے چھو کر مجھے جگاؤ گی؟'' علی احمد نے مخمور لہجے میں کہا تو وہ سرخ انار ہوگئی۔

''دو ماہ تک تو صبر کرنا ہوگا آپ کو۔'' نیشا نے کہا۔

''دو ماہ...... یعنی ساٹھ دن...... بہت ہوتے ہیں ساٹھ دن۔'' علی احمد نے بے قراری سے کہا۔

''سنا ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''

''صبر جمیل نہ ہو بس۔'' علی احمد نے آہ بھر کر کہا۔

''نہیں ہوگا چلیں اب آپ بستر چھوڑیں اور منہ دھولیں میں ذرا باہر جاتی ہوں بڑی آپا رات ہی گھر پہنچی ہیں اور آتے ہی ان کی نصیحتوں اور مشوروں کا بکس کھل گیا ہے۔ قسم سے کبھی کبھی تو حاجن بی بی لگتی ہیں اپنی دینی سماجی باتوں کی وجہ سے۔'' نیشا نے بیزاری سے بڑی آپا کا ذکر کیا اور علی احمد نے اس کی یہ بیزاری واضح محسوس کی تھی۔

''میں دو بار ملا ہوں بڑی آپا سے مجھے تو وہ بہت سلجھی ہوئی مہذب اور دیندار خاتون معلوم ہوئیں اور خوشی ہوئی تھی ان سے مل کر۔'' علی احمد نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بیزاری سے بولی۔

''وہ ایسی ہی ہیں اپنے رویے اور باتوں سے ہر کسی کو اپنا بنا لیتی ہیں۔ جسے دیکھو بڑی آپا کے گن گا رہا ہے۔ اب آپ بھی ان میں شامل ہو گئے ہیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان سے کچھ سیکھو اور تم ان کی بہن ہو یقیناً تم میں بھی بڑی آپا والی خوبیاں موجود ہوں گی۔ مجھے بااخلاق، احساس کرنے والی اور نرم دل لڑکی ہی اپنی شریک حیات کے روپ میں چاہیے جس کا میں نے خواب دیکھا تھا جیسا میں نے سوچا تھا۔'' علی احمد نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اس کی خشک باتوں سے بور ہونے لگی۔

''اور آپ کو لگتا ہے کہ میں ویسی نہیں ہوں؟'' نیشا کا لہجہ شکایتی اور سوالیہ ہوا۔

''تم تو میرے خوابوں سے زیادہ حسین ہو۔ ظاہری حسن سے مالا مال لڑکی کا دل بھی تو سونا ہوگا ناں اور جس کے ماں باپ، بھائی بہن اتنے ملنسار اور خوش اخلاق ہوں وہ لڑکی خود کتنی باکمال ہوگی۔'' علی احمد نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ہاں مگر آپ سے پیار بہت کرتی ہوں، آپ وہ جوہری ہیں جس نے اس ہیرے کو پہچانا، اس کی قدر جانی، مجھے یقین ہے آپ مجھ سے ہمیشہ خوش رہیں گے۔'' نیشا نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''ان شاء اللہ...... اوکے میں بھی اٹھتا ہوں آفس بھی جانا ہے شام میں بات ہوگی۔'' علی احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

''اللہ حافظ۔'' نیشا نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

......

سجاد الحق اور نعیمہ سجاد کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی سلمٰی، دوسرے نمبر پر بیٹا حماد اور تیسرے نمبر پر ان دونوں سے چھ سال چھوٹی نیشا جو ایم اے انگلش کے دوسرے سال میں تھی۔ سلمٰی کو حماد اور نیشا ''بڑی آپا'' کہا کرتے

تھے۔ ایف اے کے بعد بڑی آپا کی شادی ہوگئی تھی۔ ان کے چار بچے تھے دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔

حماد ایک بینک میں منیجر تھا۔ تایا کی چھوٹی بیٹی حمنہ سے اس کی شادی کو تین سال ہوگئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا تھا دو سال کا۔ نیشا کو اس کی خالہ یاسمین کے بیٹے کی شادی کے موقع پر علی احمد اور اس کی والدہ مسز احمد علی نے دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا۔ شادی کے تمام فنکشن اٹینڈ کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ نیشا کی بات وہیں کرلی گئی۔ سجاد الحق کی اجازت سے ایک ہفتے بعد وہ باقاعدہ رشتہ لے کر گھر آگئے۔ آناً فاناً رشتہ طے ہوگیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد علی کا نکاح نیشا سے ہوگیا اور اب شادی کی تاریخ بھی طے ہونے والی تھی۔ یہ طے تھا کہ دو ماہ بعد کی تاریخ رکھی جائے گی۔ علی احمد بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ بہت وجیہہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ' سلجھا ہوا' مہذب اور بااخلاق اسے اپنی شریک حیات بھی ایسی ہی چاہیے تھی جو نہ صرف دیکھنے میں خوب صورت ہو بلکہ خوب سیرت بھی ہو۔

نیشا چونکہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی اسی لیے سب کی لاڈلی بھی تھی۔ کچھ لاڈ پیار اور ہر فرمائش پوری ہونے کی وجہ سے اسے بھی اپنی خواہش اور فرمائشیں پوری کرانے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ امی ابا اور بڑی آپا اب اسے سمجھایا کرتے تھے اور وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی۔ ایم اے انگلش کررہی تھی مگر اپنی ذات کے علاوہ اسے کسی کا خیال اور احساس نہیں ہوتا تھا۔ حد یہ تھی کہ وہ جانوروں' پرندوں تک کو تنگ کرکے خوش ہوا کرتی تھی۔ علی احمد سے رشتہ طے پاجانے اور نکاح ہوجانے کے بعد سے تو نیشا کے قدم زمین پر ہی نہ ٹک رہے تھے۔ وہ تو ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔ اس نے پہلے ہی اونچے خواب دیکھے تھے اور اس کی اچھی قسمت تھی کہ اسے اس کے خوابوں کی تعبیر بن مانگے مل گئی تھی۔ اتنے امیر و دولت مند لڑکے کے ساتھ نکاح ہونا اور اس کا اس پر فدا ہونا' اس کی حسن پر فریفتہ ہونا نیشا کو غرور میں مبتلا کرگیا تھا۔ وہ تو اب اپنی سہیلیوں کو خاطر میں بھی نہ لاتی تھی۔ دو کینال کے بنگلے میں رہنے کے خیال سے ہی اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل' نوکر چاکر' بڑی بڑی گاڑیاں' قیمتی ملبوسات' مہنگے زیورات...... یہ سب تو نیشا کو ملکۂ عالیہ ہونے کا احساس دلایا کرتا تھا۔ بڑی آپا اور نعیمہ کو اس کے یہ تیور ہر وقت فکر مند رکھتے تھے۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں کہ شادی کے بعد صرف اپنا نہیں اپنے شوہر اور سسرال والوں کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ذمہ داریاں نبھانی ہوتی ہیں مگر وہ نیشا ہی کیا جو سمجھ جاتی' سنبھل جاتی' حسن کا غرور جو تھا سو تھا اس پر دولت مند شخص سے نکاح ہونے پر اسے مزید دو آتشہ کردیا تھا۔

نیشا کی سب سے بری عادت جو نعیمہ اور بڑی آپا کو لگا کرتی تھی وہ تھی چھت پر آئے دانہ دنکا چگنے والے پرندوں کو اڑانا' مجال ہے جو وہ پرندوں کو چین سے پیٹ

بھر کھانے دیتی اور چونچ بھر کر اپنے بچوں کے لیے دانہ ساتھ لے جانے دیتی۔ نعیمہ اور سجاد الحق کی پرانی عادت تھی کہ گھر کی چھت پر بھی منڈیر پر پرندوں کے لیے برتنوں میں دانہ پانی رکھا کرتے تھے اور سالوں سے یہ کام ایک فرض کی طرح نبھا رہے تھے۔ نیشا کو نجانے کب سے یہ بری عادت پڑ گئی تھی کہ جب پرندے چھت پر آ کر بیٹھتے دانہ پانی دیکھ کر اپنی چونچوں میں بھرنے لگتے نیشا اتنی زور سے ہاتھ ہلا کر ''ہش'' کہتی اور پرندے بے چارے خوف سے اڑ جاتے۔

''ہش' ہش ہش۔'' نیشا نے کمرے سے باہر نکلتے ہی صحن کی منڈیر پر رکھے کٹورے سے دانہ چگتے پرندوں کو اڑا دیا۔

''ہاہاہا۔'' اور خوب محظوظ ہو کر ہنسنے لگی۔

بوگن ویلیا کے سایے تلے تخت پر بیٹھی بڑی آپا نے اس کی اس حرکت کو ناگوار اور ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

''نیشا..... ہوش کے ناخن لو یہ کیا حرکت تھی؟ یہ بے زبان پرندے چھت پر آئیں یا منڈیر پر تم انہیں بنا کھائے پیے اڑا دیتی ہو۔'' بڑی آپا نے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بڑا مزا آتا ہے آپا' جب میری ایک ''ہش'' سے سیکڑوں پرندے پھر سے اڑ جاتے ہیں' ڈر جاتے ہیں۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور دور آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اللہ سے ڈرو نیشا..... خالی ہاتھ' خالی پیٹ' بھوکا پیاسا انسان کو لوٹایا جائے یا چرند پرند کو..... یہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے۔ اگر کبھی اللہ تمہیں اپنا رزق دینا چھوڑ دے تو کیا کرو گی' وہ تمہارے سامنے بچھا ہوا دستر خوان سمیٹ لے تو کیا کر سکتی ہو تم؟ وہ جو بنا تمہارے کسی نیک عمل کے' بنا مانگے' بنا کہے تمہارا پیٹ بھر رہا ہے' تمہیں بہترین رزق پہنچا رہا ہے اگر پہنچانا بند کر دے تو کون روک سکتا ہے اسے ایسا کرنے سے۔ یہ چند پرندے جو تمہارے آنگن کی چھت یا منڈیر پہ آس' امید کی پرواز باندھے آ بیٹھتے ہیں تم انہیں دیکھتے ہی بے اختیار ہو جاتی ہو' کم ظرف' بے رحمی پہ اتر آتی ہو' اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتے ہوئے انہیں اڑا دیتی ہو...... کتنی ظالم ہو تم...... معصوم پرندوں کو اڑا رہی ہو۔'' بڑی آپا نے نہایت سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کون اٹھائے گا مجھے' کون بھگائے گا مجھے' کس میں اتنی جرأت ہے؟ میرا اپنا گھر ہے یہ بھی اور وہ بھی جہاں میں بیاہ کر جاؤں گی۔ اتنی خوب صورت ہوں' حسین ہوں' میرا شوہر مرتا ہے میرے حسن پر' کیا کمی ہے مجھ میں جو کوئی مجھے اپنے دستر خوان سے اٹھائے گا یا آنگن سے آؤٹ کرے گا؟'' نیشا نے اپنے حسن کے غرور میں بہت فخر و رعونیت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''تمہارا یہ غرور اور تکبر اٹھائے گا' معصوم پرندوں پر یہ ظلم اٹھائے گا۔ نیشا توبہ کرو' سدھر جاؤ' معافی مانگو اللہ سے' یہ انسان کے حق میں دعا کرتے ہیں' ڈرو ان کی بددعا سے خالی پیٹ اگر دعا اثر کرتی ہے ناں تو معصوموں کی بددعا بھی عرش تک جاتی ہے اور اپنا اثر دکھاتی ہے۔'' بڑی آپا نے اسے سمجھایا۔

''ہونہہ...... یہ پرندے مجھے بددعا دیں گے یہ جو میرے گھر کی چھت پر آ کر کھاتے پیتے ہیں ان کی اوقات ہے مجھے بددعا دینے کی۔'' نشا نے تکبر بھرے لہجے میں کہا تو بڑی آپا کو خوف آنے لگا۔

''اگر تم انہیں ''ہش'' کر کے اڑا سکتی ہو تمہارے لیے یہ کرنا بہت آسان ہے ناں تو اللہ کے لیے بھی سب آسان ہے...... یہ پرندے اڑتے وقت اپنے بھوکے بچوں کو یاد کر کے ایک بار تمہیں ''ہش'' کہہ گئے تو...... مجھے تو یہ سوچ کر خوف آنے لگتا ہے۔ تمہیں پتا نہیں کیوں خوف نہیں آتا۔'' بڑی آپا نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے اسے تاسف زدہ نظروں سے دیکھا۔

''آپا...... آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں

آتیں۔'' نیشا نے اپنے پاؤں ہلاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''افسوس...... پھر تو وقت ہی تمہیں سمجھائے گا اور وقت اور حالات کا سمجھانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں تو تمہارے لیے بس دعا ہی کر سکتی ہوں کہ اللہ تمہیں ہدایت دے۔'' بڑی آپا نے تاسف سے کہا۔

''میں کون سا گمراہ ہوں جو آپ میری ہدایت کی دعا مانگ رہی ہیں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''غرور اور تکبر بھی گمراہی کا راستہ ہے' تم اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو حالانکہ یہ تکبر' یہ بڑائی صرف اللہ کی ذات کو ہی زیبا ہے میری نادان بہن...... یہ حسن' جوانی' دولت کی فراوانی یہ سب اللہ کی عطا ہیں اور آزمائش ہیں۔ تمہارا تو اپنا کچھ ہے ہی نہیں اس میں...... تکبر اور عاجزی کا' کفر اور شکر کا امتحان ہے یہ حسن اور دولت انسان کے لیے...... یاد رکھو تکبر کے راستے پر چلنے والے مٹا دیئے جاتے ہیں' عبرت کا' سبق اور نصیحت کا نشان بنا دیئے جاتے ہیں...... پلٹ آؤ اس رستے سے جہاں صرف پچھتاوے اور خسارے ہیں۔ پلٹ آؤ' ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔'' بڑی آپا نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے کی بیزاری واضح دیکھ رہی تھی۔

''آپ تو پوری مولوی آنٹی ہیں' ملانی ہیں' مدرسے میں جا کر درس دیا کریں۔'' نیشا نے ہنس کر کہا انداز تمسخرانہ تھا۔ بڑی آپا کو افسوس تو ہوا مگر ہمت نہیں ہاریں اسے سمجھانے' قائل کرنے میں لگی رہیں۔

''یہ ہماری بنیادی دینی اور اخلاقی تعلیمات ہیں ان کا تذکرہ کرنے یا ان پر عمل کرنے سے کوئی ملا' مولوی یا ملانی نہیں ہو جایا کرتی کم عقل لڑکی۔'' بڑی آپا نے اپنا سر پکڑ کر کہا' اسے سمجھانا گویا پتھر سے سر پھوڑنا' بھینس کے آگے بین بجانا سا ہی تھا۔

''بڑی آپا...... علی احمد مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ اتنی بڑی بزنس ایمپائر کا اکلوتا وارث ہے اس نظر

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ آنچل کراچی ماہنامہ حجاب کراچی

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کریں گے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 850 روپے

امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

8000 روپے

میڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے

6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242

نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز

81 بیمہ بیرکس' ہاکی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبر: +922-35620771/2

naeyufaq.com
Info@naeyufaq.com

انتخاب مجھ پر آ کر ٹھہری ہے یہ میری خوش نصیبی نہیں ہے تو اور کیا ہے میں نے یہ نصیب کسی سے چھینا تو نہیں ہے۔'' نیشا نے انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ گہرے فلسفیانہ لہجے میں بولیں۔

''انسان کی بدنصیبی بھی اس کی خوش نصیبی میں ہی چھپی ہوتی ہے اگر وہ سمجھے تو......''

''مطلب؟''

''کفر مت کرو' تکبر مت کرو' شکر کرو' صرف شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کا جس نے تمہیں خوش نصیب بنایا...... دوسروں کا احساس کرو' بھلائی کرو' آسانی پیدا کرو دوسروں کے لیے ورنہ اپنے لیے مشکلیں کھڑی کرلوگی۔'' بڑی آپا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ تو مجھے بددعائیں دینے پر تلی ہیں۔'' نیشا نے برا سامنہ بنایا۔

''میں تمہیں بددعا نہیں دے رہی بے وقوف لڑکی بلکہ بددعاؤں سے بچنے کی صورت بتارہی ہوں تمہیں۔'' بڑی آپا نے کہا۔

''نہ بتائیں' میں کوئی بچی نہیں ہوں اپنا صحیح غلط سمجھتی ہوں سب۔'' نیشا نے ناگواریت سے پُر لہجے میں جواب دیا۔

''یہی تو غلط فہمی ہے تمہیں یا تم اسے اپنی خوش فہمی کہہ لو اور اکثر انسان خوش فہمی میں ہی مارا جاتا ہے۔''

''توبہ ہے آپا...... آپ سے تو بات کرنا ہی بیکار ہے۔'' وہ کہہ کر چھت پر چلی گئی' بڑی آپا بھی کپڑوں کی بالٹی لیے اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اس نے دیکھا پرندے چھت پر رکھے دانہ پانی ڈرے ڈرے محتاط انداز میں اپنی چونچوں میں بھرنے کی کوشش کررہے تھے۔ اسے پھر وہی شیطانی حرکت سوجھی۔

''ہش' ہش۔'' نیشا نے آواز کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھائے تو پرندے آسمان پر یہاں وہاں منتشر ہوگئے اور نیشا انہیں یوں بوکھلاہٹ میں اڑتا دیکھ کر خوف سے شور مچاتا پاکر زور زور سے ہنسنے لگی۔ بڑی آپا نے یہ منظر بہت تاسف بھری نظروں سے دیکھا اور نیشا کے لیے اس لمحے ہدایت کی دعا مانگی تھی۔

❁ ❁

علی احمد اچانک ہی وہاں چلا آیا نیشا کو سرپرائز دینے کے لیے۔ اس وقت نیشا چھت پر تھی اور حسب معمول پرندوں کے غول چھت پر اتر رہے تھے۔ دو منٹ کے لیے نیشا نے یہ منظر دیکھا جب سب دانہ کھانے پانی پینے میں مشغول ہوگئے تو اس نے زور زور سے 'ہش ہش' کی اور ان کے قریب جا کر ایڑی زمین پر مار کے انہیں بوکھلا کر اڑنے پر مجبور کردیا اور خود ہنسنے لگی۔

''نیشا......! یہ تم کیا کررہی ہو؟'' علی احمد نے کہا۔

''کچھ نہیں...... کھیل رہی تھی۔'' نیشا چونک کر پلٹی اسے دیکھ کر کچھ بوکھلا کر بولی۔

''معصوم پرندوں کی بھوک پیاس سے کھیلنا انتہائی نامعقول حرکت ہے۔'' علی احمد کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی تھی لہٰذا اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ وہ ایک لمحے کو ٹپٹائی۔

''کیا ہوگیا ہے آپ کو...... یہ ابھی دوبارہ آ کر بیٹھ جائیں گے اور کھانے پینے لگیں گے۔'' نیشا نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''خوش نصیبی ہے اس گھر کی کہ یہاں پرندے اپنا رزق لینے آتے ہیں۔''

''اُفوہ...... اب آپ بھی بڑی آپا کی طرح مجھے لیکچر مت دینا شروع ہوجایئے گا۔ یہ بتائیں اچانک کیسے آنا ہوا؟''

''دل چاہ تم سے ملنے کو سوچا تھا کہ تمہیں اچانک جا کر سرپرائز دوں گا مگر تم نے تو الٹا مجھے ہی سرپرائز کردیا۔'' علی احمد نے اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے معنی خیز جواب دیا تو وہ ایک لمحے کو خجل سی ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلی اور مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔

''میں ہی ان پرندوں کو روزانہ دانہ پانی دیتی ہوں اگر آج تھوڑی سی شرارت' تھوڑی سی مستی کرلی تو کیا

ہوا؟''

''ہوں۔'' وہ بس اتنا ہی بولا اس کا دل نیشا سے ملنے کے خیال سے جتنا خوش تھا اب اتنا ہی بدمزہ ہوگیا تھا۔

بہت دھوم دھام سے نیشا اور علی احمد کی شادی ہوگئی تھی۔ ولیمہ بھی بہت شاندار ہوا تھا۔ دلہن بن کر اس پر الگ ہی روپ آیا تھا۔ علی احمد تو اس کے حسن کا دیوانہ تھا۔ نیشا اپنی اتنی قدر افزائی اور آؤ بھگت پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ علی احمد اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک بات نیشا نے محسوس کی تھی کہ علی کے گھر والے یعنی اس کے ماں باپ امیر ہونے کے باوجود بہت سادہ مزاج تھے۔ امیروں والی اکڑ ان میں نہیں تھی۔ ملازموں تک کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملازم سر چڑھے ہوئے تھے۔ یہ صرف نیشا کا خیال تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سب کو سیدھا کردے گی۔

شادی کا پہلا مہینہ تو دعوتوں میں گزر گیا تھا۔ نیشا تو قیمتی ملبوسات' زیورات پہن کر اچھی جگہوں پر دعوتیں کھا کر اور بھی مغرور ہوگئی تھی۔ بے فکری' عیش و آرام نہ کوئی کام نہ ذمہ داری اس پر پیار کرنے والا شوہر اس کے تو مزے ہی مزے تھے۔ عفت بی گھر کے ملازموں کی سربراہ تھیں۔ وہ سب کے کام کی نگران ہونے کے ساتھ انہیں کام بتانے' کرانے پر مامور تھیں۔ مسز احمد علی بھی اکثر بزنس کے سلسلے میں شوہر کے ساتھ آفس جایا کرتی تھیں مگر اپنے گھر اور اس کی ذمے داریوں سے غافل نہیں تھیں۔

علی احمد کافی روز بعد آفس گیا تھا۔ نیشا دیر تک سوتی رہی تھی۔ اٹھ کر تیار ہونے کے بعد کمرے سے باہر آئی تو دن اچھا خاصہ چڑھ گیا تھا۔ ٹھیک دو بجے میز پر کھانا لگایا جاتا تھا۔ دو بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا اور اسے بہت بھوک لگ رہی تھی ناشتہ جو نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچا کچن میں جاکر کچھ کھایا جائے تاکہ سب کے ساتھ کھانے سے پہلے کچھ آسرا ہوجائے۔ وہ کچن میں آئی تو یہ دیکھ کر اسے شدید جھٹکا لگا کہ گھر کے ملازم' ملازمائیں جو مستقل گھر میں کام کے لیے موجود تھے کچن میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا بھی وہ جو اس کے خیال میں گھر والوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ مرغ پلاؤ' سلاد' رائتہ کباب سب کچھ میز پر موجود تھا۔ شیرف اور عفت بی کے علاوہ دو ملازمائیں تھیں۔ وہ چاروں کھانا کھا رہے تھے اور نیشا کو اچانک کچن میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''بہو بیگم......! خیریت آپ یہاں کچن میں؟ کچھ چاہیے تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔'' عفت بی نے کھانے سے ہاتھ روک کر کھڑے ہوکر کہا۔ باقی سب بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''آپ کو بلا لیتی تو یہ دلکش نظارہ کیسے دیکھ پاتی عفت بی۔''

''میں سمجھی نہیں بہو بیگم؟'' عفت بی نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''مگر میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ آپ لوگ کیسے اپنے مالک کا نمک حرام کرتے ہیں۔ مالکوں نے کھانا کھایا نہیں اور آپ سب ندیدوں کی طرح کھانا ٹھونس رہے ہیں وہ بھی مرغ مسلم واہ بھئی واہ۔'' نیشا نے ان سب کو ایسے گھورتے ہوئے کہا جیسے وہ تھانیدارنی ہو اور وہ سب مجرم ہوں اور چاروں اپنی اپنی جگہ شرمندہ ہوگئے۔

''بہو بیگم......! یہاں ملازم بھی وہی کھاتے ہیں جو مالک کھاتے ہیں۔'' عفت بی نے اسے نرمی سے جواب دیا۔

''اچھا......! واقعی اور مالکوں کے کھانے سے پہلے کھاتے ہیں۔ بھئی واہ ایسا نہ کبھی دیکھا نہ سنا' اس گھر کے ملازمین ہی اتنی قسمت والے ہیں کہ انہیں مالکوں کے شایان شان کھانے پینے کو ملتا ہے۔'' نیشا نے طنزیہ لہجے میں کہا تو عفت بی کو اس کے انداز پر حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ افسوس بھی ہوا۔

''بالکل یہ اس گھر کے ملازموں کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں اتنے خدا ترس اور نیک مالک ملے ہیں۔'' عفت بی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''شرم آنی چاہیے آپ لوگوں کو مالکوں کی برابر کرنے چلے ہیں اب میں آگئی ہوں اب یہ سب نہیں چلے گا۔''

''کیوں نہیں چلے گا؟'' یہ علی احمد کی آواز تھی جو نجانے کب آ گیا تھا اور کچن کے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔

''آپ......!'' نیشا اس کی آواز پر حیران ہو کر مڑی۔

''عفت بی! آپ سب اطمینان سے کھانا کھائیں اور نیشا تم آؤ میرے ساتھ۔'' علی احمد نے عفت بی کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور پھر نیشا کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے حکم دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ملازموں کے سامنے نیشا کو اپنے شوہر کا اس طرح مخاطب کرنا سبکی محسوس ہوا تھا۔ وہ ان سب کو غصے سے دیکھ کر اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی تو علی احمد کو غصے سے کمرے میں ٹہلتے دیکھ کر ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا...... آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟''

''تمہیں نہیں پتا کیا ہوا؟ تم گھر کے ملازموں کے ساتھ اپنی ہی نہیں ہماری عزت بھی دو کوڑی کی کر رہی تھیں۔ دولت مند شخص کی بیوی ہو کر بات اور حرکت تم نے وہی بھوکے ننگے حریص لوگوں والی کی ہے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔'' علی احمد غصیلے لہجے میں بولا۔

''مگر میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'' نیشا کو اس کا غصہ دیکھنے کا موقع پہلی بار ملا تھا وہ سٹپٹا رہی تھی۔

''کیا ضرورت تھی ملازموں کو کھانا کھاتے دیکھ کر ان کے سر پر سوار ہونے کی اور ایسی گھٹیا باتیں کرنے کی، وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ لڑکی ہے ہمارا انتخاب...... یہ ہے معیار ہمارا اور ہماری سوچ اتنی کم ظرف لڑکی کو اس گھر کی بہو بنا لائے۔''

''وہ بھلا ایسی باتیں کیوں سوچیں گے؟'' نیشا کی سمجھ سے باہر تھا کہ آخر علی احمد اتنا غصہ کس بات پر کر رہے ہیں؟

''کیونکہ ہمارے گھر کا اصول ہے کہ پہلے گھر کے ملازم کھانا کھاتے ہیں بعد میں گھر والوں کو کھانا سرو کیا جاتا ہے جو ہمارے لیے پکتا ہے، تقریباً وہی ہمارے ملازم کھاتے ہیں۔'' علی احمد نے اس پر انکشاف کرتے ہوئے حیرت کے سمندر میں ڈبو دیا۔

''یہ کیسا اصول ہے؟ ملازموں کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے آپ نے۔'' نیشا نے ناگوار لہجے میں کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''یہ ملازم ہمارے خدمت کار ہیں اگر ہم ان کا خیال نہیں رکھیں گے تو یہ کبھی بھی دل سے، خلوص سے ہماری خدمت نہیں کریں گے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ وہ سب نوکر ہیں اور اپنے کام کا معاوضہ لیتے ہیں آپ سے...... وہ کوئی خدمت نہیں کرتے...... جس خدمت کا معاوضہ لیا جائے وہ خدمت نہیں ملازمت ہوتی ہے۔ مسٹر علی۔'' نیشا نے استہزائیہ کہا۔

''میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آئندہ اس گھر کے اصولوں پر اعتراض مت کرنا کیونکہ یہ اصول ہمارے بڑوں کے بنائے ہوئے ہیں انہیں کی برکت سے آج ہم اتنے خوش حال اور مال دار ہیں سمجھیں۔'' علی احمد نے فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے بات ہی ختم کر دی۔

''عجیب الٹے دماغ کے لوگ ہیں یہ تو۔'' نیشا نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دل میں سوچا تھا۔

شام کو ٹیرس پر آئی تو وہاں ایک کونے میں دو برتن رکھے تھے۔ ایک پیالے میں صاف پانی تھا اور ایک پلیٹ میں باجرہ اور دال مکس رکھی تھی اور چڑیاں، کبوتر، کوئے کھانے پینے میں مگن تھے۔ نیشا کو دوپہر والی

باتوں کا غصہ تھا۔علی احمد نے اسے ڈانٹا تھا سو وہ غصے اور پرانی عادت سے مجبور ہوکر آگے بڑھی اور پرندوں کو اڑا دیا۔

''ہش۔'' نیشا نے منہ سے آواز نکالی اور دایاں ہاتھ فضا میں اٹھایا' پرندے بوکھلا کر بہت تیزی سے دانہ پانی چھوڑ کر اڑ گئے تھے۔نیشا ہنس دی۔علی احمد کی شعلہ بار آنکھیں اس کا تعاقب کرتی وہاں آ پہنچی تھیں۔

''اس گھر میں آنے والے پرندوں کو دانہ پانی تم نہیں ڈالتیں لہٰذا تمہیں انہیں اڑانے یا ان کے ساتھ شرارت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔'' علی احمد اس کے عقب میں کھڑا سخت لہجے میں بولا۔

''وہ میں......'' وہ بری طرح سٹپٹائی۔

''میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلیں......تم نے تو شادی کے ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی اپنا رنگ دکھا دیا۔ اصلی رنگ' یقین جانو مجھے یہ رنگ قطعی پسند نہیں آیا۔تم اپنے گھر یعنی اپنے میکے جاسکتی ہو۔'' علی احمد نے نہایت سنجیدگی سے اسے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کے تو پیروں تلے سے زمین ہی سرک گئی تھی۔

''مگر علی......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''ہش۔'' علی نے انگلی اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔اس لمحے اس کے کانوں میں اپنی ''ہش ہش'' کی آواز گونجتی محسوس ہوئی تھی جب اس کے اختیار میں تھا اور وہ انہیں ہمیشہ اڑا دیا کرتی تھی اپنے آنگن سے خالی پیٹ' مایوس لوٹا دیا کرتی تھی۔

آج علی احمد اس کے سامنے بااختیار بنا کھڑا تھا اس کے سامنے اور اسے ایک منٹ کے لیے بڑی آپا کی باتیں یاد آئی تھیں۔

''میں جانتی ہوں کہ میں بہت بری ہوں لیکن دل سے بہت پیار کرتی ہوں آپ سے' اس پیار کی خاطر مجھے ایک موقع اور دے دیں پلیز۔'' نیشا نے اس کا بازو پکڑ کر بڑے منت بھرے اور دلربا والے انداز میں کہا۔

''تم مجھ سے نہیں میری دولت اور آسائش سے پیار

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ نئے اُفق

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

6000 روپے

میڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے

5000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر

0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر

0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242

نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز

81 نیچیر بیرکس، ہاکی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبرز: +922-35620771/2

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

کرتی ہو جو تمہیں مجھ سے شادی کر کے میسر آئی ہے۔"
علی احمد نے سپاٹ لہجے میں کہا وہ دانستہ نیشا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا کیونکہ اس کا قیامت خیز حسن اسے موم کرنے لگتا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگت والی حوروں سے حسن کی مالک حسینہ پتھر میں بھی شگاف ڈال سکتی تھی۔ وہ تو پھر علی احمد تھا جو پہلے ہی اس کے حسن میں گرفتار اور پیار میں مبتلا تھا۔

"اتنی بدگمانی اف...... اچھا ٹھیک ہے میں آپ سے پیار نہیں کرتی لیکن آپ تو مجھ سے پیار کرتے ہیں ناں...... آپ کو اس پیار کی قسم مجھے معاف کر دیں اور ایک موقع اور دے دیں اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی...... آپ یہ بھی تو دیکھیں ناں کہ میرے لیے یہ سب نیا ہے مجھے کچھ وقت تو لگے گا ناں ایڈجسٹ ہونے میں۔" نیشا نے بہت نرم ملائم' میٹھے' چاہت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایڈجسٹ ہونے اور ادادور میں بہت فرق ہوتا ہے نیشا بیگم...... ماحول انسان کی اخلاقیات ختم نہیں کرتا بلکہ حسن اخلاق سے اجنبی ماحول' گھر اور لوگوں کے درمیان بھی چند دنوں میں اپنی جگہ بنالیتا ہے مگر تم نے تو حد ہی کر دی' حیرت ہے مجھے تمہارے ماں باپ بھائی بہن تو بہت بااخلاق ہمدرد اور نیک لوگ ہیں...... تم کس پر چلی گئیں؟" نیشا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ یہ گھر اور اس طرح کی آرائش تو اس کا خواب تھا جو اب ادھورا ہونے جارہا تھا۔

"اوکے' ڈیٹس از یوئیر لاسٹ چانس۔" علی احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تھینک یو' تھینک یو سو مچ۔" وہ خوش ہو کر اس کے سینے سے آ لگی۔ علی احمد نے بھی سب بھلا اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔

...... ✿ ...... ✿ ......

"نیشا بیٹی...... آج رات دعوت کا اہتمام کر لینا اور ہاں اس دعوت میں قریبی رشتے دار اور کچھ خاص دوست احباب مدعو ہیں' پکوان کی لسٹ میں نے بنادی ہے اور کچھ خانساماں سے کہا ہے وہ تمہاری ہیلپ کر دیں گے۔ دلہن پہلی بار سسرال میں کھانا پکاتی ہے تو ہمارے ہاں رسم ہے کہ قریبی رشتے داروں کو کھانے پر بلایا جاتا ہے۔" مسز احمد علی نے صبح ناشتے کی میز پر نیشا کو مخاطب کر کے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"اچھا...... ہمارے ہاں تو دلہن کھیر پکاتی ہے وہی سب رشتے داروں کے گھر بھیجی جاتی ہے۔"

"ہر کسی کا اپنا رواج ہے' بہرحال تم سب کچھ اچھے سے تیار کر لینا اور بعد میں خود بھی تیار ہو جانا رات آٹھ بجے کا وقت دیا ہے میں نے سب کو۔ کل سنڈے ہے تو ڈنر آرام سے کریں گے۔" مسز احمد علی نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی' ڈنر کا اہتمام کرنے کے خیال سے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ گھر میں تو وہ کچن سے کوسوں دور بھاگتی تھی اور یہ سسرال کا معاملہ تھا جو عجیب رسم و رواج کو اپنائے ہوئے تھے اور بہو سے دعوت کے پکوان پکانے کا کہہ رہے تھے۔ نیشا نے سلگ کر سوچا۔

"خانساماں تو ہوگا ناں پھر کیا مسئلہ ہے؟ اور عفت بی ہیں ایک دعوت ہی تو ہے کون سا روز روز میں نے کچن میں کام کرنا ہے۔ آج جیسے تیسے مینج کر ہی لوں گی علی کو بھی تو خوش کرنا ہے۔" نیشا نے چائے پیتے ہوئی علی کو دیکھ کر دل میں سوچا۔

خانساماں کو جو ڈشز مسز احمد علی نے پکانے کے لیے کہا تھا وہ اس نے پکالی تھیں۔ اب نیشا اس سے دیگر پکوان پکانے کے لیے حکم دے چکی تھی۔ خود اس نے کھیر پکنے رکھی تھی اور دوسرے چولہے پر چکن کڑھائی تھی۔ انٹرنیٹ سے ریسپی دیکھ کر وہ کھانا پکا رہی تھی۔

"دلہن بیگم...... میرے بیٹے کے پیٹ میں بہت درد ہے مجھے چھٹی دے دیں تاکہ میں بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاسکوں۔" خانساماں نے ملتجی لہجے میں نیشا

سے درخواست کی۔

''اوہو بعد میں لے جانا پہلے کام ختم کرو۔'' نیشا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''جی...... بڑی بیگم صاحبہ نے جو کام کہا تھا وہ تو میں نے کردیا ہے آپ کے حصے کا بھی پکانا ہے۔'' خانساماں بولا۔

''رات کو دعوت ہے اور تمہیں چھٹی چاہیے۔ بڑی بیگم صاحبہ کے کہے کی اہمیت ہے میرے کہے کی کوئی اہمیت نہیں ہے تمہاری نظروں میں۔'' نیشا نے غصیلے تیز لہجے میں کہا تو وہ کمزوری آواز میں بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے دلہن بیگم...... میں تو اپنے بچے کی تکلیف کی وجہ سے کہہ رہا ہوں میں ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔''

''دلہن بیگم...... خانساماں کو جانے دیں اس کا چھ سالہ بچہ واقعی درد سے تڑپ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے اپنڈیکس کا درد اٹھا ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔'' عفت بی نے کچن میں آکر کہا۔

''لیجیے' اب آپ اس کی وکالت کرنے چلی آئی ہیں۔ کچھ کھالیا ہوگا الٹا سیدھا پیٹ کے درد کی دوا دے دیں ٹھیک ہوجائے گا۔'' نیشا نے انہیں تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی ماں نے سب کرکے دیکھ لیا ہے فرق نہیں پڑ رہا' اسی لیے تو یہ بے چارہ آپ کی منتیں کررہا ہے۔'' عفت بی نے جواب دیا۔

''اچھا...... میں اسے جانے دوں تو یہ سارا کام کون کرے گا؟''

''آپ...... کیونکہ بڑی بیگم صاحبہ نے آپ سے کہا ہے کہ یہ دعوت آپ کے ہاتھ کے بنے کھانوں پر مشتمل ہے۔ نئی دلہن کے ہاتھ کا سلیقہ' ذائقہ اور سگھڑاپا ہی تو دیکھا جائے گا آج۔'' عفت بی نے فوراً جواب دیا۔

''مجھے یہ سب پکانا نہیں آتا...... اپنے گھر میں' میں ایک انڈہ نہیں فرائی کرتی تھی اور یہاں مجھے اتنی بڑی دعوت کے پکوان پکانے کا آرڈر جاری کردیا ہے۔ تم تیزی سے ہاتھ چلاؤ ممی جی کے آنے سے پہلے کام ختم کرو۔'' نیشا نے تیزی سے کہتے ہوئے خانساماں کو کہا وہ پریشان سا کام کرنے پر مجبور ہوگیا۔

''دلہن بیگم...... خانساماں کے بچے کی حالت بگڑ گئی ہے۔ وہ بے ہوش ہوگیا ہے اسے جانے دیں۔'' ملازمہ بوکھلائی ہوئی آئی اور کہا۔

''یا اللہ خیر......'' خانساماں سب کام چھوڑ کر اپنے کوارٹر کی طرف بھاگا۔

''ڈرائیور گاڑی نکالو خانساماں کے بچے کو فوراً اسپتال پہنچاؤ۔'' عفت بی ڈرائیور کو آواز دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''ارے کیسے سب ایک ہوئے ہیں۔ سب کے سب چل دیے میں اکیلی کیسے کروں گی اتنا کام؟'' نیشا نے کچن میں پھیلے برتنوں اور دیگر لوازمات کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا اور ناچار کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

خانساماں کے بچے کا اپنڈکس پھٹ گیا تھا جسم میں زہر پھیلنے کا اندیشہ تھا حالت خطرے میں تھی ڈرائیور نے اسپتال سے عفت بی کو فون کرکے مطلع کردیا تھا۔ عفت بی نے نیشا کو بتایا تو وہ کچھ چوری بن گئی۔

''ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ بچے کو بروقت لے آتے تو اپنڈکس نہ پھٹتا اور نہ ہی نوبت یہاں تک آتی۔ اب تو دعا کریں دلہن بیگم...... کیونکہ آج کی دعوت کا تو کچھ پتا نہیں کہ ہوگی یا نہیں لیکن آپ کی تواضع ضرور ہوگی اور بہت اچھی طرح سے ہوگی۔'' عفت بی نے بڑے ذومعنی لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ ادھ مری سی ہوگئی تھی ان کی باتیں سن کر لرزتی آواز میں پوچھا۔

''صاحب لوگ آجائیں گے تو مطلب بھی سمجھا دیں گے آپ کو...... اب پکوان کی فکر چھوڑیں اور اپنی

خیر منایئے۔" عفت بی کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔
"ہونہہ ایسے کہہ گئی ہیں جیسے میں نے ہی تو مارا ہے اسے۔ خیال خود نہیں رکھتے اور الزام میرے سر رکھتے ہیں۔" وہ دل میں اٹھتے خوف کو دباتی بولی تھی۔

شام کی دعوت موخر کردی گئی تھی۔ نیشا کے ساس سسر کو بھی نیشا کی بے حسی اور ہٹ دھرمی کا علم ہوگیا تھا اور انہوں نے علی احمد کو بھی بتادیا تھا کہ کیسے نیشا کی بے حسی کی وجہ سے خانساماں کا بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا۔ علی احمد یہ سنتے ہی غصے میں سیدھا گھر پہنچا عفت بی سے صورت حال معلوم کی اور نیشا کے سر پر جا پہنچا۔
"تو تم نے ایک بار پھر سے اپنی بے حسی اور اپنی اوقات دکھا دی ناں نیشا بیگم..... جو کام ماں نے تمہارے ذمے لگایا تھا تم وہ خانساماں کے سر تھوپ دیا اور اس غریب کو پریشانی میں مبتلا کردیا۔ اس کا بچہ روتا تڑپتا رہا مگر تمہیں احساس نہ ہوا یاد رکھو اگر وہ بچہ نہ بچا تو تمہارے پاس بھی کچھ نہیں بچے گا۔" علی احمد نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔
"آپ ایک ملازم کے بچے کے لیے اپنی محبت کو اپنی بیوی کو آنکھیں دکھا رہے ہیں غصہ کررہے ہیں مجھ پر۔"
"محبت تم نے ان دو ماہ میں اپنے رویے اور عمل سے ثابت کردیا ہے کہ تم محبت ڈیزرو ہی نہیں کرتیں میرا انتخاب انتہائی غلط تھا۔ تم اس قابل نہیں تھیں کہ اس گھر کی بہو بنائی جاتیں اور نہ ہی میری شریک حیات بننے کے لائق تھیں..... بڑی بھول ہوگئی مجھ سے کہ تمہارے اس حسین چہرے کے پیچھے چھپے سنگین رویے فکر و خیال کو نہیں دیکھ پایا۔" علی احمد نے اس کو گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔
آپ میری انسلٹ کررہے ہیں۔" نیشا نے شکوہ کیا۔
نہیں نیشا..... انسلٹ تو تم نے کی میری محبت کی میری پسند اور میرے بھروسے کی..... اب دعا کرو کہ وہ بچہ بچ جائے صحت یاب ہوجائے ورنہ....."
"ورنہ کیا؟" نیشا نے پریشان ہوکر پوچھا۔
"واپسی کی تیاری کرلو کیونکہ میں تمہیں مزید موقع دینے کا رسک نہیں لوں گا اب۔ تم نے ماں کی حکم عدولی کی ان کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ اس گھر کے اصول توڑے..... ملازموں کے ساتھ بدتمیزی اور بدسلوکی کی۔ تم تو خود کو حاکم سمجھنے لگیں۔ ملازموں کو ان کی اوقات یاد دلانے سے پہلے اپنی اوقات اور حیثیت تو دیکھ لی ہوتی۔ جس شوہر کی وجہ سے تمہارے رتبے اور معیار و وقار میں شاندار اضافہ ہوا تمہیں عزت اور پذیرائی ملی تم نے اسی کے گھر میں فساد ڈالنا شروع کردیا۔ اسے ہی شرمسار کردیا اس کی اپنی نظروں میں۔ صاف بات ہے میں تمہیں موقع دیتے دیتے تنگ آچکا ہوں اب اور نہیں..... ہر موقع پر تم پہلے سے زیادہ شرمسار کروگی اس کا اندازہ بخوبی ہوگیا ہے مجھے۔" علی احمد نے اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن علی..... میری بات تو سنیں۔"
"اب تمہاری کوئی بات نہیں سنی جائے گی اور میں تم سے کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اپنا سامان پیک کرو۔ میکے کا دیا ہوا سب سامان..... ڈرائیور تمہیں تمہارے میکے چھوڑ آئے گا اور میں تمہیں ابھی اور اسی وقت چھوڑ رہا ہوں۔" علی احمد نے نہایت سخت اور فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔
"لیکن علی....." اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"ہش....." علی احمد نے اسے ہش کہہ کر خاموش کرادیا اور انگلی کے اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ تو اسے پرندوں کو اپنے آنگن کی چھت اور منڈیر سے اڑانا یاد آگیا۔
"تو کیا اس کے اڑنے کا وقت بھی آگیا ہے؟" دل میں خیال آیا تھا۔

''اگر خدانخواستہ وہ بچہ مرگیا تو تم کیسے بچو گی اس کے ماں باپ کی آہوں اور بد دعاؤں سے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے اور اپنے ضمیر کی لعنت ملامت سے؟'' نیشا روتے ہوئے سامان پیک کررہی تھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے علی احمد کی آواز اس کی سماعت کو زخمی کرگئی تھی۔

ڈرائیور اسے میکے چھوڑنے آیا تو ایک خاکی لفافہ حماد بھائی کو دے گیا۔ انہوں نے کھول کر دیکھا اس میں نیشا کا طلاق نامہ تھا اور ساتھ میں ایک تفصیلی خط بھی تھا جس میں علی احمد نے نیشا کو طلاق دینے کی وجہ نہیں کئی وجوہات تحریر کی تھیں۔

''غرور۔''

''تکبر۔''

''بے حسی۔''

''خود پسندی۔''

''نافرمانی۔''

''غلط بیانی۔''

اس کے نمایاں جرم تھے اور خانساماں کے بچے کے ساتھ ہونے والی زیادتی سب پہ بھاری پڑی تھی۔ حماد بھائی نے خط سب گھر والوں کے سامنے پڑھ کر سنایا تھا۔ سب ہی بہت دکھ اور تاسف سے نیشا کو دیکھ رہے تھے۔ جو بت بنی منڈیر پر بیٹھے پرندوں کو تک رہی تھی۔ آج علی احمد نے اسے اپنی زندگی سے ''ہش'' کہہ کر اڑا دیا تھا۔

''ہش، ہش۔'' نیشا نے ایک دم سے اٹھ کر منڈیروں پہ بیٹھے پرندے اڑا دیئے اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس بار اس کی ہنسی میں فخر، خوشی اور مزا نہیں تھا بلکہ بے بسی، دکھ اور خالی پن کا احساس تھا۔ آج اسے سمجھ میں آ گئی تھی کہ بڑی آپا اسے کتنا صحیح سمجھایا کرتی تھیں مگر وہ اپنی خود پسندی اور غرور میں ان کی باتوں کو ہنسی اور طنز میں اڑا دیا کرتی تھی۔ علی احمد نے اسے بھی اس کے خالمانہ انداز میں ''ہش'' کہہ کر اپنے گھر سے بھگا دیا تھا۔ اپنے گھر کی دہلیز پر دوبارہ آنے کے حق سے محروم کردیا تھا۔

اسے پرندوں کی بددعا لگ گئی تھی جب ہی تو علی احمد کے گھر سے اس کا دانہ پانی اٹھ گیا تھا اور اس کے میکے گھر میں پرندے آج بھی دانہ چگ رہے تھے، پانی پی رہے تھے۔ وہ بھگاتی تھی اور وہ لوٹ لوٹ کر آتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس نے ان کے لیے وہاں رزق رکھا ہے وہ انہیں کھانے کی سہولت بھی مہیا کرے گا مگر نیشا تو واپس لوٹ کر علی کے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند کردیئے گئے تھے اور یہ سب اس کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ اب ساری زندگی اسے اپنے ضمیر کی عدالت میں پیشیاں بھگتنا تھیں۔ اس کے پاس سوائے آنسوؤں اور پچھتاوؤں کے کچھ نہیں بچا تھا۔ بڑی آپا کی سمجھائی اور کہی ہوئی ہر بات سچ ثابت ہوگئی تھی۔

''نیشا۔۔۔'' بڑی آپا نے اسے پکارا۔

''آپا۔۔۔ مجھے پرندوں کی بددعا لگ گئی، میں ان کو ''ہش ہش'' کرتی تھی ناں، دیکھیں آج مجھے بھی میرے شوہر نے اپنی زندگی اور گھر سے ''ہش'' کہہ کر اڑا دیا ہے مجھے ان پرندوں کی بددعا لگ گئی ہے آپا، آپ ٹھیک کہتی تھیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہش، ہش۔'' نیشا انہیں دیکھ کر ہذیانی انداز میں بولتے ہوئے ہنسنے لگی اور پھر پرندوں کو دیکھ کر ''ہش ہش'' کرتی، کبھی روتی، کبھی ہنستی تھی۔ اس کو دیکھ کر سب ہی کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ سب کی لاڈلی تھی ٹوٹ کر بکھری تھی تو چوٹ بھی سب ہی کو لگی تھی۔ درد بھی سب ہی محسوس کررہے تھے مگر اب پچھتاوے کے سوا نیشا کے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔۔۔ ایک ''ہش'' نے اسے عمر بھر کے لیے ناخوش کردیا تھا۔

www.naeyufaq.com

دارِ کوکسر کا ملا ٹھا

نادیہ احمد

(گزشتہ قسط کا خلاصہ)

عائشہ اپنے چھوٹے بھائی لومی اور بیوہ ماں فضیلت کے ساتھ رہتی ہے۔ فضیلت کو کینسر ہوتا ہے، گھر میں کمانے والا کوئی نہیں ہوتا اور آمدنی محدود ہونے کے سبب عائشہ کو ہی مجبوراً ملازمت کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ وہ ایک خوددار لڑکی ہوتی ہے۔ شرجیل اسے اپنے آفس میں نوکری دیتا ہے لیکن عائشہ کو یہ نوکری دینے کے پیچھے اس کے مکروہ عزائم ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس کے اپنی سیکرٹری یمنیٰ کے علاوہ بہت سی لڑکیوں سے تعلقات رہتے ہیں جن کے متعلق اس کی بیوی ساسعیہ یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کو کچھ معلوم نہیں ہیں سوائے اذان کے جو اس کے ماموں کا بیٹا اور اس کا دوست بھی ہوتا ہے۔ اذان اپنے ماضی کی وجہ سے ایک ابنارمل اور بےسکون زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ بچپن میں برسوں اپنے گھریلو ملازم کی درندگی کا شکار رہنے اور پھر صابر کے ہاتھوں اپنے والد کی موت نے اذان کو ذہنی مریض بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی والدہ سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں سے دور رہتا ہے۔ اس کے قریب ترین فقط ہاجرہ بیگم ہی ہوتی ہیں جن سے وہ اپنے دل کی بات کہتا ہے اور ان ہی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر راہینہ سے منگنی بھی کر لیتا ہے البتہ دل سے اب تک اس بات پہ راضی نہیں ہوتا۔ اذان سے عائشہ کا سامنا دو بار شرجیل کی بدولت ہوتا ہے اور اذان عائشہ کو بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک سمجھتا ہے جن سے شرجیل کے تعلقات استوار رہتے ہیں...... یہی وجہ ہے کہ اذان کی نگاہوں اور رویے میں عائشہ کے لیے حد درجہ ناپسندیدگی ہوتی ہے۔ دوسری طرف عائشہ اپنی ماں اور بھائی کی وجہ سے شدید پریشان ہوتی ہے اور شرجیل کے انداز اسے ہراساں کرتے رہتے ہیں۔ آشیانہ میں فضیلہ اور علی کی شادی جلد متوقع ہوتی ہے جس کے ساتھ راہینہ اور اذان کی منگنی بھی کرنے کی تیاری ہو رہی ہوتی ہے البتہ اریبہ سنبل سے کہتی ہے کہ پورے خاندان کی موجودگی میں منگنی کی رسم کی جگہ اذان کے نکاح کا اعلان کر دیں گے اس طرح وہ ایک بار پھر دباؤ میں آ جائے گا اور انکار نہیں کر پائے گا۔

(اب آگے پڑھیے)

مرے روگ کا نہ ملال کر، مرے چارہ گر
میں بڑا ہوا اسے پال کر، مرے چارہ گر
کبھی درد چن مرے جسم سے، کسی اِسم سے
مرا انگ انگ بحال کر، مرے چارہ گر
مجھے سی دے سوزنِ درد، رشتۂ درد سے
مجھے ضبطِ غم سے بحال کر، مرے چارہ گر
یہ بدن کے عارضی گھاؤ ہیں، انہیں چھوڑ دے
مرے زخمِ دل کا خیال کر، مرے چارہ گر
میں جہانِ درد میں کھو گیا، تجھے کیا ملا
مجھے امتحان میں ڈال کر، مرے چارہ گر

اس کی آنکھوں میں بےیقینی، خوف اور وحشت تھی۔ مان ٹوٹنے کی کرچیاں تھیں جن سے زخمی ہو کر آنکھوں سے آنسو نہیں لہو بہنے لگا تھا۔ کوئی کیسے اتنی آسانی سے کسی کی جان لے سکتا تھا۔ یہ سب اگر اس نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین ہی نہیں کرتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے صابر نے اس معصوم کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ اس کی دبی دبی سسکیاں اور ہاتھ پاؤں مار کر اپنا وجود اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش میں میز کو دھکا لگا تھا جس سے اس پہ رکھا ہوا سامان نیچے گر گیا تھا اور یہی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی تھی اور دو دن سے بخار کی وجہ سے نڈھال تھی ورنہ تو آج

ماں کے ساتھ ہر صورت عرس پہ جاتی جو اس مزار پہ ہر سال ہوتا تھا جہاں اس کی نانی کا گاؤں تھا۔

مزار کیا ہوتا ہے اور عرس کس مقصد کے لیے ہوتا ہے اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو بس وہ میلہ دیکھنے کا شوق تھا جو ہر سال وہاں لگتا تھا۔ جس میں رنگا رنگ جھنڈیاں، پنگھوڑے، قسم قسم کے پکوان اور مٹھائیاں ہوا کرتی تھیں، جنہیں دیکھ کر ہی اس کے منہ میں پانی آجاتا تھا اور پھر وہ مداریوں کے تماشے جو وہ بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ کہاں جانتی تھی کہ زندگی خود بھی تماشا ہے اگر بخار نہ ہوتا تو ماں لازمی اسے بھی اپنے ساتھ لے جاتی کیونکہ اس کا جانا ضروری تھا۔ اس کی ماں کا وہاں جانا کیوں ضروری تھا وہ اس کم سنی میں کبھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ وہاں جا کر منت کے دیئے جلایا کرتی تھی اور وہ ہمیشہ ماں سے یہ سوال کرتی کہ ”منت کیا ہوتی ہے؟“

ماں کہتی تھی کہ کسی کی خواہش ادھوری نہ رہ جائے اس کے لیے منت مانی جاتی ہے۔ یہ لوگ جو یہاں اس پل دیئے جلانے آئے ہیں چاہتے ہیں کہ ان کی خواہش اور آرزو ہمیشہ حسرت نہ بنی رہے۔ اسے خواہش، آرزو اور حسرت جیسے بڑے لفظوں کی بھی سمجھ نہیں تھی۔ ماں کی باتیں اس کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئیں جب تک اس نے خود اپنی خواہشوں کو حسرت بنتے نہ دیکھ لیا اور پھر زندگی ہر دن انہی حسرتوں کے ڈھیر پہ آنسو بہاتے گزری مگر اس نے وہاں آکر ایک بھی دیا نہیں جلایا تھا۔ ہر شام اس احاطے میں بنے مٹی کے میلے چبوترے پہ قطار در قطار رکھے دیئے وہاں جمع لوگوں کی حسرتوں پہ بین کرتے اور وہ اسی مزار کے ایک کونے میں بیٹھی ان دیئوں کی جلتی بجھتی لو میں ان کے پُرامید چہروں اور خالی آنکھوں کو تکتی رہتی۔ مگر وہ خود کبھی اس چبوترے کے پاس نہیں گئی تھی۔

جب دل میں ہی اندھیرا تو ہو ایک ننھے سے دیئے کی روشنی سے کون سی امید کی کرن ملتی ہے۔ خواہشوں کو تو تیاگ دیا تھا پھر بھلا کس امید کے سہارے ان کی تکمیل کی آرزو کرتی پھر وہ تو کبھی کچھ نہیں کر پائی تھی۔ ہر بار ہی تو ناکام ہو جاتی تھی۔ اس دن صابر کے ہاتھوں اپنی پیاری سہیلی کی جان اور عزت بچا پائی تھی۔ اس وقت وہ بہت خوف زدہ تھی اور کسی کو کچھ بھی نہیں بتا پائی مگر یہ سچ اس نے ساری زندگی ماں سے بھی چھپایا۔ شاید وہ اس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی تھی یا پھر اسے ماں کو دکھ دینا اچھا نہیں لگتا تھا سب سے بڑھ کر باپ کو ملنے والی سزا کا خوف تھا جو وہ یہ سچائی زبان پہ نہیں لائی تھی لیکن یہ سچ تو آج بھی کسی کو نہیں بتا سکتی تھی پھر بھی اسے پتا چل گیا تھا۔ وہ راز جو وہ اپنے ساتھ قبر تک لے جانا چاہتی تھی اس وقت کھلا جب اس کے دل نے پہلی بار یہ دعا کی تھی کہ اس کی یہ خواہش حسرت نہ بنے۔ من کی مراد پوری ہو جائے اور کوئی کیا جانے من کی مرادیں کتنا تڑپاتی ہیں۔ پوری ہو جائیں تب بھی، پوری نہ ہو پائیں تب بھی...... خلش ہر حال میں جان کو ہلکان کرتی رہتی ہے۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز پہ کانوں میں آویزے پہنتا اس کا ہاتھ پل بھر کو تھما اور اس نے مڑ کر بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔ دھیان اس وقت اس کی آمد پہ اٹکا ہوا تھا۔ دل دل میں مین گیٹ سے لے کر اپنے کمرے تک کا فاصلہ ناپتے' اس کے قدموں کو گن کر اپنے کانوں میں ائیر رنگز پہننے لگی۔ وہ اب بھی نہیں آیا تھا۔ شاید وہ لاؤنج میں ہی ٹھہر گیا ہو یہ سوچ کر اس نے جلدی جلدی بالوں میں برش کیا اور خود پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی جب اچانک کمرے میں آتی ملازمہ سے ٹکراتے ہوئے بچی۔

''اذان آ گیا کیا؟'' اپنی بے چینی چھپائے بغیر اس نے عجلت میں سوال کیا۔ وہ باقی سب گھر والوں کے ساتھ آشیانہ صرف اسی کی وجہ سے نہیں گئی تھی کیونکہ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اذان بھی ابھی نہیں جا رہا۔ اپنی طبیعت کا بہانہ کر کے وہ گھر پہ ہی رک گئی تھی اور اب اس کا ارادہ وہاں اذان کے ساتھ جانے کا تھا جس کے لیے اس نے پہلے ہی سنبل کو کہہ دیا تھا۔ سنبل نے اذان کو فون کر کے راہینہ کو ساتھ لانے کی تاکید کی تھی اور وہ اب صبح سے اس کے ساتھ تین چار گھنٹے کا سفر کرنے کے موڈ میں اپنی بھرپور تیاری کر رہی تھی اور بے تحاشا خوش بھی تھی۔

''جی ان کا ڈرائیور آیا ہے کہہ رہا ہے اذان صاحب نے آپ کے لیے گاڑی بھجوائی ہے۔'' ملازمہ نے جواب دے کر راہینہ کے دل کا سکون اور لبوں کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔

''واٹ...... اذان نے ڈرائیور کو بھیجا ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''جی وہ کہہ رہا ہے کہ وہ آج بھی شہر ہی میں رکیں گے۔'' راہینہ کے چہرے پہ غصے کے تاثرات دیکھ کر ملازمہ نے ڈرتے ہوئے مزید بتایا۔ اسے جواب دینے کی بجائے راہینہ نے اپنا سیل فون نکالا اور اذان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''تم نے ڈرائیور کو کیوں بھیجا؟'' دوسری طرف جیسے ہی کال اٹینڈ ہوئی اس نے چیخ کر سوال کیا۔

''کیونکہ تمہیں آشیانہ پہنچنا تھا۔'' اذان کے لہجے میں تحمل تھا۔

''ہاں مگر تمہارے ساتھ......'' وہ بے ساختہ بولی۔

''لیکن میں تو ابھی نہیں جا سکتا۔ ایک دو دن مزید لگ جائیں گے یہاں، اس لیے بی بی جان کو بتا چکا ہوں۔'' وہ ہنوز نارمل رہا جیسے ساتھ ساتھ کوئی کام کر رہا ہو اور راہینہ کا اشتعال مزید بڑھ گیا تھا۔

''تو یہ بات تم مجھ سے بھی تو کہہ سکتے تھے۔'' اس کی ساری پلاننگ ہی غارت ہو گئی تھی۔ وہ صبح سے تیار ہو رہی تھی۔ ذہن میں وہ باتیں دوہرا رہی تھی جو اسے

اذان سے کرنی تھیں اور ان لمحوں کو سوچ کر محظوظ ہورہی تھی جو اسے اذان کے ساتھ تنہا گزارنے تھے لیکن اذان نے عین موقع پہ سب پر پانی پھیر دیا تھا۔

"تم نے بھی تو مجھ سے ڈائریکٹ نہیں کہا تھا...... یہ جانے بغیر کہ میں تمہارے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں یا نہیں...... تم نے ممی کے ذریعے مجھے ٹریپ کیا۔" اذان نے جتاتے انداز میں کہا تو راحیلہ نے بے اختیار لب کاٹا۔ وہ اسے احمق سمجھنے کی غلطی کرتے خود احمق ثابت ہوئی تھی۔

"وہ میں...... مجھے لگا تم انکار کردو گے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں ممی کو بھی کرسکتا تھا۔" اس نے بناء لحاظ کیے کہا۔

"اینی وے...... باہر ڈرائیور ویٹ کررہا ہے اگر نہیں جانا تو اسے واپس بھیج دو ورنہ جلدی سے اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں ملازموں کو بلاوجہ انتظار کروانے کا قائل نہیں ہوں۔" سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں اسے یاددہانی کرواتے ہوئے اذان نے فوراً ہی کال منقطع کردی تھی اور وہ حیران کھڑی رہ گئی تھی۔

"رشیدہ میرا بیگ گاڑی میں رکھواؤ۔" آج اسے لازمی آشیانہ پہنچنا تھا کیونکہ کل سے فضیلہ کی شادی کا فنکشن شروع ہونے والا تھا جس کے لیے اسے راحیلہ نے وہاں آج ہر حال میں پہنچنے کی تاکید کی تھی لیکن اس کے لیے یہ ہرگز اتنا اہم نہیں تھا۔ اس کی ساری دلچسپی تو اپنی اور اذان کی منگنی کے ہونے والے فنکشن میں تھی جو فضیلہ کے عین نکاح والے دن رکھی گئی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلتے اس نے دل ہی دل میں اذان کو کوسا اور گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

......٭......٭......

وہ بہت دیر سے سامنے رکھے سوپ کے باؤل میں چمچ ہلاتے اسے غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔ اذان نے جو کچھ بھی اور جس انداز میں کہا وہ باتیں حرف بہ حرف عائشہ کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کا طنزیہ لہجہ، اس کا تضحیک بھرا رویہ اور اس کے لفظوں کی کاٹ کسی نشتر کی طرح دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔ اذیت یہ نہیں تھی کہ اذان نے اس کو بدکردار سمجھا تھا، رنج اس بات کا تھا کہ اس کی ضرورت نے اسے دو کوڑی کا کردیا تھا۔ وہ چاہتی تو شرجیل کو اذان کے فون کال کے متعلق بتاسکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کرپائی کیونکہ اس طرح اذان کے لگائے الزامات درست ثابت ہوجاتے مگر اس سے بھی زیادہ مسئلہ یہ ہوتا کہ شرجیل کا رویہ کھل کر سامنے آجاتا۔ اس کا رویہ عائشہ کے ساتھ بے تکلف تھا مگر ڈھکا چھپا بھی تھا۔

"کہاں کھوئی ہو عائشہ؟" شرجیل نے سوپ پیتے ہوئے رک کر سامنے بیٹھی سوچوں میں گم عائشہ کو مخاطب کیا۔ اسلام آباد سے اس کی واپسی چند گھنٹوں بعد ہوئی تھی جس کے بعد وہ اس کے ساتھ ایک جگہ میٹنگ کے لیے آئی تھی۔ واپسی پہ شرجیل اسے اپنے ساتھ لنچ کے لیے لے آیا تھا۔ عائشہ نے منع کیا لیکن شرجیل کے لیے اس کا انکار اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

"عائشہ...... میں تم سے بات کررہا ہوں۔" اس بار اُس نے قدرے اونچی آواز میں عائشہ کو پکارا۔

"جی سر۔" شرجیل کی آواز نے اس بار سوچوں کے ارتکاز میں دراڑ ڈالی تھی۔ اس نے چونک کر شرجیل کی طرف دیکھتے وضاحتی اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"سوپ کیوں نہیں پی رہی؟" وہ تفکر سے بولا۔

"جی نہیں چاہ رہا۔" عائشہ نے نچلا لب دباتے سر جھکا کر جواب دیا۔

"اتنی الجھی کیوں رہتی ہو؟" دونوں کہنیاں میز پہ ٹکائے، عائشہ کی طرف بغور دیکھتے وہ اپنائیت سے بولا۔ دوسری طرف اس کے چہرے پہ ہنوز سنجیدگی تھی۔ اپنی عادت کے مواقف اگر وہ اس وقت شرجیل کو سچائی بتادیتی تو سب کچھ ابھی کے ابھی ٹھیک ہوسکتا تھا مگر پھر سب غلط ہوجاتا۔ اس کی ماں کا علاج رک جاتا، گھر

ہاتھ سے چلا جاتا اور نومی...... وہ تو جا ہی رہا تھا۔ مصلحت تھی یا مجبوری...... عائشہ کو شرجیل کو جھیلنا ہی تھا اور یہ فیصلہ وہ کرچکی تھی۔

''عائشہ ہم دوست ہیں۔ جس طرح میں تم سے اپنی سب باتیں کہہ دیتا ہوں تم بھی کہہ دیا کروناں۔ جو دل میں آئے بتادیا کرو۔'' شرجیل نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ میز پہ دھرے عائشہ کے ہاتھ کی پشت پہ رکھ دیا۔ ایک لمحے کو وہ اس کی جرأت پہ کانپ سی گئی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟ آپ تو شادی شدہ ہیں ناں پھر کیوں آپ کو کسی غیر لڑکی سے دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیا آپ اپنی بیوی کو اپنا دوست نہیں بناسکتے؟'' عائشہ نے ایک نگاہ اپنے ہاتھ پہ رکھے شرجیل کے ہاتھ پہ ڈالی اور نرمی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''بیوی سی آئی ڈی ہوتی ہے سویٹ ہارٹ...... اسے صرف اچھا شوہر ہی چاہیے ہوتا ہے۔ شوہر کی ذرا سی خامی ہاتھ لگ جائے تو صرف گھر سے ہی نہیں نکالتی، دل سے بھی نکال باہر کرتی ہے۔'' شرجیل نے اس کی بات کا برا نہیں منایا تھا بلکہ ہلکا سا مسکرا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ عائشہ بناء پلکیں جھپکے اسے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ نہ پائی ہو۔

''چھوٹی سی بات ہے، میں ڈرنک کرتا ہوں اس بات سے دنیا میں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ سچائی اگر میری بیوی کو معلوم ہوگئی تو قیامت آجائے گی۔'' اس نے مزید کہتے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''آپ...... ڈرنک بھی کرتے ہیں؟'' اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے سوال کیا۔ اس کے لیے یہ عجیب مرحلہ تھا۔ اب تک جو سب قصے کہانیوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں ایک شخص ان ساری چیزوں کا اعتراف اس کے سامنے بیٹھے کررہا تھا اور عائشہ کو دل ہی دل میں اس آدمی سے شدید نفرت محسوس ہورہی تھی مگر وہ اس کا اظہار اس لیے نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس شخص سے اس کا مطلب جڑا ہوا تھا۔ دراصل اسے شرجیل سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بے تحاشا نفرت ہونے لگی تھی۔

''کبھی کبھی۔'' اس نے کندھے اچکاتے عام سے انداز میں کہا۔

''لیکن اپنی خامیوں کو دور کرنا اتنا مشکل تو نہیں...... پھر اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت اپناتی ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''غلط...... کوئی اپنے ہیرو کو نیگیٹو دیکھنا پسند نہیں کرتا، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک انسان ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے تردید کی۔

''آپ پیار نہیں کرتے ان سے؟'' اس نے مزید پوچھا۔

''بہت سے بھی بہت زیادہ'' شرجیل نے بے ساختہ اعتراف کیا۔

''لیکن محبت میں دھوکا جائز نہیں۔'' وہ بے چینی سے بولی۔

''محبت تو جائز ہوتی ہے ناں؟'' شرجیل بامعنی انداز میں مسکرایا مگر عائشہ کے لیے یہ کام نہایت مشکل تھا۔ وہ شرجیل کی باتوں کو مشکل سے ہی سمجھ پاتی تھی جیسے اب بھی یہ سب اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ ایک شخص اگر اپنی بیوی سے محبت کا دعویٰ کررہا تھا تو پھر وہ اسے دھوکا کیسے دے سکتا تھا یا پھر یہ سرے سے محبت تھی ہی نہیں اور وہ یقیناً خود کو فریب دے رہا ہے۔

''لگتا ہے تمہیں واقعی بھوک نہیں ہے۔ ایسا کرتے ہیں یہ سب پیک کروالیتے ہیں۔ آفس چل کر کھالینا۔'' شرجیل نے اس کے موڈ کا اندازہ کرتے فیصلہ کیا اور اشارے سے ویٹر کو قریب بلایا۔ عائشہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

اذان سے ہوئی گفتگو کے بعد اسے اتنا اندازہ تو ہوگیا تھا کہ شرجیل کے تعلقات اپنی بیوی سے خراب

ہیں اور اس کی قصوروار بھی وہ خود کو ہی سمجھ رہی تھی کیونکہ اذان نے اس کو ہی مجرم ٹھہرایا تھا تو وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح شرجیل کو اس کی غلطی کا احساس دلا دے اور کیا پتا وہ اپنے گھر کا ماحول ٹھیک کرلے لیکن شرجیل کے رویے سے لگتا تو نہیں تھا اس سب کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلنے والا ہے۔لہٰذا یہ کوشش بیکار ہی گئی تھی۔

"میں پوچھتی ہوں آخر ایسا کون سا ضروری کام ہے جو شرجیل‘ بھائی کی شادی پہ نہیں آرہا؟" نگہت کے لہجے میں تلخی تھی۔شرجیل اور وہ آج بھی آشیانہ نہیں پہنچے تھے حالانکہ کل مایوں کی رسم تھی۔سامعیہ دل ہی دل میں بے حد پریشان تھی کہ آخر کیا کرے۔شرجیل اس سے کوئی بات نہیں کررہا تھا اور اذان نے بھی دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا البتہ صبح سویرے ہی نگہت کی کال آگئی تھی جو خاصی برہم لگ رہی تھیں۔

"ممی وہ کل لازمی پہنچ جائیں گے۔" اس نے التجائیہ انداز میں یقین دلایا لیکن سچ تو یہ تھا کہ یہ بھی اپنے طور کہی بات تھی۔شرجیل کے تیور جو دکھائی دے رہے تھے ان سے کہاں لگتا تھا کہ وہ کل بھی پہنچے گا کیونکہ آج ہی صبح وہ اسلام آباد نکل گیا تھا اور وہاں سے اس کی واپسی کب تھی یہ بات سامعیہ کے علم میں نہیں تھی۔

"تو تم کس کا انتظار کررہی ہو سامعیہ‘ ایٹ لیسٹ تم تو آج پہنچو۔جانتی نہیں یہاں کتنے کام ہیں۔" وہ زچ ہوکر بولیں۔سامعیہ کو شدید شرمندگی نے آگھیرا۔ان کی بات بالکل درست تھی کیونکہ وہ ان کی بڑی بہو تھی۔یقیناً انہیں وہاں خاندان میں سب کو وضاحتیں دینی پڑ رہی ہوں گی۔

"ممی......میں وہ......" اس نے دھیمے لہجے میں کہنا چاہا لیکن نگہت نے بات کاٹ دی۔

"میں یہاں دوسروں کا منہ دیکھ رہی ہوں اور میری اپنی بہو ہی وقت کے وقت تشریف لائے گی۔غلطی میری ہی ہے جو تم سے امید لگائی۔" نگہت کا لہجہ سخت ہوا

naeyufaq.com

تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ماہنامہ آنچل کراچی

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول‘ ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

تیری زلف کے سر ہونے تک

خاندانی اختلاف کے پس منظر میں لکھا گیا اقرا صغیر احمد کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ دیگا

اکائی

عشنا کوثر سردار کا ایک لازوال ناول جس کا ہر لفظ انمٹ نقوش چھوڑ دیگا

عشق دی ماری میں جھلی

سائرہ قریشی کی دلکش و دل موہ لینے والی تحریر غم و خوشی سے آراستہ ایک ناقابل فراموش کہانی

Info@naeyufaq.com

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (03008264242)

مگر سامعیہ کو برا نہیں لگا۔ الٹا وہ مزید شرمندہ ہورہی تھی۔ اتنے سالوں میں اس نے سب سے اچھا تعلق ہی تو استوار کیا تھا اور اب صرف نگہت ہی نہیں علی اور شارق کے علاوہ بی بی جان بھی اسے متعدد بار کال کرکے اب تک نہ آنے کی وجہ پوچھ چکی تھیں۔ وہ سب سے جھوٹ سچ بول کر اور وضاحتیں دے دے کر تھک گئی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے ممی...... میں آنا چاہتی ہوں لیکن شرجیل کے ساتھ۔" اس نے دھیمے مگر سنجیدہ انداز میں کہا۔

"ویسے چل کیا رہا ہے تم دونوں کے درمیان؟" نگہت کے لہجے میں تشویش درآئی۔

"کچھ نہیں ممی...... آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے؟" اس نے یک دم گھبرا کر بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کیونکہ اس سے پہلے کبھی شرجیل نے ایسی غفلت نہیں دکھائی۔ وہ میری کال تک ریسیو نہیں کررہا۔" نگہت نے جل کر کہا۔ اپنی ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اول تو ان دونوں کے درمیان کبھی ایسی نوبت آئی ہی نہیں تھی پھر اگر کبھی چھوٹی موٹی بات ہوئی بھی تو باہر نہیں گئی تھی۔ ان سب نے ہمیشہ ان دونوں میں ایک اچھا اور خوب صورت تعلق ہی دیکھا تھا۔ سامعیہ کو ہمیشہ بے حد خوش اور مطمئن پایا تھا۔

"شرجیل اسلام آباد گئے ہیں۔ میٹنگ میں ہوں گے شاید اسی لیے آپ کی کال ریسیو نہیں کی ہوگی۔" سامعیہ نے کہا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" وہ ناراضی سے بولیں۔

"تم آج اور ابھی یہاں پہنچو۔ شرجیل سے تمہارے ڈیڈ خود بات کریں گے۔" سامعیہ کا مدہم لہجہ اور بے بسی نگہت سے چھپ نہیں پائی تھی اور نگہت اتنا تو سمجھ گئی تھیں کہ ہو نا ہو معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ بہرحال جو بھی تھا ابھی تو ان سب باتوں کا وقت نہیں تھا اس لیے حکمیہ انداز میں کہتے انہوں نے کال منقطع کردی تھی۔

⁂

آشیانہ کی عمارت روشنیوں میں بھیگی ہوئی تھی۔ شادی کا آج سے باقاعدہ آغاز ہوچکا تھا اور شام میں فضیلہ کے مایوں کی تقریب تھی جبکہ کل مہندی سے پہلے اس کا علی سے نکاح ہونا تھا۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ سنبل بھی کل کی منگنی کو لے کر بہت بوکھلائی ہوئی تھیں البتہ اذان کی آمد اب تک نہیں ہوئی تھی۔ بیوٹیشن فضیلہ کو مہندی لگانے خاص طور پہ شہر سے بلائی گئی تھی چونکہ منگنی راہینہ کی بھی تھی تو اس نے بھی فضیلہ کی طرح ہی پورے اہتمام سے اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگوالی تھی۔ گو اذان سے اس کا تعلق اب بھی کھینچا تانی کا شکار تھا اور فقط ایک دن پہلے وہ اس کی تلخ گفتگو سن بھی چکی تھی پھر بھی کل کا سوچ کر وہ مطمئن تھی۔ کچھ بھی تھا وہ اپنی مرضی کے انسان سے بندھ رہی تھی پھر بھلے اس رشتے میں اس کی اپنی مرضی شامل نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ساری زندگی محبت اور زبردستی کے فرق سے ناآشنا رہتے ہیں اور راہینہ کا شمار بھی انہی میں تھا جن کے لیے اپنی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

"میری طرح ہاتھوں پہ مہندی لگالینے سے یہ امید مت لگانا کہ اس کا رنگ بھی میرے جیسا گہرا آئے گا۔" فضیلہ نے اس کے چہرے پہ بات بے بات آتی مسکراہٹ اور رنگوں کو محسوس کرتے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"جب مہندی ایک سی ہے تو رنگ بھلا الگ کس طرح ہوسکتا ہے۔" وہ مسکرائی اور اپنی ہتھیلی پہ لکھے اذان کے نام کو کھوجنے لگی۔

"بی بی جان کہتی ہیں کہ لڑکی کے ہاتھوں پہ لگی مہندی کا رنگ اس کے ہونے والے شوہر کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے دل میں محبت جتنی گہری ہوگی، مہندی کا رنگ بھی اتنا ہی گہرا آئے گا۔" فضیلہ کا طنز،

راہینہ کی ہنسی معدوم کر گیا تھا۔اب ایسا تو نہیں تھا کہ اس سے کچھ چھپا ہوا تھا۔وہ بڑی اچھی طرح واقف تھی کہ اذان اب بھی راہینہ کو منہ نہیں لگاتا ہے اور اسے کسی حد تک یہ بھی اندازہ تھا کہ اس رشتے میں اذان پہ بی بی جان کا پریشر ہے البتہ پوری بات سے تو واقف نہیں تھی۔

''اب علی تو مجھے بے حساب چاہتا ہے اور یہ بات وہ دن میں دس بار فون اور میسج پہ مجھے بتاتا ہے۔بہانے بنا بنا کر مجھے ایک نظر دیکھنے چلا آتا ہے۔اپنے خیال اور توجہ سے مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں اس کی زندگی میں کتنی اہم ہوں۔ ہماری شادی کو لے کر اس کی ایکسائٹمنٹ کسی سے بھی چھپی نہیں ہے اور ایک اذان ہے جسے یہ بھی پروا نہیں کہ کل اس کی منگنی ہے۔ہم سب یہاں موجود ہیں اور وہ صاحب مصروف ہیں۔'' اس نے پاس رکھے اپنے سیل کی اسکرین کو مسکراتی نظروں سے دیکھا جہاں اب بھی علی کے میسجز بلنک کررہے تھے۔

''علی جیسے بیکار اور فالتو لوگوں کے پاس اور کام ہی کیا ہوتا ہے سوائے لڑکیوں کے آگے پیچھے چکر لگانے کے۔اب وہ کوئی اذان جیسا مصروف اور ہائی پروفائل بزنس مین تو نہیں ہے اور مجھے بھی یہ پسند نہیں کہ مرد اپنے سستے جذبات کی تشہیر کرتا پھرے۔اس پہ ایٹی ٹیوڈ ہی جچتا ہے۔'' راہینہ نے جل کر کہا لیکن فضیلہ بے ساختہ ہنس دی۔

''جذبات ہوں گے تو دکھائے گا ناں بیچارہ...... پلیز یہ مت کہنا اذان تم سے محبت کرتا ہے کیونکہ ڈیئر سس مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔اتنے مہینے سے بات پکی ہے تم دونوں کی اور تم اس سے کتنے رابطے میں ہو یہ بھی مجھے معلوم ہے۔'' وہ سچ کہہ رہی تھی جو تلخ بھی تھا اور تکلیف دہ بھی اسی لیے راہینہ سے برداشت نہیں ہوا۔

''فضیلہ تم اپنی اوقات میں رہو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی مت کرو۔'' یک دم صوفہ سے اٹھتے اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''میں جانتی ہوں میں کہاں ہوں البتہ تمہیں غلط فہمی کی سرحد عبور کرتے دیکھ کر افسوس ہورہا ہے۔جذبات میں آکر خاصے گھاٹے کا سودا کرگئی ہو اور اذان کو تمہاری چاہ نہیں ہے۔'' فضیلہ پہ اس کی تنبیہہ بے اثر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سنجیدہ اور دوٹوک انداز میں کہتی وہ خود ہی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کی باتیں پیچھے کھڑی راہینہ کے اندر طوفان برپا کررہی تھیں۔اس نے ایک نگاہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے لگی مہندی اب بھی گیلی تھی اور پھر غصے سے بے قابو ہوکر ایک ساتھ کئی ٹشو نکال کر اپنے ہاتھ ان سے رگڑ ڈالے۔اس کے ہاتھوں پہ لگی مہندی ایک پل میں برباد ہوگئی تھی۔

......

سامعیہ نے گجرے پہنتے ہوئے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔شام کے چھ بجنے والے تھے اور سب لوگ تقریب کے لیے تیار ہورہے تھے۔وہ بھی اپنے کمرے میں تیار ہورہی تھی لیکن شرجیل اب بھی نہیں پہنچا تھا۔وہ کل نکلنے سے پہلے اس کے موبائل فون پہ میسج چھوڑ آئی تھی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔اس بات نے اس کا دل اور بھی اداس کردیا تھا کہ اسے اب سامعیہ کی اتنی سی پروا بھی نہیں تھی۔نہ جانے وہ آج بھی پہنچے گا یا نہیں یہ سوچ کر اس کا دل ہی اچاٹ ہوگیا تھا۔خود کو آئینے میں دیکھتے ایک گہرا سانس لیا اور مزید تیاری کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اپنا دوپٹا سیٹ کرکے کمرے سے باہر نکل گئی۔جب شرجیل ہی نہیں تھا تو پھر یہ بناؤ سنگھار کس کو دکھاتی۔جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلی اسے شاک لگا۔لاؤنج میں شرجیل، اذان اور بی بی جان کے ساتھ موجود تھا۔وہ دونوں وہاں کب پہنچے اسے بالکل خبر نہیں ہوئی البتہ بی بی جان کا موڈ خوشگوار تھا۔ان کے چہرے کی مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔وہ لوگ آپس میں کوئی بات کررہے

تھے' شرجیل نے ایک نظر سامعیہ کو دیکھا اور اس پہ توجہ دیے بغیر بی بی جان سے ہو رہی بات میں مصروف رہا۔

''آپ کب آئے شرجی...... مجھے پتا ہی نہیں چلا؟'' چہرے پہ مسکراہٹ سجائے سامعیہ نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''دو گھنٹے ہوگئے شاید۔'' اس نے سرسری سے انداز میں بتایا۔ سامعیہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ وہاں پچھلے دو گھنٹے سے موجود تھا اور اس نے اسے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں کی تھی۔

''اچھا...... مجھے تو پتا ہی نہیں۔ ویسے میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے سر جھکائے شرمندگی سے کہا۔

''میں بی بی جان کے پاس تھا' ویسے بھی تم سے تو روز ملتا ہوں۔'' شرجیل نے روکھائی سے جواب دیا اور اس کا یہ سرد رویہ وہاں بیٹھے اذان اور ہاجرہ بیگم نے بخوبی محسوس کیا تھا۔ سامعیہ کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے سب کے سامنے اس انداز میں بات بھی کر سکتا ہے۔

''میں دیکھوں ممی کیا کر رہی ہیں۔'' بے تحاشا اس کی آنکھیں نم ہوئیں' اپنی پلکوں کو جھپک کر اس نے آنسوؤں کو بہنے سے روکا اور پھر وضاحت دیتے جلدی سے واپس پلٹ گئی۔ شرجیل اسے مکمل طور پہ نظر انداز کرتے بی بی جان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگیا البتہ اذان کی نگاہ نے کمرے سے نکلنے تک سامعیہ کا تعاقب کیا تھا۔ چند روز پہلے سامعیہ نے جو بات اس سے کہی تھی آج اذان نے شرجیل اور سامعیہ کے تعلق میں دکھائی دیتی سرد مہری سے خود بھی محسوس کر لی تھی۔

......

مایوں کی تقریب روایتی مگر شاندار تھی۔ علی اور شارق کی شرارتوں نے سب کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا تھا یہاں تک کہ شرجیل اور اذان بھی بچ نہیں پائے تھے۔ اگلے دن دوپہر میں ہی فضیلہ اور علی کا نکاح ہوگیا تھا البتہ شام میں مہندی سے پہلے اذان اور راہینہ کی منگنی کی رسم تھی۔ راہینہ ہمیشہ کی طرح منفرد اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ جو اس کے اندر اٹھتی خوشی کی چغلی کھا رہی تھی۔

''تمہیں اندازہ نہیں میں کتنی خوش ہوں، آخر میں نے تمہیں حاصل کر ہی لیا۔'' اپنے ہاتھ میں پہنی ہیرے جڑی انگوٹھی کو دیکھتے اس نے دھیمے مگر جتاتے ہوئے انداز میں اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''کبھی کبھی زیادہ خوشی' زیادہ دکھوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں کوئی ٹرانی نہیں ہوں راہینہ بی بی...... یہ زور زبردستی کا تعلق اگر رشتے میں بدلا ہے تو اس کی وجہ فقط بی بی جان ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے سامنے دیکھتے اسی کے انداز میں کہا۔

وہ دونوں ایک ساتھ اسٹیج پہ بیٹھے تصاویر بنوا رہے تھے۔ راہینہ تو خیر ہر انداز سے خوش نظر آ رہی تھی لیکن اذان بھی قدرے نارمل تھا جس کے پیچھے بی بی جان کا ہاتھ تھا۔ وہ کل سے اس کی اچھی خاصی ذہنی نشوونما کر چکی تھیں کیونکہ سنبل کو خدشہ تھا کہیں سب لوگوں کے درمیان وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے خاندان کو کوئی غلط تاثر ملے۔ ان کا بس چلتا تو آج ہی علی اور فضیلہ کے ساتھ ان دونوں کا بھی نکاح کروا دیتیں مگر اذان نے پہلے ہی بی بی جان سے اس متعلق وعدہ لے لیا تھا۔

''ڈونٹ وری مجھے اپنی خوشیوں پہ بھروسہ ہے۔ بڑا دیرپا ساتھ ہے میرا اور ان کا اور پھر وجہ کوئی بھی ہو اذان سچ تو یہ ہے کہ آج سے ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے اور اب تم پہلے کی طرح اس سے مکر نہیں سکتے۔'' اذان کی طرف مسکرا کر دیکھتے اس نے یقین سے کہا۔

''تم خاصی بیوقوف ہو راہینہ، بچوں کی طرح عارضی باتوں سے بہل جاتی ہو۔ سچ کہوں تو مجھے تم سے ہمدردی

ہے۔'' استہزائیہ لہجے میں کہتا وہ یک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ فوٹوگرافر اس وقت کیمرہ فوکس کرتا ان دونوں کی تصویر بنا رہا تھا جب اذان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور تیز قدموں سے چلتا وہاں سے چلا گیا۔ سب لوگ اس کے اچانک اٹھنے پہ حیرانی سے متوجہ ہوئے۔

رامینہ حیران بیٹھی اس کے لفظوں میں چھپی تنبیہ کو سوچنے لگی۔ وہ جسے پانے کی بات کررہی تھی، وہ اسے چھوڑنے کا عندیہ دے گیا تھا۔

''ایک بات سوچ رہا تھا میں۔'' شارق پچھلے دو گھنٹے سے علی کا کمرہ ڈیکوریٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا اور بری طرح ناکام ہوا رہا تھا۔ دوپہر ہونے کو آئی لیکن سب کچھ جوں کا توں تھا۔ فرش پہ ہر طرف پھول اور آرائشی سامان بکھرا ہوا تھا۔ اتنا ادھم مچا ہوا تھا کہ پہلی نظر میں وہاں آکر دیکھنے والے کو وہ یقیناً کوئی اسٹور روم نظر آتا۔ شارق کمرے کے ایک سے دوسرے کونے میں گھومتا پھر رہا تھا۔ بیڈ پہ آئی پیڈ رکھا تھا جس پہ کچھ ڈیکوریشن آئیڈیاز کھلے ہوئے تھے اور وہ باری باری سب کو اپنے انداز میں ٹرائی کرچکا تھا لیکن پھر علی کے ناک منہ چڑھانے پہ اسے بدل دیتا۔

''بات کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر یہ سوچنے والا کام تجھ سے کیسے ہوگیا میرے بھائی؟'' علی نے اپنی شیروانی ٹرائی کرتے خود کو آئینے میں دیکھتے شرارت سے کہا۔ شارق نے علی کو کھا جانے والے انداز میں دیکھا اور پھر یک دم ہاتھ میں پکڑے گلاب کی ٹہنیاں وہیں پخ کرنا راضی سے اس کے بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

''ایک تو بھائی سمجھ کر اتنی محنت فری میں کررہا ہوں اور اس پہ تو مجھے ہی باتیں سنا رہا ہے۔ جا میں نہیں سجاتا تیرا کمرہ۔'' منہ پھلائے اس نے ہاتھ مارتے بچوں کی طرح خفا ہوتے کہا تو علی بھی پریشان ہوگیا۔

''بھائی سمجھ کر کیا۔ ارے بھائی میں تیرا بھائی ہوں۔ اصلی والا.....'' علی نے منانے کے سے انداز میں پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور اس کے کان کے پیچھے پھنسا پھول نکال کرناک سے لگایا۔

''اچھا بھائی ہے؟'' شارق نے جتاتی نظروں سے علی کو دیکھتے چمک کر کہا تو علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر ممی سے میری شادی کی سفارش کیوں نہیں کی؟'' وہ خفا لہجے میں بولا۔

''کیوں اتنی ٹینشن لے رہا ہے میرے گول مٹول بھائی۔ ہوجائے گی تیری بھی شادی پہلے مجھے تو تجربہ کرلینے دے۔'' علی نے شارق کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے تسلی دی۔

''کچھ بھی ہے علی...... آخر ہم دونوں ایک عمر کے ہیں لیکن تیری شادی مجھ سے پہلے ہورہی ہے۔ یہ تو سوچ لوگ کیا کہیں گے؟'' وہ منہ پھلائے تشویش سے بولا۔ یوں جیسے دنیا کو بس ایک یہی کام ہے کہ وہ اس کی فکر میں ہلکان ہو۔

''ایک عمر کے کیسے ہوئے؟ میں تجھ سے پورے ڈیڑھ منٹ بڑا ہوں۔ اس لیے میرا پہلے شادی کرنا بالکل جائز ہے۔'' علی نے چہک کر کہا اور گلاب اس کے کان میں اڑستا اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ تم دونوں ابھی تک باتوں میں لگے ہو۔ کمرہ تو سارا یوں ہی بکھرا پڑا ہے۔'' نگہت نے اندر آتے کمرے کا حال دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ نگہت کی نگاہ شارق کے بالوں میں لگے پھول پہ تھی۔

''ممی...... وہ...... بس ابھی ہوجائے گا۔'' شارق نے ماں کو دیکھتے جلدی سے پھول کھینچ کر پینٹ کی جیب میں چھپالیا اور گڑبڑاتے ہوئے تسلی دی۔

''کہا بھی تھا ڈیکوریشن والوں کو بلا لیتے ہیں۔ تم لوگوں سے نہیں ہوگا لیکن یہاں میری سنتا کون ہے؟'' نگہت جلے کٹے انداز میں بڑبڑاتی بیڈ پہ رکھی چیزیں ہٹانے لگیں۔

''پاپا تو آپ ہی کی تو سنتے ہیں ہمیشہ۔'' شارق نے حسب عادت لقمہ دیا۔

''پیاری ممی آخر پریشانی کیا ہے؟ آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔'' نگہت نے بے ساختہ علی کو گھورا۔

''یہ تم مجھ سے نہیں اپنے بڑے بھائی سے پوچھو؟'' وہ تشویش سے کہتی بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گئیں۔

''تو کیا شرجی بھائی بھی پریشان ہیں؟'' شارق کی زبان کم ہی رکتی تھی۔

''ممی آپ اس گدھے کو اگنور کریں...... مجھے بتائیں مسئلہ کیا ہے؟'' اس سے پہلے کہ نگہت کچھ کہتیں علی نے جلدی سے معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں خود ہی شارق کی کمر پہ ایک دھپ رسید کی۔

''غضب خدا کا پورے خاندان کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہر کوئی پوچھ رہا ہے کہ شرجیل کو کیا ہوا ہے اور وہ سامعیہ کچھ سیدھی طرح بتا ہی نہیں رہی ہے کہ آخر بات کیا ہے۔'' نگہت پریشانی سے بولیں۔ پچھلے دو دن سے وہ یہ بات محسوس کر رہی تھیں کہ سامعیہ اور شرجیل میں بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ فیملی کے باقی لوگ بھی حیران تھے کہ شرجیل سب سے الگ تھلگ ہے۔ نہ پہلے کی طرح کسی سے گھل مل رہا ہے اور نہ ہی خوش دکھائی دے رہا ہے۔ دوسری طرف سامعیہ بھی بہت چپ چپ اور اداس تھی۔ اس سب کے باوجود کہ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور ہر ایک سے خوش دلی سے ملنے کی کوشش کی، نگہت کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ جھگڑے کی وجہ کیا تھی' اس بات کا تجس اپنی جگہ البتہ یہ تشویش بھی تھی کہ آخر ایسا کیا مسئلہ ہو گیا جو اتنے برسوں میں پہلی بار شرجیل، سامعیہ سے خفا ہے۔

''اوہو ممی...... سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ بس ایسے ہی وہم کر رہی ہیں۔'' علی نے بے فکری سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ویسے بھی وہ سب ان دونوں کے رشتے کی مضبوطی کو جانتے تھے۔ ان کے نزدیک اب اگر کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا ہوا بھی تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن نگہت کی سوچ الگ تھی کیونکہ عمر اور تجربہ انسان کو رویوں کی سمجھ دیتا ہے اور ان کا تجربہ انہیں بتا رہا تھا کہ بات معمولی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ علی کی بات کی تردید کرتیں شرجیل بھی انہیں ڈھونڈتا وہاں چلا آیا تھا۔

''شرجی بھائی آپ ہی بتائیں سب ٹھیک ہے ناں؟'' اسے دیکھتے ہی شارق نے بے ساختہ سوال کیا۔

''ہاں...... کیوں کیا ہوا؟'' اس نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ایشو ہے تمہارے اور سامعیہ کے درمیان؟'' نگہت نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''کوئی ایشو نہیں۔ آپ سے کس نے کہا؟'' وہ جھوٹ کا ماہر تھا، بے ساختہ اور دوٹوک انداز میں کہتے اس نے یوں حیرانی سے ان کی طرف دیکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''جھوٹ مت بولو...... میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے تم دونوں کے درمیان کوئی بڑا پرابلم چل رہا ہے۔ سامعیہ کو کبھی میں نے ایسا مرجھایا ہوا نہیں دیکھا۔ ویسے تو بڑی محبت کے دعویٰ کرتے ہو اس سے، کیا دکھائی نہیں دے رہا وہ کتنی پریشان ہے تمہاری وجہ سے؟'' نگہت روانی میں کہہ گئیں۔ شرجیل سنجیدہ کھڑا سنتا رہا اور کسی تردید یا توثیق کے بناء غصے سے باہر نکل گیا۔

''کہا تھا ناں میں نے ضرور کوئی بات ہے۔ ماں میں ہوں اس کی کہے بناء بھی سچ جان لیتی ہوں۔'' اپنے شک و شبہات کی تصدیق ہونے پہ انہوں نے جتاتے سے انداز میں علی اور شارق کو دیکھا۔

''ماں تو آپ ہماری بھی ہیں تو پھر آپ نے شرجی بھائی کی طرح ہمارے پرابلم کیوں نہیں سمجھیں؟'' شارق نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو نگہت کے ساتھ ساتھ علی نے بھی قدرے حیرانی سے اس کی طرف

دیکھا۔
''تمہارا......! تمہیں کیا پرابلم ہے؟'' وہ ماتھے پہ بل ڈالے الجھن سے بولیں۔
''وہ......علی کو پتا ہے ممی۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کرتے علی کو دیکھا۔
''مجھے کیا پتا تیرے پرابلم کا موٹے؟'' علی کا منہ اس کی اس بات پہ حیرت سے کھلا۔
''ابھی بتایا تو تھا۔'' شارق نے آنکھیں گھماتے ہوئے سرگوشی کی۔
''اچھا وہ......'' علی نے سمجھنے کے سے انداز میں کہا جبکہ نگہت کبھی حیرت سے علی کو تو کبھی شارق کو دیکھتیں ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھیں۔
''یہ تم دونوں کیا کوڈ ورڈز میں باتیں کررہے ہو۔ سیدھی طرح بتاتے ہو یا اتاروں جوتی۔'' نگہت کا صبر جواب دے گیا۔ غصے سے دونوں کو گھورتے انہوں نے باقاعدہ اپنا ہاتھ پاؤں کی طرف بڑھایا۔
''ممی آج کے دن تو مجھے جوتی مت دکھائیں آج میری شادی ہے۔'' علی خوف زدہ ہوکر شارق کے پیچھے چھپ گیا۔
''جی ممی......اس کی شادی ہے اور میں شہ بالا ہوں اس کا۔ آخر کچھ تو میری ریپوٹیشن کا خیال کریں۔'' شارق نے سرہلاتے علی کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''اوہ میرے خدایا...... پتا نہیں تم دونوں کب بڑے ہوگے۔ تم دونوں کی حماقتوں کی وجہ سے شرجیل بھی چلا گیا۔ مجھے بات کرنا تھی اس سے۔'' نگہت نے ماتھے پہ ہاتھ مارا اور غصے سے کہتیں کمرے سے باہر چلی گئیں۔
''یار یہ ہر کوئی ہمیں ہی کیوں الزام دیتا ہے؟'' علی نے شکوہ کناں نظروں سے شارق کو دیکھتے انتہائی سادگی سے کہا جبکہ شارق بوجھل دل سے واپس پھول لگانے لگا تھا۔

❁......❁......❁

بیوٹیشن پہنچ گئی تھی اور سب لڑکیاں بمعہ فضیلہ گیسٹ ہاؤس میں جمع تھیں۔ سامعیہ کا ہرگز موڈ نہیں تھا لیکن نگہت پہلے ہی نظر رکھے ہوئے تھیں اور بی بی جان بھی اس سے کئی بار سوال کرچکی تھیں کہ وہ خاموش کیوں ہے لہٰذا خود کو مطمئن ظاہر کرنے کے لیے ہی سامعیہ نے بھی اپنی چیزیں اکٹھی کیں اور تیار ہونے کے ارادے سے گیسٹ ہاؤس کی طرف چلی دی تب شرجیل نے اسے پیچھے سے پکارا۔
''سامعیہ......'' سامعیہ اس کی آواز پہ رک کر پلٹی جب وہ خود ہی تیز قدموں سے چلتا اس کے قریب پہنچ گیا۔
''کیا بات ہے شرجی؟'' اس نے نرمی سے پوچھا البتہ شرجیل کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
''تم نے ممی سے میری کمپلین کی ہے؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔
''نہیں تو...... میں بھلا ایسا کیوں کروں گی؟'' وہ قدرے حیرانی سے بولی۔
''تو انہیں کیا خواب آیا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی ایشو ہے۔'' شرجیل یک دم ہی غصے میں آ گیا۔
''ہمارے اردگرد سب آنکھوں والے ہیں شرجی۔ آپ کا میرے ساتھ رویہ کسی سے چھپا تو نہیں۔'' سامعیہ نے دھیمے لہجے میں کہا مگر شرجیل مزید بھڑک اٹھا۔
''اچھا......ایسا کون سا ظلم کا پہاڑ توڑ دیا ہے میں نے تم پہ؟ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔'' وہ قدرے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاصے طنزیہ انداز میں بولا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز ہی نہیں اس کے لہجے کی درشتی کو بھی باہر سے آتے اذان نے محسوس کرلیا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے بی بی جان کے کسی کام سے باہر گیا تھا اور ابھی اس کی واپسی ہوئی تھی۔ شرجیل کے چہرے کے تاثرات اور سامعیہ کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دونوں میں جھگڑا ہورہا ہے۔

"یہ کس لہجے میں بات کررہے ہوتم سامعیہ سے شرجیل؟" قریب پہنچ کراس نے خفگی سے ٹوکا۔ بے شک یہ ان دونوں کا آپسی معاملہ تھا مگر وہ سب کی طرح سامعیہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس کی تکلیف یا بے عزتی کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

"وہی لہجہ جو یہ ڈیزرو کرتی ہے۔" شرجیل کے تیور ہنوز وہی تھے البتہ سامعیہ وہاں اذان کو دیکھ کر گھبرائی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سامنے کوئی بات ہو۔

"اذان بھائی پلیز آپ رہنے دیں یہ سب ہمارا آپس کا مسئلہ ہے۔" اذان کو دیکھتے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجاء کی جو اذان فوراً ہی سمجھ گیا۔ وہ ہرگز اتنا بیوقوف نہیں تھا جو سامعیہ کی بتائی بات شرجیل کو کہہ دیتا۔

"ہمارا مسئلہ تو تم نے یونیورسل ایشو بنا لیا ہے۔ سب سے ہمدردیاں بٹورنے کے چکر میں سارے خاندان کے آگے آنسو بہاتی پھررہی ہوتم...... اذان سن لے گا تو کیا قیامت آجائے گی؟" شرجیل نے استہزائیہ کہتے اسے ٹوکا۔ سامعیہ نے حیرت سے دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شرجیل کسی کے سامنے اس سے اس لہجے میں بھی بات کرسکتا ہے۔ برسوں اس آدمی نے اسے ان سب کے بیچ معتبر بنائے رکھا تھا اور آج جب نگاہ پھیریں تو پل میں زمین پہ لا پٹخا تھا۔ اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس سے زیادہ وہ وہاں کھڑے ہوکر اپنی بے عزتی نہیں کرواسکتی تھی۔ بے تحاشا اس کی آنکھیں چھلکیں اور وہ تیزی سے بھاگتی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف واپس لوٹ گئی۔

"شرجیل کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ ہوش سے کام لو۔" اذان نے تاسف سے سامعیہ کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر پلٹ کر شرجیل کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔

"ہاں تو اور کیا کروں؟ خود تو یہ آنسو بہا کر مظلوم بن گئی ہے اور ممی کے سامنے مجھے ولن بنادیا ہے۔" سینے پہ بازو لپیٹے اس نے سر جھٹکا۔ اس کا ذہن پہلے ہی الجھا ہوا تھا اس پہ نگہت کا اس سے باز پرس کرنا اور کسی نتیجے تک پہنچ جانا جیسے اس کی انا پہ گہری ضرب لگا رہا تھا۔ اس کا ایک امیج تھا جو اس نے منافقت سے ہی سہی لیکن بڑا شاندار بنا رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس بت میں دراڑ آئے۔

"مجھ سے بہتر تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ اپنی غلطی سامعیہ کے سر مت ڈالو اور بہتر یہ ہوگا کہ تم سامعیہ سے ابھی اور اسی وقت اپنے رویے کی معافی مانگو ورنہ......" اذان نے جتاتے ہوئے کہا۔

"ورنہ کیا؟" اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"ورنہ میں سامعیہ کو سچائی بتادوں گا۔" وہ بھی ساری مروت بالائے طاق رکھ کر کہہ گیا۔

"تمہیں اگر لگتا ہے میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ایک سامعیہ کیا پوری دنیا کو بتا دو۔ آئی ڈونٹ کیئر۔" شرجیل نے استہزائیہ ہنسی ہنستے اذان کو دیکھا اور سر جھٹکتا وہاں سے چلا گیا۔

شرجیل واقعی بدل گیا تھا اور اس میں بدلاؤ کیوں آیا تھا یہ بات اذان کے لیے بھی پریشانی کا باعث تھی۔ کل تک اسے عائشہ کو کال کرنے کا افسوس تھا لیکن آج اسے ٹھیک لگ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوتا جارہا ہے مجھے؟" کرسی کی پشت پہ سر ٹکاتے اس نے الجھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ کل تک جو بے چینی تھی آج صبح اسے دیکھتے ہی غائب ہوگئی تھی۔ پچھلے چند روز سے اس کا ذہن بری طرح مشتعل تھا۔ بھائی کی شادی اور ماں باپ کا پریشر نہ ہوتا تو وہ کبھی نہ جاتا اور اب اگر چلا گیا تھا تو دل و دماغ میں صرف عائشہ سمائی ہوئی تھی۔ اسے اپنی یہ کیفیت بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یہ بات وہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن سچ

یہی تھا کہ وہ عائشہ کو بری طرح مس کررہا تھا پر کیوں؟

وہ نہیں جانتا تھا لیکن بس وہ اسے اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے الجھتا رہا تھا، محفل میں تنہائی محسوس کررہا ہوتا۔ اور اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہورہا تھا وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔ ایک فقط جسم کی خواہش ہوتی تو شرجیل کب کا اس سے اپنا مطلوبہ فائدہ حاصل کرچکا ہوتا لیکن وہ عائشہ کو اپنے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بے تکی، بے مقصد اور بیہودہ بات کرنا چاہتا تھا جو اس نے کبھی کسی نے نہیں کہی تھیں۔ اس کی آواز سننے کے لیے بے چین رہتا اور اپنی اس کیفیت کو وہ کوئی نام نہیں دے پارہا تھا۔ دینا چاہتا بھی تو دے نہیں پاتا کیونکہ محبت تو وہ صرف سامعیہ سے کرتا تھا پھر اچانک عائشہ کیوں حواسوں پہ سوار ہورہی تھی۔ کس طرح وہ سامعیہ کی جگہ لینے لگی تھی۔ شرجیل سے اتنا سب سن کر بھی معافی سامعیہ نے ہی مانگی کیونکہ وہ اس کی خفگی مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔ دوسری طرف شرجیل کا رویہ اب بھی اس سے وہی تھا۔ شادی ختم ہوتے ہی وہ کام کا بہانہ بنا کر واپس آگیا تھا البتہ سامعیہ، نگہت کی مدد کروانے کو وہیں رک گئی تھی جس پہ اسے ہرگز کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے خود کو کبھی ایسا بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ تو اسے یمنیٰ کی جگہ لایا تھا۔ اس سے وہی سب حاصل کرنا چاہتا تھا پھر اچانک اسے عائشہ کو لے کر یہ احساسات کہاں سے آرہے تھے۔ کیوں وہ اس کے چہرے پہ ایک پُرسکون ہنسی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جو اس کی مدد کررہا تھا اس کا اصل مقصد عائشہ پہ دباؤ ڈالنا تھا اور وہ کسی حد تک اس سب میں کامیاب ہوگیا تھا۔ عائشہ اس کی پیش قدمی پہ مدافعت کی بجائے سر جھکارہی تھی۔ یعنی وہ اس کے اشارے سمجھنے لگی تھی تو پھر اب اور کیا چاہیے تھا۔ سوچ سوچ کر اسے لگا اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گیں اور پھر یک دم ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔

....

وہ بس سے اتر کر باقی اسٹاف کے ہمراہ آفس کے اندر آرہی تھی جب ڈرائیو وے پہ کھڑے اذان پہ نگاہ پڑی۔ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے وہ سگریٹ سلگائے وہاں کھڑا تھا۔ اذان کو دیکھتے ہی عائشہ کے کانوں میں چند روز پہلے اس کی کہی تلخ باتیں گونجنے لگی تھیں۔ جو کچھ اس نے اسے فون پہ کہا وہ ہرگز بھولنے لائق نہیں تھا۔ وہ وہاں کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا لیکن عائشہ اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کرتے سامنے سے گزر جانا چاہتی تھی اسی لیے سر جھکائے چلتی رہی لیکن اذان کی آواز پہ اس کے قدم رک گئے تھے۔

''رکو۔'' عائشہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ چند لمحوں میں فاصلہ سمٹ کر اس کے قریب آگیا تھا۔

''لگتا ہے بات تمہاری سمجھ میں آئی نہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تمہاری وجہ سے شرجیل کا گھر خراب نہیں ہونا چاہیے۔'' دھیمے مگر تلخ لہجے میں اس نے کہا۔

''میں بھلا کیوں کروں گی کسی کا گھر خراب اور آپ...... آپ ہوتے کون ہیں مجھ پہ ایسا گھناؤنا الزام لگانے والے؟'' عائشہ نے مدہم مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات بھولی نہیں تھی اور اب ایک بار وہ اس کو سامنے کھڑا ہوکر ذلیل کررہا تھا یہ بات وہ کیسے برداشت کرسکتی تھی۔

''الزام نہیں لگا رہا ہوں میں تم پہ بلکہ یقین کے ساتھ بات کررہا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں شرجیل کو وہ کبھی بھی کسی لڑکی کے لیے اتنا سنجیدہ نہیں ہوا کہ سامعیہ کو نظر انداز کرے۔'' اذان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اگر ان دونوں کے درمیان ایشوز ہیں تو اس میں میرا قصور کس طرح ہوا اذان صاحب؟'' اس نے سینے پہ ہاتھ لپیٹے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''بہت محبت کرتا ہے وہ اپنی بیوی سے، اس لیے کسی غلط فہمی میں مت رہنا کیونکہ تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔'' انگلی اٹھائے وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

"آپ اسے محبت سمجھتے ہیں تو یقیناً آپ اور وہ دونوں احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ جو شخص وفا کے مفہوم کو نہ سمجھے وہ کیا خاک محبت کرنے والا ہوگا۔" عائشہ کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ ابھری جبکہ اذان کو اس کا طنزیہ انداز بری طرح سلگا گیا تھا۔

"یہ سب تم جیسی لڑکیوں کی بدولت ہے۔ جو خود کو بازار میں رکھ کر کمزور مردوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ تم اگر اپنا دھندہ بند کردو تو شرجیل......" وہ ایک دم ہی شدید غصے میں آگیا۔

"اپنے لفظوں پہ بند باندھیں۔ آپ بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں اور مجھے آپ کی گری ہوئی سوچ پہ افسوس ہورہا ہے۔ آپ کو لگتا ہے میں یہ سب جان بوجھ کے کررہی ہوں؟" عائشہ نے فوراً اس کی بات کاٹی۔

"آپ کو کیا پتا میں خود کس مشکل میں گرفتار ہوں۔" منہ پھیرتے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اتنی نیک اور سچی ہو تو آج اور اسی وقت چھوڑ دو یہ جاب اور گھر جا کر بیٹھو۔" وہ غصے سے چلایا۔ عائشہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"کیوں...... نہیں ہوسکتا تم سے یہ سب؟" اسے خاموش پاکر اذان نے جتاتے ہوئے کہا اور عائشہ نے سر جھکا لیا۔

"تمہیں شکار چاہیے تھا اور شرجیل کو تم جیسی بدکردار اور آوارہ لڑکیوں کا ساتھ...... چلو ایک ڈیل کرتے ہیں۔" عائشہ نے نا سمجھتے ہوئے اذان کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں ایک بلینک چیک دیتا ہوں' تم اس پہ اتنی رقم لکھ لو جس سے تمہاری باقی کی زندگی آسانی سے گزر سکے اور دفع ہوجاؤ شرجیل کی زندگی سے ابھی اور اسی وقت۔" اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اذان نے ایک چیک نکالا اور عائشہ کے منہ پہ مار کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ عائشہ ششدر کھڑی رہ گئی۔

"اور ہاں...... اس کے بدلے مجھے تم سے کچھ چاہیے بھی نہیں۔" یک دم پلٹتے اس نے طنزیہ انداز میں عائشہ سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

عائشہ سن کھڑی اذان کو جاتا دیکھتی رہی۔ چند لمحے گزرے اسے پتھر بنے اور پھر اس بت میں جان آئی۔ جھک کر اس نے قدموں میں گرا وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور اسے دیکھے بنا ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔

❀......❀......❀

اس کی آنکھ اچانک ایک دھڑکے سے کھلی تھی۔ بے چینی تھی یا سینے پہ بڑھتا بوجھ، ایسے لگا اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھتے گہرے سانس لینے لگی۔

جب سے نومی نے دبئی جانے کی بات کی تھی فضیلت کا دل بری طرح بے چین رہنے لگا تھا۔ کل ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا تھا اور اس وقت سے وہ دل ہی دل میں نومی کو روکنے کے لیے منصوبے سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں دل عائشہ کی طرف سے پریشان تھا۔ اگر یہ آپریشن ناکام ہوا تو عائشہ تنہا کیسے رہے گی' کس طرح اکیلی زندگی گزارے گی' خود کو سنبھال پائے گی بھی یا نہیں؟ ایک کے بعد ایک سوچ اسے مضطرب کررہی تھیں اور ایسے میں اپنی دن بہ دن خراب ہوتی حالت اور دوائیوں کا اثر تھا کہ اس کی نیند بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ اس نے دو چار گہرے سانس لیے اور پھر اپنے حلق میں دوا کی تلخی محسوس کرتے میز پہ رکھے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گلاس خالی تھا۔

اسے یاد آیا وہ رات سونے سے پہلے پانی پی چکی تھی اور عائشہ اس گلاس کو دوبارہ بھرنا بھول گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور وہ روشنی کرکے عائشہ کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے اندازے سے چلتی کمرے سے باہر نکل آئی لیکن جیسے ہی وہ برآمدے میں پہنچی اسے حیرت ہوئی اور ہاتھ میں پکڑا کانچ کا گلاس فرش پہ گر کر کرچی کرچی ہوگیا تھا۔

وہ حیرت اور بے یقینی سے وہاں کھڑی عائشہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں، یوں جیسے وہ ابھی نہا کر نکلی ہو مگر جس بات

نے فضیلت کو چونکایا وہ اس کے جسم پہ اوڑھی بڑی سی سفید چادر تھی جسے اس نے کندھوں سے لے کر پیروں تک کفن کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو عائشہ......؟ اور...... اور...... یہ کیا پہن رکھا ہے اتارو اسے۔'' فضیلت نے تشویش سے کہتے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے جسم پہ لپٹی سفید چادر کو کھینچ کر اتارنے کی کوشش کی مگر عائشہ نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

''آپ کہتی تھیں ناں انسان روٹی کے بغیر جی لیتا ہے مگر عزت اور عزت نفس کے بغیر مر جاتا ہے۔'' اس نے فضیلت کو دیکھتے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا ہے عائشہ......تم کیا...... کر کے آئی ہو۔ بتاؤ مجھے کچھ ہوا ہے کیا؟'' ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ عائشہ کو بازوؤں سے جھنجوڑتے انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ابھی تو بس اپنی عزت نفس کو قبر میں اتارا ہے امی۔ بڑا بوجھ تھا اس کا میرے وجود پہ۔ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ موت کا سا سکون محسوس کر رہی ہوں۔'' فضیلت کے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو نرمی سے آزاد کرواتے وہ استہزائیہ انداز میں کہتی تخت کی طرف بڑھی۔

''لیکن یہ سب...... یہ سفید چادر......'' فضیلت نے پلٹ کر عائشہ کو دیکھ کر روتے ہوئے سوال کیا۔

''آج سے عائشہ مر گئی۔ اس کے وہ اصول بھی اس کے ساتھ ہی مر گئے امی۔ خودداری اور عزت نفس کی باتیں ہی بس کر پائی میں لیکن جب وقت آیا تو آزمائش کی کسوٹی پہ میری ہمت کا پلڑا ہلکا نکلا۔'' آنسو کی بوندیں اس کی آنکھوں سے گر کر سفید چادر میں جذب ہونے لگیں۔

''تم چھوڑ دو یہ نوکری۔ ہم جیسے تیسے گزار لیں گے زندگی......'' انہیں بس ایک لمحہ لگا تھا سب کچھ سمجھنے کے لیے۔ کچھ دن سے وہ عائشہ کی آنکھوں میں ایک اجنبی سا تاثر محسوس کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ دور چلی گئی تھی۔ وہ پاس بیٹھ کر بھی جیسے ان سے دور دکھائی دیتی تھی اور فضیلت کی چھٹی حس انہیں آگاہ کر رہی تھی کہ عائشہ کسی بڑی مشکل میں گرفتار ہے۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ وہ اس کی عادت سے باخبر تھیں کہ چاہے جتنی بھی ٹینشن میں ہوتی وہ بول کر اپنا غصہ نکال لیا کرتی تھی پھر بھلے اس کا کوئی حل نہ ہو مگر عائشہ زبان سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لینے والوں میں سے تھی۔ اس کی خاموشی فضیلت کو ڈرانے لگی تھی۔ آج اس کے ایک جملے نے فضیلت پہ عائشہ کی پریشانی کا مفہوم واضح کر دیا تھا۔

''اب تو فیصلہ کر چکی ہوں اور آپ جانتی ہیں میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں امی۔'' اس نے سر اٹھا کر دھندلائی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

''عائشہ...... زندگی عزت سے بڑھ کر نہیں ہوتی میری جان۔'' انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے سمجھایا۔ وہ کیا کر چکی تھی وہ نہیں جانتی تھیں، وہ کیا کرنے والی تھی انہیں نہیں معلوم تھا مگر اتنا اندازہ تھا کہ عائشہ جس راستے پہ چلنے لگی ہے وہ تباہی ہے' آگ ہے اور بس وہ اسے اس آگ سے بچانا چاہتی تھیں۔

''آپ کی زندگی اہم ہے امی اور اس کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی اٹھ کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے کمرے کے اندر چلی گئی۔ فضیلت وہیں کھڑی اسے حیران پریشان دیکھتی رہی تھیں۔

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

www.naeyufaq.com

یوں چھو کر گئی

حنا بشریٰ

مختلف رنگوں کے غبارے اور پھولوں سے سجے ہال کی خوب صورتی عروج پہ تھی۔ مزید سجاوٹ کا کام اب بھی جاری تھا...... ماہین حیات جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ملازمین کو اچھے سے کام کرنے کی ہدایت بھی دے رہی تھی۔ وہ ہر سال اپنے ادارے کے زیر اہتمام ”اسپیشل چائلڈ ڈے“ مناتی تھی۔ ان معصوم بچوں کے ساتھ سارا دن گزار کر اسے قلبی سکون ملتا تھا۔ اسے کسی کی یاد ستانے لگی جو اس کے دل کا سکون اور دل کا قرار تھی...... یادیں سوئیوں کی طرح وجود میں پیوست ہوئیں تو تکلیف سے اشک بہنے لگے۔ اذیت سے نڈھال وجود جھکنے لگا تو کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں مگر آنسو ایک تواتر سے گالوں پہ بہنے لگے تھے۔

❁ ❁

”تم پچھتاؤ گی ماہین حیات...... تنہائی تمہارا مقدر بن جائے گی تم رونے کے لیے سہارا ڈھونڈو گی مگر کوئی سہارا نہ ملے گا...... تم نے میری محبت کی ناقدری کی ہے یہ افسوس اور پچھتاوا ساری عمر تمہارے وجود کو دیمک بن کر کھائے گا پھر تمہیں میری یاد آئے گی۔“ دو برس پہلے کے الفاظ آج بھی اسے یاد تھے۔ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں...... آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے...... ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

”کتنی اچھی چیز ہے یہ ٹشو پیپر آنسو اپنے اندر یوں جذب کر لیتا ہے کہ نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا...... کاش کوئی ایسی چیز بھی ایجاد ہو جو غموں اور دکھوں کو اپنے اندر جذب کر لے۔“ ایک آہ ماہین حیات کے لبوں سے نکلی۔

”کیا وہ واقعی پچھتا رہی تھی...... کیا وہ سچ میں تنہا رہ گئی تھی؟ کیا اس نے واقعی عالیان کی محبت کی ناقدری کی تھی؟ کیا وہ دل ہلکا کرنے کے لیے سہارا ڈھونڈ رہی تھی؟ وہ اپنے دل سے سوال کرنے لگی...... دماغ کو جھنجوڑا مگر جواب ندارد...... ماضی کی سنہری یادیں اپنی بانہیں پھیلائے اس کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔

❁ ❁

وہ بھاگم بھاگ یونیورسٹی پہنچی تو ہمیشہ کی طرح عالیان کو منتظر و بے قرار پایا نہ صرف وہ اس کا کزن بلکہ منگیتر بھی تھا...... وہ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ روز ملاقات دل کو قرار اور آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی نہ ہجر و فراق کی اذیت تھی اور نہ ہی درمیان میں کوئی ظالم سماج حائل تھا۔

وہ دیر سے پہنچی تھی سو عالیان کا موڈ آف تھا۔ ماہین کی توجہ ادھر ادھر ہو اسے بالکل برداشت نہیں تھا۔ محبت کے معاملے میں وہ انتہائی شدت پسند واقع ہوا تھا...... جو محبت کرے اسے پورا وقت دو...... اس کو نظر انداز کرنا ظلم کہلائے گا...... اس نے اپنے ہی اصول مقرر کر رکھے تھے۔ جن پر کبھی تو ماہین کا دل خوشی سے سرشار ہوتا تو کبھی خوف زدہ ہو جاتا کیونکہ شدت چاہے نفرت میں ہو یا محبت میں ٹھیک نہیں ہوتی۔

”تم میری مجبوری جانتے ہو عالیان پھر بھی شکوہ......“ وہ اکثر دھیمے انداز میں گلہ کرتی۔

مگر وہ عالیان ہی کیا جو بات سمجھ لیتا...... وہ اپنے اصولوں پر ہر بات اور ہر مجبوری کو پرکھتا اور دوسرے کو مجرم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیتا۔

”ماہی...... تمہاری اولین ترجیح صرف اور صرف میری ذات ہونی چاہیے۔“ اس کی محبت بھری دھونس ماہین حیات کو خوف زدہ کر دیتی تھی۔

❁ ❁

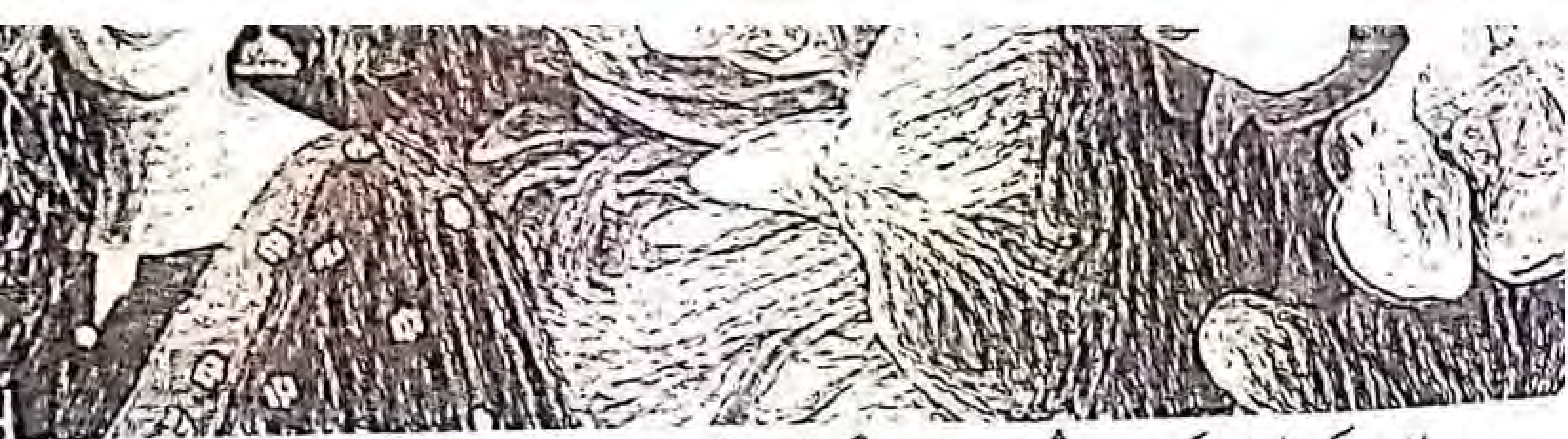

ماہین کے والدین ایک حادثے میں وفات پاگئے تو وہ اپنی نانی کے گھر آ گئی...... ماہین سے چھوٹی ایک بہن تھی فرینہ جو پیدائشی ذہنی طور پر مکمل نہیں تھی۔ چودہ سال کی لڑکی جو عام بچوں جیسی نہ تھی جسے کچھ بھی سمجھانا مشکل تھا...... جس کی دیکھ بھال کرنا کسی آزمائش سے کم نہیں تھا...... وہ جو اپنے چھوٹے سے گھر میں پُرسکون زندگی گزار رہی تھی کہ ماں باپ کی جدائی کے بعد اسے لگا وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہو...... زندگی اچانک تپتے صحرا میں آ کھڑی ہوئی...... جہاں دور دور تک کوئی سائبان نہیں تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی مگر فرینہ اس کی محبت اور توجہ کی طلب گار تھی...... وہ معصوم اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ اس کے ماں باپ چند دنوں کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں...... وہ ماما پاپا کے لیے روتی تو ماہین اسے بہلاتی...... رفتہ رفتہ وہ ماہین کی موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھنے لگی...... وہ پل بھر کے لیے بھی دور جاتی تو فرینہ رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتی۔ موت کیا ہوتی ہے فرینہ ان باتوں سے بالکل ناواقف تھی۔ ماہین ہی اب اس کے لیے ماں بھی تھی اور باپ بھی۔

والدین کی موت ماہین کو زندہ درگور کر گئی تھی۔ صدمے نے اسے اندر تک توڑ دیا تھا مگر اسے جینا تھا خود کو سنبھالنا تھا فرینہ کے لیے‘ جو اب پوری طرح اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنی بہن کو معاشرے کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنا جہاں آباد کرنے والوں میں سے نہیں تھی...... نانی نے اسے حوصلہ اور ہمت دی‘ انہوں نے اس کا تعلیمی سلسلہ دوبارہ سے جوڑا‘ اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا‘ اس مشکل وقت میں نانی کا کمزور اور بوڑھا وجود اس کی ڈھارس بنا‘ وہ جب بھی دل برداشتہ ہوتی اور تعلیم چھوڑ کر ملازمت کا ارادہ کرتی تو نانی اسے منع کرتیں اور پیار سے سمجھاتیں۔

”تعلیم تو بہت ضروری ہے آج کل کے دور میں گریجویشن تو کچھ بھی نہیں‘ ابھی تمہیں بہت پڑھنا ہے‘ معاشرے میں اپنا مقام بنانا ہے‘ اپنی بہن کا سہارا بننا ہے۔“ نانی کی باتیں اس کے اندر نئی روح پھونک دیتیں‘ اس کی سوچوں کو آہنی مضبوطی ملنے لگتی‘ اس نے سوچ لیا کہ وہ اسپیشل بچوں کے لیے کام کرے گی اور اسی مقصد کے تحت اس نے ”اسپیشل ایجوکیشن“ کا شعبہ منتخب کیا تھا۔

ایسے حالات میں عالیان کا ساتھ اس کے لیے مضبوط دیوار کی مانند تھا۔ وہ تعلیم میں اس کی مدد کرتا‘ اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ نانی گھر میں اور عالیان باہر اس کی ذات کا اہم حصہ تھے ورنہ وہ تو کب کی ڈھے گئی ہوتی اگر ان دونوں کا ساتھ نہ ہوتا۔

”فری مکمل طور پر مجھ پر انحصار کرتی ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو اور لڑکے کی نسبت لڑکی ایب نارمل ہو تو معاملے کی نزاکت بڑھ جاتی ہے۔ نہلانا‘ دھلانا‘ کھانا کھلانا‘ دوا وقت پر دینا اور خاص کر جنونی حالت میں خود پر قابو پاتے ہوئے اسے ہینڈل کرنا۔“ وہ عالیان کو سمجھاتی۔

کبھی کبھار تو وہ ان باتوں سے سمجھوتہ کر لیتا مگر بعض اوقات غصہ سے بے قابو ہو جاتا تو فون آف کر دیتا‘ بات

چیٹ بند کردیتا' ماہین کو نظر انداز کرتا اور یونی کی باقی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتا' اسے جلاتا۔ وہ شکوہ کرتی تو فوراً کہتا۔

''محبت میں سب جائز ہے محترمہ۔'' اپنا دفاع کرتے ہوئے وہ دلیل بھی پیش کرتا تھا۔

چاندنی رات میں وہ گھنٹوں باتیں کرتے' وہ جو ہر دم کتابی کیڑا بنی رہتی تو یوں عالیان کی آمد پر کھل اٹھتی۔

''وہ دیکھو ماہی...... وہ آسمان کا سب سے بڑا روشن ستارہ ہے۔'' وہ انگلی سے اشارہ کرتا۔

''عالیان مجھے تو نظر نہیں آرہا...... شاید غائب ہوگیا ہے۔'' ماہین اس کی تلاش میں ہمسفر بنتی مگر ناکام رہتی۔

''دیکھنا ماہی میں بھی اس ستارے کی طرح کسی دن کھو جاؤں گا...... تم ڈھونڈتی رہو گی مگر ڈھونڈ نہ پاؤ گی۔'' عالیان دل برداشتہ ہوکر کہتا۔

عالیان کو لگتا وہ ماہین سے یک طرفہ محبت کرتا ہے' ماہین کے دل میں اس کی محبت اس قدر نہیں جتنی وہ ماہین سے کرتا ہے' کبھی کبھی اسے افسوس ہوتا کہ زندگی کے سفر کے لیے غلط ہم سفر چن لیا ہے...... جس کی زندگی میں اس کی اہمیت برائے نام ہے۔

ماہین اس کی ان باتوں کو سنجیدگی سے لینے لگی تھی کہ محبت کے معاملے میں عالیان جذباتیت کا شکار ہونے لگا تھا' اپنے جذباتی پن میں اسے فرینہ کے وجود سے بھی چڑ ہونے لگی تھی۔

''فون کیوں نہیں اٹھایا تھا؟'' وہ غصے سے پوچھتا۔

''فرینہ کو سلا رہی تھی۔'' ماہین جواب دیتی۔

''میں کب سے تمہارے میسج کا منتظر تھا؟'' وہ شکوہ کرتا۔

''سوری عالیان...... فرینہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی بہت چوٹ لگی ہے وہ رو رہی تھی۔'' وہ مجبوری بیان کرتی۔

''ماہی...... آج میرا برتھ ڈے تھا...... میں نے سارا دن تمہارا انتظار کیا مگر تم نے وش نہیں کیا۔'' عالیان دکھی ہوتا۔

''عالیان آج فرینہ کا چیک اپ تھا بس اسی میں سارا دن گزر گیا۔'' وہ تھکی تھکی سی وضاحت دیتی۔

''فرینہ...... فرینہ...... فرینہ...... لگتا ہے تمہاری زندگی میں بس یہی ایک نام اہم ہے' میں تو تمہیں یاد تک نہیں رہتا۔'' ہمیشہ کی طرح وہ اس کی مشکلوں کا خیال کرنے کی بجائے اپنا رونا رونے لگا تو ماہین الجھ کر رہ جاتی تھی۔

وہ اپنے تئیں خود کو ملامت کرتی' اپنے معاملات کو اعتدال میں رکھنے کی کوشش کرتی مگر فرینہ کی غیر متوازن زندگی اس کی زندگی کے توازن کو بگاڑ دیتی اور وہ پھر سے مجرم بنی عالیان کے سامنے صفائیاں پیش کرنے لگتی۔

''ماہی...... تم فری کے لیے کسی نرس کا بندوبست کیوں نہیں کرلیتی؟'' ماہین کی مکمل توجہ اور محبت کے لیے عالیان اسے نئی راہیں دکھانے لگا۔

''نہیں عالیان مجھے فری کے معاملے میں کسی نرس پر بھروسا نہیں اور پھر فری مجھ سے قریب ہے' وہ مجھے مس کرے گی' میں جتنا خیال اس کا خود رکھ سکتی ہوں کوئی اور بالکل نہیں رکھ پائے گا۔'' ماہین نے اس کی تجویز رد کردی تھی۔

''ماہی' اب تو معذور بچوں کے لیے بہت سے ادارے بن گئے ہیں جہاں ان کی ذہنی نشوونما ہوتی ہے' تم فری کو وہاں داخل کروا دو اخراجات ہم مل کر افورڈ کرلیں گے۔'' عالیان نے جس لاپروا انداز میں کہا اسے بے حد صدمہ پہنچا۔ اسے لگتا مرد ہمیشہ خود غرضی سے سوچتا ہے اور ذمہ داریوں سے فرار کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا ہے...... عورت ہمیشہ اس کی پریشانی سمجھ کر سمجھوتہ کرتی ہے مگر مرد کبھی بھی معاملات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا اور نہ ہی سمجھوتہ کرتا ہے اس کے نزدیک صرف اپنی ذات اہم ہوتی ہے اور جو چیز اس کی کے راستے میں

حائل ہوا سے راستے سے ہٹانے کے لیے سو جتن کرتا ہے۔

''عالیان...... ان اداروں کا سہارا وہ لوگ لیتے ہیں جو ان ذہنی معذور بچوں کو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پھر ان پر ذمہ داری بوجھ ہوتی ہے...... اس بوجھ سے نجات کے لیے وہ ان اداروں میں انہیں داخل کروا دیتے ہیں...... مگر فری مجھ پر بوجھ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس ذمہ داری سے فرار چاہتی ہوں' یہ ذمہ داری اللہ نے مجھ پر ڈالی ہے اور اس کو سر انجام دینے کے لیے میں اپنی تمام تر توانائیاں کا بھرپور استعمال کروں گی۔'' ماہین قطعیت سے کہا تھا۔

......

اپنی بہن کا کام کر کے اسے دلی راحت ملتی تھی۔ پہلے یہ سب کام اس کی امی کرتی تھیں مگر اب وہ یہ تمام کام خوش اسلوبی سے کیا کرتی تھی۔ زندگی نے اسے بہت تلخ حقیقت سے روشناس کرا دیا تھا۔

''بیٹا بہت نیکی کا کام کر رہی ہو...... اپنی خوشیاں تیاگ کر تم فری کی پرورش کر رہی ہو اس کا صلہ نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی ملے گا۔'' نانی اس کا خلوص اور احساس ذمہ داری دیکھتیں تو سراہے بنا نہ رہتی تھیں۔

آئے روز ٹی وی اور اخبارات میں بچوں اور بچیوں کے اغوا کی خبریں اسے لرزا دیتیں۔ جن میں دماغی خلل رکھنے والی بچیاں بھی ہوتیں جو گھر سے لاپتا ہو گئی تھیں۔ ایسی خبریں ماہین کا دل دہلا دیتیں اور وہ بے اختیار سوئی ہوئی فری کا ماتھا چومتی' اسے سینے سے لگاتی جیسے ماں اپنے نومولود بچے کو سینے سے لگائے پھرتی ہے۔ وہ ہر لحہ فری کے ساتھ رہتی' اس کی چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں سنتی' فری کی باتیں زیادہ تر جانوروں پرندوں کے متعلق ہوتیں' کارٹون دیکھنے کے لیے ہر دم تیار رہتی اور ماہین اس کی خوشی میں خوش رہتی تھی۔

''آپی صرف میری ہیں...... آپ کسی اور کو فرینڈ بنائیں۔'' وہ ماہین کے ساتھ لپٹ کر عالیان سے کہتی تو ماہین اس کی محبت پر جہاں نہال ہوتی وہیں عالیان کا دل بجھ جاتا تھا۔

''ہاں کرلوں گا کسی اور سے فرینڈ شپ پھر روتی رہے گی تمہاری آپی زندگی بھر۔'' وہ جذباتی ہو کر کہتا۔

''عالیان بیٹا کیا ہو جاتا ہے' کیوں بچے بن جاتے ہو؟ نہ ماہین کی مجبوریوں کو سمجھتے ہو اور نہ ہی فری کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہو۔ بیٹا یوں ہر دم جذباتی پن کا مظاہرہ انسان کو زندگی میں تنہا کر دیتا ہے۔'' نانی جان نواسے کو سمجھاتی تھیں۔

عالیان اور ماہین کی مائیں سگی بہنیں تھیں' دونوں کا رشتہ بھی بچپن سے ہی طے تھا۔ ماہین کے والدین زیادہ دیر اس کا ساتھ نہ دے سکے مگر رشتہ ابھی بھی قائم تھا۔ عالیان کی والدہ مرحومہ بہن سے کیا گیا وعدہ نبھانے کی آرزومند تھیں مگر عالیان رفتہ رفتہ ماہین سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ نانی جان اسے سمجھاتیں تو دل کچھ سنبھلتا' منفی سوچیں مثبت رخ اختیار کر لیتیں۔ وہ اکثر سوچتا کہ وہ ماہین کے ساتھ واقعی بعض دفعہ برا سلوک کر جاتا ہے تب ہی تو ماہین کو اس کی محبت اذیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر ماہین کے سامنے اعتراف کرتا تھا۔

''میں جانتا ہوں ماہی...... میں تمہیں بہت تنگ کرتا ہوں مگر کیا کروں تم سے بے پناہ محبت جو کرتا ہوں اسی لیے محبت میں شراکت برداشت نہیں ہوتی۔'' ماہین اس کی محبت کی دل سے قدر کرتی تھی۔ خود کو خوش نصیب سمجھتی کہ کوئی اسے اتنی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ وہ اس کے سخت رویے کو نظر انداز کر دیتی' اپنے عمل اور رویے میں حتی المقدور تبدیلی لانے کی کوشش کرتی تھی۔

عالیان نے فرینہ کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھایا...... شروع میں خاصی مشکلات پیش آئیں' کیونکہ اس سے دوستی کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ فری ماہین سے بہت مانوس تھی مگر نانی جان کا حوصلہ اور ماہین کے تعاون سے اس نے فری سے دوستی کر لی تھی' وہ اس کے

لیے کھلونے لاتا' آئس کریم کھلانے لے جاتا' آؤٹنگ کرواتا' کارٹون دیکھنا۔ ماہین عالیان کی اس تبدیلی پر بہت خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

''ماہین کیوں نہ اب ہماری شادی ہوجائے۔'' عالیان نے ماہین کے قریب ہونے کے لیے نئی تجویز رکھ دی۔

''عالیان ابھی مجھے اپنی اسٹڈیز مکمل کرنی ہے' میرا مقصد حیات اسپیشل بچوں کے لیے ایک ادارہ بنانا ہے ابھی اتنی جلدی شادی کرکے تو میں یہ سب نہیں کرپاؤں گی۔'' ہمیشہ کی طرح ماہین نے اس کے سامنے اپنی مجبوری رکھ دی۔

''ماہی...... یہ سب تم شادی کے بعد بھی تو کرسکتی ہو۔'' وہ جھنجلایا۔

''عالیان شادی کے بعد تو اپنے ہی اتنے جھمیلے ہوتے ہیں ہم کسی کے بارے میں کیا سوچ پائیں گے اور پھر فری وہ یہ سب ذہنی طور پر قبول نہیں کرپائے گی۔ ماما پاپا کی وفات کے بعد اسے میں نے کتنی مشکلوں سے سنبھالا ہے' اب وہ میری جدائی کیسے برداشت کرے گی۔'' ماہین مطمئن نہ ہوئی۔

''ہم فری کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔'' عالیان نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

عالیان نے ماہین کی محبت میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دے کر اسے جیت لیا تھا۔ فری کو ساتھ رکھنے کی پیشکش پر تو عالیان کا مقام اس کے دل میں اور بلند ہوگیا تھا۔ فری کا مسئلہ حل ہوا تو ماہین کی تعلیم ادھوری تھی۔ اس کا حل نانی جان نے نکالا کہ دونوں کا نکاح کردیا جائے اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہے اور رخصتی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہوگی تو اس فیصلے پر وہ دونوں مطمئن ہوگئے تھے۔ عالیان ہردم خوش رہنے لگا تھا۔

مگر فرینہ خوش نہ تھی...... ماہین کی زندگی میں آنے والی تبدیلی پر وہ بوکھلا گئی تھی' کوئی اس کی آپی کو اس سے دور کررہا تھا۔ وہ روز بروز چڑچڑی ہونے لگی...... کبھی کھانا نہ کھاتی کبھی خود کو زخمی کرلیتی جوں جوں نکاح کا دن قریب آرہا تھا اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔

''آپی آپ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی؟'' وہ خوف سے اس سے سوال پوچھتی تو ماہین تڑپ اٹھتی۔

''نہیں میری جان...... آپی آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جائیں گی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔'' ماہین محبت سے کہتی مگر فری مطمئن نہ ہوتی۔

ماہین کو خوف آنے لگا کہ آنے والا وقت کیا دکھانے والا ہے۔ عین نکاح کے دن ماہین کی تمام جیولری گم ہوگئی' عروسی جوڑے کو بے دردی سے قینچی سے کاٹ دیا گیا تھا ماہین جانتی تھی کہ یہ سب فری نے کیا ہے لیکن وہ اسے سمجھانے میں ناکام رہی تھی مگر عالیان اس صورت حال سے واقف ہونے کے باوجود سب کچھ بہت معمولی لے رہا تھا۔

''فری آہستہ آہستہ نارمل ہوجائے گی...... ویسے بھی میں تم دونوں کو جدا تو نہیں کررہا' شادی کے بعد وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔'' عالیان اسے تسلی دیتا۔

مگر حالات سنگینی کا عندیہ دے رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا عین نکاح کے وقت ایسا حادثہ پیش آگیا جس نے بساط زیست کو الٹا کر رکھ دیا تھا۔ خون میں لت پت فرینہ کا وجود دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں' وہ سیڑھیوں سے گرگئی تھی اس کے دماغ پر سخت چوٹ آئی تھی کہ ذہنی معذور تو وہ پہلے ہی تھی اب یادداشت بھی کھوچکی تھی اور ماہین کو بھی بھول گئی تھی کہ اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا؟ ماہین کے ساتھ لپٹ کر لاڈ دکھانا بھی یاد نہ تھا بس ہر ایک کو اجنبی نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو' ماہین جو پہلے ہی فرینہ کے غم میں نڈھال تھی کہ وقت نے ایک اور وار کیا اور عالیان اسے بیچ راستے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''ماہی میں اور تم کبھی ایک نہیں ہوسکتے...... فری ہمارے تعلق کو کبھی نارمل نہیں ہونے دے گی' یہ ایب

نارمل لڑکی ہماری زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہونے دے گی اس کی وجہ سے ہمارا ساتھ چلنا انتہائی دشوار ہوگا......"

چند لمحوں میں عالیان نے بچپن سے جڑے اس رشتہ اور محبت دونوں کو توڑ کر رکھ دیا اور اپنی راہیں جدا کرلی تھیں۔

ماہین کی ذات کو عالیان کی محبت کا سہارا تھا وہ سہارا دور ہوا تو وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھی۔ اسے لگا زندگی کی ہر خوشی روٹھ گئی ہے وہ ایک بار پھر سے تہی دست ہوگئی تھی۔ کتاب زیست میں خوشی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا تھا۔ اسے امید بھی نہیں تھی کہ وہ ستم گر یوں بیچ راستے میں ساتھ چھوڑ جائے گا اور اپنا خوشیوں بھرا جہاں آباد کرلے گا۔ عالیان نے اپنی چچازاد سے شادی کی اور اسے لے کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔

زندگی پر کتاب لکھوں گی
اس میں سارے حساب لکھوں گی
پیار کو وقت گزاری لکھ کر
چاہتوں کو عذاب لکھوں گی
ہوئی برباد محبت کیسے؟
کیسے بکھرے ہیں خواب لکھوں گی
میں اس سے جدائی کا سبب
اپنی قسمت خراب لکھوں گی

"میم تمام انتظامات مکمل ہوگئے ہیں۔" کسی کی آواز اسے ماضی کی تلخ یادوں سے باہر کھینچ لائی ورنہ نا جانے کب تک وہ اپنے زخمی وجود کو خود ہی اذیت دیتی اور مرہم لگاتی رہتی۔

"ویری نائس۔" نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ مسکرائی۔

"میم بہت نیکی کا کام کررہی ہیں آپ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں مگر اوروں کے لیے جینا بڑی بات ہے یہ معذور اور معصوم بچے ان کی خوشی کے لیے یوں اہتمام کرنا انہیں یوں اپنی اولاد کی طرح محبت دینا قابل تحسین ہے۔" ماہین کی ورکر سنبل دل سے تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"میرا اولین مقصد یہی تھا کہ میں ایسے بچوں کا سہارا بنوں کیونکہ میری اپنی بہن بھی ایب نارمل ہے۔" ماہین کی آنکھوں کے گوشے پھر سے بھیگنے لگے۔

آج وہ خود کو بہت تنہا محسوس کررہی تھی۔ وہ ستم گر آج بہت یاد آرہا تھا جو اسے زندگی کے انتہائی نازک موڑ پر تنہا چھوڑ گیا تھا جب ماہین کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ نانی جان کی وفات کے بعد اس نے زندگی کی گاڑی کو کس طرح کھینچا تھا یہ بس وہی جانتی تھی۔

"میم...... جو دوسروں میں خوشیاں بانٹتے ہیں ان کا اپنا دامن کبھی سدا خالی نہیں رہتا بس وقت آنے کی دیر ہوتی ہے اور وہ جب اللہ کے حکم سے آتا ہے تو خوشیوں سے دامن بھر جاتا ہے۔" سنبل یقین سے بولی۔

متحیر نگاہوں سے دیکھتی ماہین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے لگا کہ وہ اس کے غم سے واقف ہو اور اسے تسلی دے رہی ہو۔

"میم...... کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

پیون کی اطلاع پر وہ آفس میں داخل ہوئی تو اس کے قدم ٹھٹکے اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ جس کو آج دل شدد سے یاد کررہا تھا اور آنکھیں جس کے فراق میں آنسو بہا رہی تھیں وہ ہرجائی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کتنی دیر کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اس کی نظروں کے حصار میں وہ شاید الفاظ ترتیب دے رہا تھا کہ کس طرح بات کا آغاز کرے اور وہ غموں کی ماری رونا چاہ رہی تھی شکوے کرنا چاہ رہی تھی مگر خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی۔

"کیسی ہو ماہین؟" بہت دیر بعد وہ بولا تو اسے اپنا نام اجنبی سا لگا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"بہت اچھا کام کررہی ہو...... فرینہ تمہارے ساتھ روز یہاں آتی ہے کیا؟" عالیان کے انداز میں نامعلوم

سی ندامت کی جھلک نظر آئی تو وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔
ماہین کی نگاہوں میں حیرت دیکھ کر وہ مزید شرمندہ نظر آنے لگا۔ ماہین تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے طعنے دے گا‘ اس کی تنہائی پر خوش ہوگا کہ اب پچھتاؤ مجھے کھو کر مگر ایسا کچھ نہ تھا...... عالیان کے چہرے پر اضطراب رقم تھا جسے ماہین بخوبی پڑھ رہی تھی۔
”ہاں فری میرے ساتھ آتی ہے ساتھ ہی گھر جاتی ہے۔“ ماہین کا دل چاہا کہ اس کا حال پوچھے یا پھر شکوہ کرے کہ چھوڑ کر جا چکے ہو تو پھر کیوں آئے ہو مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔
”ماہین تم مجھ سے ناراض ہو؟ کوئی بات نہیں کرو گی۔“ عالیان کو اس کی خاموشی اذیت دے رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماہین خوب لڑے‘ جھگڑا کرے اور شکوہ شکایت کرے۔ ماہین نے نفی میں سر کو جنبش دی۔
”جھوٹ بھی بولنے لگی ہو ماہی......“ اس ہرجائی نے بے تکلفی سے پکارا تو شناسائی کا زمانہ یاد آ گیا۔ جو وقت گزر گیا تھا وہ تڑپا گیا...... چاندنی رات میں جب دو نفوس ستاروں کو ڈھونڈتے تھے وہ لمحہ سہانا یاد آ گیا تو ضبط جواب دینے لگا۔ پلکوں کی باڑ توڑ کر آنسو بہنے لگے۔ اشک غم دل کی ترجمانی کرنے لگے تو وہ چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ عالیان اسے بے بس نگاہوں سے دیکھتا رہا۔
”میں تمہارا مجرم ہوں ماہین...... تمہیں اس وقت اکیلا چھوڑ گیا جب تمہیں میری سب سے زیادہ ضرورت تھی اور میں نیا جہان آباد کر بیٹھا‘ میں خود غرض ہوگیا تھا‘ میں نے تمہارے اور فری کے ساتھ زیادتی کی‘ میں نے لمحہ بھر کے لیے بھی نہ سوچا کہ تم دونوں تنہا کیسے زندگی گزارو گی۔ میں سوچتا تھا کہ تم غلط ہو...... تم میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔ ایک وقت آئے گا جب تم پچھتاؤ گی مجھے پکارو گی‘ میرے لیے تڑپو گی مگر میں غلط نکلا...... پچھتاوا تو کاتب تقدیر نے میرے حصہ میں لکھ دیا تھا۔ افسوس ندامت دن رات میرے وجود کو گھائل کرتے ہیں کہ میں جو تمہیں سزا دینا چاہتا تھا وقت نے مجھے ہی سزا دے دی اور ایسی سزا کے ساری عمر اسی میں گزرے گی۔ یوں ٹھوکر لگی ہے کہ تمہارے سامنے سوالی بنا کھڑا ہوں کہ مجھے معاف کردو......“ عالیان بولتے ہوئے چپ ہوا۔
”کیسی سزا؟“ ماہین الجھی۔
”ماہی...... شادی کے بعد اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا...... میں بہت خوش تھا مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ میری بیوی بچی کی پیدائش کے کچھ دیر بعد ہی دوسرے جہاں چلی گئی...... مجھ پر دو مصیبتیں ایک ساتھ ٹوٹی کہ بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی اور میری بیٹی وہ پیدائشی طور پر ابنارمل ہے۔“ عالیان نے دکھ سے کہا۔
”اس لمحے مجھے تمہاری اور فری کی بہت یاد آئی...... پہلی بار احساس ہوا کہ یوں زندگی گزارنا کتنا مشکل ہوتا ہے‘ تمہاری فری کے لیے وابستگی ٹھیک تھی۔ ماہی تم ٹھیک تھیں اور میں بالکل غلط۔ ذمہ داریوں سے فرار کا نام زندگی نہیں ہے‘ زندگی تو وہ ہے جو تم گزار رہی ہو...... اپنی بہن کے لیے جی کر اور ایسے معذور بچوں کے لیے جی کر۔“ عالیان خاموش ہوا‘ اس کے چہرے پر شکستگی کے آثار تھے‘ وقت نے ایسی ٹھوکر لگائی تھی کہ وہ مجرم بنا ماہین کی عدالت میں کھڑا تھا...... وہ لڑکھڑا رہا تھا‘ اب اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ ندامت کے بوجھ تلے اپنا وجود سنبھالنا بھی دشوار ہوا جا رہا تھا۔
”ایسا غم ملا ہے کہ جان جلتی رہتی ہے...... یوں ٹھوکر لگی کہ پہروں رلاتی ہے...... نہ کوئی غم رفیق ہے اور نہ کوئی غم گسار جو مجھے حوصلہ دے۔ میری بیٹی معاشرے پر بوجھ ہے بالکل بیکار اور فضول۔ مجھے بھی لوگوں نے وہی مشورے دیئے جو فری کے حوالے سے میں تمہیں دیتا تھا مجھے اپنی سنگ دلی یاد آتی ہے کہ کیسے بے رحمی سے تمہیں کہتا تھا کہ فری کو خصوصی بچوں کے ادارے میں داخل کردو اور اب مجھے کوئی کہتا ہے تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے‘ اپنی بیٹی کی بے بسی پر دل خون کے آنسو روتا ہے‘ ابھی تو وہ چھوٹی ہے بڑی ہوگی تو اسے کیسے سنبھالوں گا؟“ عالیان

بے حد پریشان تھا۔

مجرم خود اقرار جرم کررہا تھا جسے وقت نے سزا دے دی تھی اور جسے وقت سزا دے اسے مزید سزا دینا کسی انسان کو زیب نہیں دیتا۔ آج اسے سہارے کی ضرورت تھی' مرد کی فطرت ہرجائی ہے مگر عورت...... جس کی ذات کا خمیر گوندھا ہی وفا سے گیا ہے۔

''تمہاری بیٹی کہاں ہے عالیان؟'' ماہین نے ایک بار پھر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا کہ وہ صرف فری نہیں بلکہ عالیان کی بیٹی کے لیے بھی اتنی ہی مہربان ہے۔

ہر شکوہ دل سے نکال کر اس نے اپنا وسیع دامن پھیلا دیا محبت کا ظرف بلند تھا عالیان دنگ رہ گیا۔ جسے دعویٰ تھا کہ وہ ماہین سے بھی زیادہ اس سے محبت کرتا ہے مگر اس کی محبت عالیان کی محبت سے کئی گنا عظیم تھی جس میں نفع اور نقصان نہیں دیکھا جاتا کہ انسانیت کی معراج ہے دوسروں کے دکھ دور کرنا۔

ماہین کی بے مثال محبت نے ثابت کردیا تھا کہ اس کی محبت نہ تو کم ظرف ہے اور نہ ہی منتقم۔

سیاہ آسمان پہ چمکتے دمکتے ستارے چاندنی رات کے حسن کو دوبالا کیے ہوئے تھے۔ لان کی سیڑھیوں میں بیٹھے دو نفوس محو گفتگو تھے۔

''عالیان...... بتاؤ ناں وہ ستارہ کہاں ہے جسے تم اکثر ڈھونڈا کرتے تھے؟'' ماہین کی نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں جو ستارے کی کھوج میں تھیں۔

''یہ ہے...... وہ یا پھر وہ سب سے دور جو بہت زیادہ روشن اور چمک دار ہے۔'' انگلی کے اشارے سے اس نے ان گنت ستاروں کی جانب اشارہ کیا۔ آج وہ ڈٹی ہوئی تھی کہ اس ستارے کو تلاش کرکے دم لے گی جس کی تلاش کسی زمانے میں عالیان کیا کرتا تھا اور اکثر ماہین سے جھگڑا بھی کیا کرتا تھا۔

''ماہی...... اب وہ ستارہ آسمان پر نہیں ہے۔'' عالیان نے مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ حیران نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''کیا...... مطلب؟'' استفسار میں ناسمجھی واضح تھی۔

''مطلب یہ کہ اب وہ ستارہ میری جھولی میں آ گرا ہے...... میرے مقدر کا ستارہ بن گیا ہے...... میرے لیے وہ اللہ کی خاص عطا ہے۔'' وہ اس کا نرم وملائم ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''سیدھی طرح بتاؤ...... زیادہ شاعر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماہین نے نروٹھے پن سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا اور دوبارہ سے آسمان کی جانب دیکھنے لگی' چاند کی روشنی اس کے صبیح چہرے کو جگمگا رہی تھی۔

''وہ ستارہ تم ہو ماہین...... روشن اور سب سے چمک دار...... جس نے میری زندگی کے اندھیروں کو دور کردیا اور چار سو روشنی ہی روشنی پھیلا دی...... میں بدنصیب تھا جو تاریکی میں بھٹک رہا تھا اور روشنی کی تلاش میں ناجانے کہاں نکل گیا تھا جبکہ تم تو ہمیشہ سے میری زندگی میں تھی میں صرف دعویٰ کرتا تھا مگر ماہین تم نے تو محبت کرکے دکھائی ہے۔ محبت وہ نہیں ہوتی جو ہم سمجھ لیتے ہیں بلکہ محبت تو وہ ہوتی ہے کہ زندگی کے سفر میں باقی رشتوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں اور کسی کی بھی حق تلفی نہ ہو۔'' عالیان نے درپردہ فرینہ اور اپنی بیٹی کا ذکر کیا جسے ماہین نے ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

عالیان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں...... وارفتگی جھلکنے لگی تو حیاء کے نکھرے رنگ اس پر قوس وقزح کی طرح نظر آنے لگے تھے۔

www.naeyufaq.com

قسط نمبر 26

عشق دی بازی

ریحانہ آفتاب

(گزشتہ قسط کا خلاصہ)

ایشان جاہ کی حرکت کی بنا پر ماورا ایجی کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ انوشا اور یاسر ماورا کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ماورا بہن کے سسرال جانے پر ہچکچاہٹ کا شکار ہوتی ہے۔ شنائیہ بھوک سے مجبور ہو کر کھچڑی پکاتی ہے اور پھر اپنی اس کامیابی پر شاہ زرشمعون کو کھچڑی پیش کرتی ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ مری پہنچ کر فائزہ اپنے رشتے داروں کے یہاں چلی جاتی ہیں جبکہ سمہان، ندا اور عیشال کو لے کر کاٹج آ جاتا ہے۔ عیشال جہانگیر کا نیا ہی روپ سمہان اور ندا کے سامنے آتا ہے۔ چودھری جہانگیر صہبا سے ماورا کے گھر جانے کی بابت پوچھتے ہیں۔ تب وہ اپنا دہاں جانا اور ماورا اور منزہ کو باتیں سنانا بتا دیتی ہیں۔ چودھری جہانگیر انہیں ماورا کے لیے کمرہ سیٹ کرنے کا کہتے ہیں۔ انوشا کو رات کے کھانے پر منزہ یاد آتی ہے کہ کیسے وہ ایشان جاہ کو اس کی شادی پر اہمیت دے رہی تھیں تب ہی وہ یاسر کے ہاتھ ایشان جاہ کو چائے کا کپ اور کچھ کھانے کے لیے بھیجتی ہے۔ اس کی ہمدردی پر ایشان جاہ بھی حیران رہ جاتا ہے۔ شاہ زرشمعون گھر کو باہر سے تالا لگا کر چلا جاتا ہے تب شنائیہ کو باہر آہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ مدد کے لیے پکارتی ہے۔ دوسری طرف موجود شخص تالا توڑ دیتا ہے پر تب ہی شاہ زرشمعون آ جاتا ہے اور وہ شخص سر جھکا کر احترام سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ شاہ زرشمعون غصے سے شنائیہ کو زنجیر سے باندھ دیتا ہے۔ مری آ کر عیشال اور سمہان آفندی کو اپنی محبت کا اظہار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ندا بھی ان کے راز سے واقف ہو جاتی ہے جب ہی انہیں تنہائی میسر کر دیتی ہے۔ عیشال جہانگیر نے برات کا جوڑا بھی خرید لیا تھا۔ چودھری جہانگیر کو فون آتا ہے اور ماورا کے حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن کے سسرال جا رہی ہے اور ایشان جاہ اس کے گھر کے سامنے دھرنا دیے بیٹھا ہے چودھری جہانگیر کو تشویش ہوتی ہے۔ ایشان جاہ ماورا ایجی کو جاتا دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے اور گھر لوٹ آتا ہے۔ چودھری جہانگیر اس سے ماورا کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور پھر اس کو لے کر انوشا کے سسرال پہنچ جاتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

"اماں میں نے آپ جیسی سادہ عورت نہیں دیکھی، بہو کو آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور آپ نے اس کی بہن کو بھی گھر میں رہنے کی اجازت دے دی، وہ بھی خوشی خوشی۔ میں بتا رہی ہوں آپ کو کہ اتنی بھی دریا دلی اچھی نہیں ہوتی۔ اجنبی لوگ ہیں، نجانے کس سے دوستی اور کس سے دشمنی ہو آپ نے بنا تحقیق کے اسے گھر میں جگہ دے دی۔ مجھے اچھا نہیں لگا آپ کا یہ عمل۔" یاسر کی بہن شفیق ماں کے سامنے ناگواری کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ سکھر میں رہتی تھی۔ شادی میں نہ آسکی تھی، اب بچوں کو امتحان سے فرصت ملی تو وہ میکے آئی تھی تاکہ بھابی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار سکے پر یہاں تو معاملات ہی کچھ اور نظر آ رہے تھے۔

"بات تمہاری بھی ٹھیک ہے لیکن منزہ بہن کی اچانک موت پر اکیلی بچی کہاں رہے گی، اسی لیے انوشا اسے ساتھ

لے آئی ہے۔'' یسریٰ نے طرف داری کی۔
''ارے خاندان میں کوئی تو ہوگا' کوئی چچا' پھوپا' ماموں وہ رکھے' ہم کیوں پرائی جوان لڑکی کو گھر میں جگہ دیں۔'' اس کے لہجے میں ناگواری سی ناگواری تھی۔
''کوئی نہیں ہے' منزہ بہن نے تو یہی بتایا تھا۔'' یسریٰ دکھی تھیں۔
''یہ لو..... تو کیا ماں بیٹیاں آسمان سے ٹپکی تھیں؟ ہو نا ہو اماں مرنے والی تم سے جھوٹ بول گئی ہیں۔ ایسا کون سا انسان ہے جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو یا تو لوگ بدل جاتے ہیں یا زندوں کو مار دیا جاتا ہے لیکن ان سب میں ہمارا کیا قصور؟ ہم کیوں پرائی آگ اپنے گھر میں لگائیں۔ زمانہ تو ویسے ہی کان کھڑے کیے بیٹھا ہے کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو کس کس کو جواب دیتی پھریں گی اور پھر محلے والے انہیں کیا جواب دیں گی کہ کب تک پرائی بچی کو اپنے گھر رکھیں گی؟ اس کی شادی' اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے یہ بھی تو سوچیں۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو میں بھی چپ رہتی لیکن پرائی لڑکی کو کب تک گھر رکھ سکتے ہیں ہم۔ بہن کو لانے کی بات کرنے سے پہلے بھابی کو بھی احساس کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھی۔ اسی وقت باہر گاڑی اور رکشہ رکنے کی آواز آئی تھی۔
''لگتا ہے وہ لوگ آگئے۔ دیکھو ان کے سامنے کچھ نہ کہنا موقع دیکھ کر بات کریں گے۔ پرائی بچی کا معاملہ ہے رسک تو میں بھی نہیں لے سکتی۔'' تنبیہہ کرتی یسریٰ دروازے کی جانب دیکھنے لگیں۔ دروازہ کھلا اور انوشا ماورا کے ساتھ داخل ہوئی۔
''السلام علیکم!'' دونوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔
''وعلیکم السلام! یاسر کہاں رہ گیا' کیا بائیک پر آرہا ہے؟'' یسریٰ نے ہی استفسار کیا۔ شفق تو سنجیدہ کھڑی ماورا کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔
''ساتھ ہی آئے ہیں' سوزوکی سے سامان اتروا رہے ہیں۔'' انوشا نے دھیرے سے کہا۔
''سامان.....! کیسا سامان؟'' شفق چونکی۔
''ہمارے گھر کا سامان' ماورا یہیں رہے گی تو.....'' انوشا کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ شفق نے فوراً کہا۔
''بہن کچھ دنوں کے لیے رہنے آئی ہے' وہ تو ٹھیک لیکن یہ سامان ساتھ لانے کی کیا تک بنتی تھی؟ اس چھوٹے سے گھر میں جگہ ہی کہاں ہے بھابی جو آپ مزید کباڑ خانہ بنانے کو سامان ساتھ اٹھا لائیں۔'' انوشا ایک دم سے پھیکی پڑ گئی۔ ماورا کو اس کے شرمندہ ہونے پر افسوس ہونے لگا کچھ دنوں کا کہہ کر الگ جتا دیا گیا کہ مستقل رہنے کا خواب نہ دیکھیں دونوں بہن۔
''گھر خالی کرنا تھا تو سامان کہاں جاتا' کافی ساری چیزیں تو ہم نے کباڑیے کو دے دیں بس کچھ ضروری سامان تھا تو ساتھ لانا پڑا۔'' انوشا نے صفائی دی۔ اسی اثناء میں یاسر محلے کے لڑکوں کو ملا کر سامان اندر لانے لایا۔
''دیکھ لیں اماں ضروری اشیاء لگتا ہے میں ہی غلط موقع پر آگئی' گھر میں پہلے ہی میرے بچوں کے لیے جگہ تنگ ہورہی تھی باقی کی رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔'' شفق یسریٰ کو ٹہوکا دے کے رہ گئیں۔ اسی دوران یاسر کا بڑا بھائی بھی آگیا۔ ماورا اسٹور میں رہے گی یہ سن کر وہ عجیب نظروں سے ماورا کو دیکھنے لگا تھا۔

وہ اب دن اور رات کا شمار کرتی دنیا سے کٹ کے ایک قیدی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ وہ کم ہی گھر میں نکلتا تھا' اسے ضروری سامان دے کہ باہر نکل جاتا تو اس کی واپسی دیر سے ہی ہوتی تھی' گویا وہ اسے تنہائی کی مار بھی مار رہا تھا

اور وہ چپ چاپ اس کا ہر وار سہ رہی تھی۔ پہلے پہل تو دو بدو جواب دیتی تھی لیکن جب سے اس نے بول چال بند کی تھی تب سے وہ بھی بلاضرورت اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ وہ غرور میں جی رہا تھا تو وہ کب اس سے بات کرنے کے لیے مری جا رہی تھی۔

''شنائیہ جی..... آپ میری آواز سن رہی ہیں؟'' وہ اس وقت سالن پکانے میں مصروف تھی جب اسے پکارا گیا تھا۔

''شنائیہ جی! آپ کہیں تو میں آپ کے لیے لوگوں کو اکٹھا کروں' انہیں بتاؤں کہ آپ کو یہاں قید میں رکھا گیا ہے؟ یہاں سے آپ باآسانی نکل جائیں گی' آپ سن رہی ہیں میری آواز؟'' دلی دبی آواز پھر سے آئی لیکن وہ گونگی' بہری بنی اپنا کام کرتی رہی' شاہ زر شمعون اس وقت گھر میں نہیں تھا اور تالا دیکھ کر ہاشم کی ہمت بندھی تھی لیکن وہ لب سیے' کان بند کیے اسے نظر انداز کرتی رہی' ان عارضی سہاروں کو اس نے اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی تراکیب اس نے سوچنا بند کردی تھیں۔ بس ایک ہی ضد تھی کہ جیسے وہ یہاں لے کر آیا ہے خود ہی اسے واپس لے کر جائے گا۔ وہ اپنی ضد دکھا رہا تھا تو وہ بھی اپنا ضبط آزما رہی تھی۔

❁.....✿.....✿.....❁

ابھی تو انوشا کو ٹھیک طرح سے سسرالی رشتوں اور ان کے مزاج کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اسے ماورا کو بھی ساتھ لانا پڑ گیا تھا۔ گھر میں جگہ کی تنگی اور یسریٰ بیگم کی سرسری تشویش نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ ماورا کا یہاں آنا کسی کو اچھا نہیں لگا ہے' یاسر نے ساتھ لایا ضروری سامان اسٹور میں سیٹ کردیا تھا اور اب ان چاروں ماں' بہن' بھائیوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ یاسر کا بڑا بھائی زاہد ضروری معلومات لے رہا تھا۔ اس کی دو شادی ہوئی تھیں اور دونوں ہی بیوی طلاق لے کر جا چکی تھی۔

انوشا چائے لے آئی لیکن اسے دیکھتے ہی جیسے سب چپ ہوگئے تھے' وہ سمجھ گئی کہ ان کے حوالے سے ہی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنا اور ماورا کی چائے لے کر اسٹور تک آئی تو باہر سے ہی ضرب لگانے کی آواز آنے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' ماورا کو پتھر سے صندوق کا تالا توڑتے دیکھ کر انوشا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''چابی جانے کہاں رکھ دی ہے' مل کے نہیں دے رہی۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم رہنے دو' یاسر سے کہہ کر تالا تڑوا دوں گی یا پھر کسی چابی بنانے والے کو لے آئیں گے۔ آؤ چائے پی لو۔ سموسے بھی گرم ہیں۔'' انوشا نے اسے باز رہنے کا عندیہ دیا۔

''کتنا بوجھ ڈالو گی یاسر بھائی پر' اچھا تھوڑی لگتا ہے۔'' وہ متفکر ہوئی۔

''بوجھ کی کیا بات ہے۔ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ تم اتنا مت سوچو۔ آ کے بیٹھو یہاں۔'' احتیاط سے بیٹھتے انوشا نے ٹرے رکھی۔

''آتے ہی صندوق کھولنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' وہ بھی تھک ہار کے بیٹھ گئی تھی۔ چائے اور سموسے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے انوشا نے سوال کیا۔

''اماں نے میرے لیے جو گولڈ کا سیٹ رکھا تھا' وہ اسی میں ہے۔ سوچتی ہوں اسے بیچ کر ہاسٹل میں کمرہ لے لوں اور ساتھ ہی جوئی جاب بھی دیکھنا شروع کردوں۔''

''تم ہاسٹل میں رہو گی' جاب کرو گی؟'' انوشا کو جیسے صدمہ پہنچا۔ اس کی حیرانگی پر ماورا کو جانے کیوں غصہ آنے لگا۔

''خود فریبی کی دنیا سے نکل آؤ انوشا' ہمیں اب خود کو مضبوط رکھنا ہے۔ تمہاری شادی خیر سے ہوگئی ہے' تم اپنے گھر کی ہوگی ہو لیکن میری وجہ سے تمہارے گھر کا ماحول خراب ہو یا تمہاری شادی شدہ زندگی متاثر ہو ایسا میں کسی طور ہونے نہیں

دوں گی۔ تمہاری ضد پر میں تمہارے ساتھ یہاں آ تو گئی ہوں لیکن آتے ہی جس قسم کا اندازہ ملا کیا اس کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے سسرال میں میں بے غیرتی کی زندگی گزارتی رہوں گی؟ ان سب کا رویہ ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے وقتی طور پر یہاں رہنا تھا جب تک کہ ہاسٹل میں رہنے کا انتظام نہیں ہو جاتا لیکن اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں یہاں زیادہ دن رکوں۔ تم بھی جذباتی ہونے کی بجائے حقیقت پسندی سے سوچو...... دو دن کی بات اور ہوتی ہے لیکن غیر معینہ مدت کے لیے مناسب نہیں۔ ان سب کی طرف سے میرے لیے دل خراب کرنے کی بجائے تم اس گھر میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرو۔ میں جہاں بھی رہوں گی تم سے رابطے میں رہوں گی ہم سگی بہنیں ہیں کوئی غیر تو نہیں کہ دور رہ کے ہمارا رشتہ ختم ہو جائے گا۔" انوشا کا جذباتی پن ختم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے سختی سے باز رہنے کو کہتی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات کے باعث انوشا کی نئی زندگی پر اثر پڑے نہ ہی اس کی خودداری کو اجنبی لوگوں کا احسان گوارا تھا۔ اکیلے گھر میں رہنا تو کسی طور مناسب نہیں تھا۔ وہ نوکری ملنے کے بعد ہاسٹل کا انتظام کرنا چاہتی تھی لیکن ایشان جاہ کے عمل نے جیسے پل بھر میں سب تلپٹ کر دیا تھا۔ اس کے باعث احسان مندی کے بوجھ تلے کچھ دن گزارنا اس کی مجبوری بن گئے تھے۔ تب ہی اس نے یہ سب پلک جھپکتے سوچ کر فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ انوشا سر جھکا گئی تھی۔

تب ہی اسٹور کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں متوجہ ہوئیں۔ آنے والا یاسر تھا جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"تم لوگوں سے کوئی ملنے آیا ہے باہر آؤ۔" انوشا کے سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

دونوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں یہاں آئے انہیں چند گھنٹے نہیں گزرے تھے ان سے ملنے کون آ گیا تھا۔

......

حیران پریشان وہ دونوں باہر نکلیں۔ یاسر کی معیت میں چھوٹے سے لاؤنج جسے ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا میں پہنچنے تک دونوں متجسس رہیں۔ یسریٰ بیگم اور شفق کی موجودگی میں چودھری جہانگیر اور ایشان جاہ کو دیکھ کر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھٹک گئیں۔ کچھ گھنٹے پہلے ہی تو وہ انہیں گھر کے باہر ملا تھا اور اب یہاں والد محترم کے ساتھ موجود تھا۔

"جی......" انوشا نے ہی ہمت کی اور سوالیہ نظروں سے چودھری جہانگیر کے بعد ایشان جاہ کو دیکھنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔" چودھری جہانگیر ان دونوں سے یوں مخاطب تھے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔

"انوشا...... گھر میں اب تم ہی بڑی ہو اور ماورا کے سلسلے میں ہمیں تم سے ہی بات کرنی ہے میں ایشان اور ماورا کا نکاح اس ویک اینڈ پر رکھ رہا ہوں منزہ کی بھی دلی خواہش تھی کہ ایشان جاہ اس کا داماد بنے اب اس خوشی کو دیکھنے کے لیے وہ ہمارے بیچ موجود تو نہیں لیکن ایسا ہو جانے کے بعد اس کی روح کو بہت سکون ملے گا۔ میں چاہتا ہوں نکاح کی تقریب ہمارے گھر میں انجام پائے۔ ماورا بیٹا چاہو تو ابھی ہمارے ساتھ چلو ورنہ جب دل ہو ایشان کو کال کر دینا یہ تمہیں آ کر لے جائے گا۔" چودھری جہانگیر نے سنجیدگی سے کہا تو ماورا سمیت انوشا بھی انہیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ رشتہ دینے یا نکاح کی پیشکش لے کر نہیں بلکہ انہیں مدعو کرنے آئے تھے۔ یاسر بھی چونک کر ان کو دیکھنے لگا کیونکہ ایک وہی حقیقت سے واقف تھا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی خبر سنائی آپ نے بجا فرمایا آپ نے ایشان بیٹے نے جب ماورا کا رشتہ مانگنے کے لیے منزہ کے سامنے بات رکھی تھی کہ وہ اپنے والدین کو جلد لائے گا تو میں اور میرا بیٹا یاسر دونوں ہی موجود تھے ٹھیک کہا آپ نے منزہ بہن بہت خوش ہوئی تھیں ماورا کے لیے انہوں نے ایشان کو ہی سوچ رکھا تھا اور جب وہ نہیں ہے اور ماورا اکیلی رہ گئی ہے تو آپ نے بروقت فیصلے کو عملی شکل دے کر قابل تحسین کام سر انجام دیا ہے۔ یقیناً منزہ بہن کی روح خوش ہو رہی ہوگی۔

ایشان بیناز بان کے پکے نکلے تم تو۔'' کبریٰ بیگم جو اس واقعے کی چشم دید گواہ تھیں بے حد خوش ہوئیں۔ دونوں ماں بیٹی چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ شفق کچھ شک و شبے لیے ماورا اور ایشان کا موازنہ کررہی تھی۔ سلمیٰ بیگم بھی کی نظروں سے ماورا کو دیکھ رہا تھا تو وہاب بھی کچھ دیر بعد پلٹ گئی۔ انوشا کے سسرالیوں کے سامنے یہ کہہ کر وہ کسی کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

''لگتا ہے شرما گئی۔ انوشا مہمانوں کو چائے پلا دو بیٹا۔'' کبریٰ بیگم نے انوشا سے کہا۔

''چائے کا تکلف نہ کروانوشا بیٹا آپ سب نکاح پڑھا گئیں ہم ان شاء اللہ ساتھ بیٹھ کر ذکر کریں گے اب اجازت دیجیے ہمیں۔'' انوشا کا بابا بیٹے کو دیکھ رہی تھی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا ایشان جانے گزرتے ہوئے ایک نگاہ ڈالی اور اس ایک نگاہ کی التجا وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ یاسر سے ہاتھ ملاتے اس نے دیکھتے سے کچھ کہا اور یاسر نے بھی اس کا شانہ تھپتھپا کے جواباً کچھ کہا تھا غالباً اتنی جلدی پیش قدمی پر سراہا ہوگا۔ انوشا اپنا چکراتا سر بمشکل تھامے دیوار سے لگ گئی تھی۔

☙……✿……✿……❧

''جی چچی جان…… ہم خیریت سے ہیں۔ جی……'' وہ کمرے میں کسی کام سے آئی تو اسے فون پر مصروف پاکر تکیے درست کرنے لگی۔

''جی نہیں موجود ہے لیجیے بات کریں۔'' غالباً اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی جب ہی وہ فون اس کی طرف بڑھا گیا۔

''چچی جان لائن پر ہیں بات کرلو۔'' بنا کوئی سوال کیے وہ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو خفگی سے دیکھ رہی تھی یہ جتانا اسے بتانا پڑا اور دوسری طرف موجود ہستی کا سن کر وہ کمال لاپروائی سے چادر جھاڑ کر لیٹ کر اسے خود بتا ان کی واضح اشارہ تھا کہ وہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ شاہ زر شمعون نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی۔

''وہ واش روم میں ہے چچی جان میں بعد میں بات کرواتا ہوں آپ کی۔'' اسے بات تو بتانا تھی یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کی بدتمیز بیٹی نے کال کا سن کر منہ پھیر کر سونے کو ترجیح دی ہے پھر الوداعی کلمات کہہ کر اس نے کال بند کردی تھی۔

''کیا گھٹیا حرکت ہے یہ؟ تمہاری ماں تھی کال پر۔'' کال بند کرکے وہ کمبل ایک جھٹکے میں اس پر سے کھینچ گیا تھا۔

''میں تم سے بات کررہا ہوں بات کیوں نہیں کی تم نے؟'' جواب نہ پاکر وہ چراغ پا ہوا آواز پہلے سے اونچی ہوئی لیکن وہ خاطر میں لائے بنا دوپٹے کو جب جھٹکے سے کھول کر خود پر ڈالنے لگی تو شاہ زر شمعون نے کمبل اٹھا کر اس کا گولہ سا بنا کر اس کے وجود پر دے مارا تھا۔ شاہ زر شمعون کے لیے وہ صحیح معنوں میں لوہے کے چنے ثابت ہورہی تھی۔

☙……✿……✿……❧

''تم اور تمہاری بہن پاگل ہو جو اتنا اچھا رشتہ ٹھکرا رہی ہو۔ جاؤ اور اسے تیار کرو اس رشتے کے لیے۔'' انوشا کے دبے دبے احتجاج پر یاسر نے دوٹوک لہجے میں کہہ کر اسے ماورا کے پاس بھیجا اور ماورا اسے دیکھتے ہی اپنے اندر کا غبار نکالنے لگی۔

''دیکھا تم نے ان باپ بیٹے کی ہمت ہمارے پیچھے یہاں تک چلے آئے۔'' انوشا نے اپنے پیچھے اسٹور کا دروازہ بند کردیا تاکہ آواز باہر نہ جاسکے۔

''اب……'' انوشا اس کا جواب جاننا چاہ رہی تھی۔

''اب کیا مطلب اب...... کیا تم بھی چاہتی ہو کہ میں اماں کے قاتلوں کے گھر جا کے ہنسی خوشی رہنے لگوں؟'' ماورا نے الٹا انوشا سے سوال کیا۔

''ماورا...... میں بھی تمہاری طرح ان لوگوں کے لیے مشکوک رہی ہوں لیکن مجھے یہ بھی نہیں بھول رہا کہ ایشان جاہ کے اقرار پر اس دن اماں کس قدر خوش ہوئی تھیں۔ بچپن سے غیر مرد کا داخلہ ہمارے گھر ممنوع ہونا اور پھر اچانک ایشان جاہ کے لیے سارے در وا کر دینا کوئی نہ کوئی بات تو یقیناً ایسی ہوگی ناں ایشان جاہ میں کہ اماں نے سارے اصول کہیں پس پشت ڈال دیے تھے۔ میری شادی میں تمہارے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہر جگہ ایشان کو پیش پیش رکھا تھا۔ بھلے ایشان نے اس وقت بدلے کی آگ میں اپنے والدین کو بھیجنے کی بات کی ہو لیکن اب ایشان کا اپنے والد کو لے کر یہاں آنا' کیا یہ سب کافی نہیں کہ اسے تمہاری فکر ہے' تمہاری تنہائی کا خیال ہے اور پھر چودھری جہانگیر کا تمہیں اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کیا یہ سب ظاہر نہیں کر رہا کہ ان باپ بیٹے کے لیے تمہارا طلب گار بن کے آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' انوشا نے کڑی سے کڑی ملائی۔

''بہت اچھے۔ یعنی تم بھی متاثر ہوگئیں اور اب تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ اس بہانے تم مجھے جلد ہی اپنے سسرال سے رخصت کر پاؤ گی تو فکر نہ کرو ویک اینڈ تو ابھی دور ہے میں کل پرسوں تک ہاسٹل میں اپنے رہنے کا انتظام کر کے خود یہاں ہی چلی جاؤں گی۔'' وہ برا مان گئی۔

''شٹ اپ ماورا...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میری نیت پر شک کرو گی۔ منفی سوچتے سوچتے تم میرے بارے میں بھی قیاس آرائی کرنے لگی' ماں کا ابھی چہلم نہیں ہوا اور خونی رشتوں میں منفی سوچ آ گئی...... ویلڈن۔'' انوشا کو اس کا بے اعتبار کرنا بے حد کھلا جس کا اس نے برملا اظہار بھی کر دیا۔

''سوری...... شاید میں کچھ زیادہ تلخ ہوتی جا رہی ہوں' کسی اور کا غصہ تم پر نکل گیا۔'' ماورا کو بھی اپنے لہجے کی بدصورتی کا احساس ہوا تو اس نے معذرت کرنے میں دیر نہیں کی۔

''رہو یہاں آرام سے جب تک دل چاہے' دیکھتی ہوں کون کچھ کہتا ہے تمہیں یہاں۔ صبح میں خود ایشان جاہ کو کال کر کے منع کر دوں گی' ساتھ ہی وارن بھی کر دوں گی کہ اگلی بار ہمارے دروازے تک آیا تو اگلی بار میڈیا لے کر میں خود اس کے سرکاری باپ کے آفس اور پھر گھر پہنچوں گی۔'' انوشا کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا' ماورا بھی چپ رہ گئی تھی۔

''کہاں سے آمد ہو رہی ہے آپ باپ بیٹا کی؟ اور تم کہاں رہے رات بھر' دن کو آئے بھی گھر اور چینج کر کے پھر نکل گئے۔'' صہبا اور نرمین انہیں لاؤنج میں ہی مل گئی تھیں۔ باپ بیٹے کو ایک ساتھ آتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے انہوں نے ایشان سے استفسار بھی کیا۔

''بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی تیاری کرو' فی الحال تو ویک اینڈ کو نکاح ہے۔ نکاح ہو جائے پھر شادی کی تیاری شروع کر دینا' مشکل سے پندرہ بیس دن کا وقت ملے گا تمہیں شادی کی تیاری کے لیے' بہتر ہے ابھی سے تیاری شروع کر دو۔'' چودھری جہانگیر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دھماکا کیا۔

''ویک اینڈ کو ایشان کا نکاح......! کس کے ساتھ' کن لوگوں میں؟'' صہبا کی آنکھیں حیرت کے باعث پھیل گئی تھیں۔

''ماورا کے ساتھ...... بتایا تو تھا تمہیں اس کے لیے روم تیار کروانے کو کہا بھی تھا وہ اب مستقل ہمارے ساتھ رہے گی۔'' چودھری جہانگیر مطمئن سے انداز میں کہتے نرمین کا ہاتھ محبت سے تھام گئے۔

"ماورا...... !ماورا سے ایشان کا نکاح؟" ماں بیٹی چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں' ابھی دونوں بیٹھی اسی موضوع پر بات کر رہی تھیں اور بھائی و بھو بننے کا سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔

"جہانگیر......! اگر آپ کو اس کی ماں کی موت کا سن کر افسوس ہوا ہے اور اس کی تنہائی کے خیال سے آپ ایسا کوئی فیصلہ کر رہے ہیں تو مجھ پر چھوڑ دیں میں اپنے سرکل میں کسی اچھے لڑکے سے اس کی شادی کرا دوں گی لیکن آپ میرے ایشان کو تو قربانی کا بکرا مت بنائیں۔" صہبا کو جوا گا انہوں نے وہ کہہ دیا۔

"بیگم...... مجھ پر الزام لگانے سے پہلے آپ بکرے سے بھی پوچھ لیں کہ وہ بھی خوشی قربان ہو رہا ہے یا میں نے کوئی زبردستی کی ہے۔" چودھری جہانگیر کا معنی خیز لہجہ صہبا کو بے یقینی سے ایشان جاہ کی طرف متوجہ کر گیا تو وہ ہنس دیا۔

"جہانگیر سچ کہہ رہے ہیں ایشان؟ تمہیں انشراح پسند نہیں تھی' دیکھو میں نے کوئی زور نہیں دیا تم پر' سرکل میں ایک سے بڑھ کے ایک لڑکی موجود ہے۔ جس پر تم انگلی رکھو گے اسے بیاہ لاؤں گی۔ تم کہو تو سہی۔"

"مجھے صرف ماورا سے ہی شادی کرنا ہے مما۔" ایشان جاہ کا دوٹوک لہجہ صہبا کو حیرت میں مبتلا کر گیا' وہ باری باری دونوں باپ بیٹے کا منہ تکنے لگی تھیں۔

لڑکیوں کے اکیلے پن اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے فائزہ لوٹ آئی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا چند گھنٹوں کے لیے سوئم میں چلی جائیں گی یا پھر دونوں کو ساتھ لے جائیں گی۔ ان کے لوٹ آنے سے سمہان بھی بے فکر ہو گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ شال لپیٹتی باہر نکل آئی تھی۔ ڈنر پر سمہان موجود نہیں تھا' فائزہ کو کال کر کے اپنی مصروفیت بتانے کے ساتھ عیشال کو بھی اس کا پیغام مل گیا تھا۔ وہ موجود ہوتا تو شاید وہ بھی آرام سے کمبل میں دبک کے اس سے میسج پر باتیں کرتی لیکن اس کی غیر موجودگی فکر میں مبتلا کر رہی تھی۔ لان میں طرح طرح کے پھول لگے ہوئے تھے۔ رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو پر وہ بے ساختہ اس سمت کھنچتی چلی گئی۔ وہ بے فکری سے ان کی خوشبو سے مسحور ہوتی پھولوں پر جھک کر ان کی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔

"رات کے وقت' ان پھولوں کے قریب نہیں جاتے۔" بلیک سوٹ' شال میں ادھ کھلے بالوں کے ساتھ پھولوں پر جھکی وہ اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ اس منظر کو اپنے سیل فون کی گیلری میں قید کرتے اس کے قدم بے ساختہ رکے تھے۔ اس اچانک آواز پر وہ ڈر گئی تھی۔

"تم ہو؟" نظر اس پر پڑی تو وہ سکھ کا سانس لیتی سیدھی ہوئی۔

"جی آپ کا خادم۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ صبح کا نکلا رات گئے لوٹا تھا' تھکن محسوس ہو رہی تھی لیکن اس دشمن جاں پہ نظر پڑتے ہی تھکن دور بھاگتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سخت موسم میں یقیناً وہ اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔

"اتنی رات کو پھولوں کے پاس کیا کر رہی تھیں؟"

"تمہارا انتظار۔" اس نے کہہ گئی تو وہ حیران رہ گیا۔

"خیریت؟"

"بس یونہی۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"سوئی نہیں؟" سمہان آفندی اسے بھرپور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عیشال کی محبت کا مان دل کو آسودہ کر گیا تھا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" منہ بسور کر کہا۔

"کیوں نہیں آ رہی تھی...... بور ہو رہی ہو کیا؟" اسے احساس تھا سارا دن مصروف رہا' فون پر بھی وقت نہیں دے سکا

تھا۔ جب سے آئی تھی سوائے ضروری کام کے کہیں باہر نہیں گئی تھی۔

''نہیں بوریت کیسی۔ لوگوں کو بس ساتھ لانے کا شوق تھا تا کہ وہ کام میں بزی رہیں اور میں یہاں اکیلی پاگل بن کے بیٹھی رہوں۔'' اس کی بات پر سمہان نے اپنی مسکراہٹ چھپانا چاہی لیکن ناکام رہا۔

''آپ کا ملزم حاضر ہے' جو سزا چاہیں دیں' اف نہیں کروں گا۔ مانتا ہوں خاکسار سے کوتاہی ہوئی ہے مگر جہاں پناہ کام بھی ضروری تھا اس لیے آپ کو وقت نہ دے سکا۔ اب فارغ ہوں آپ جو حکم کریں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے آئی سمجھ۔'' اس نے تیکھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''کچھ کھایا پیا بھی ہے یا بس کام میں لگے رہے تھے؟'' انداز میں فکرمندی در آئی تھی۔

''ہلکا پھلکا کھالیا تھا۔ خیر ہے بڑی گھر والی جیسی فیلنگ آرہی ہے۔'' اس نے شریر ہو کر کہا۔

''میں سونے جارہی ہوں۔'' وہ جانے لگی تو سمہان نے ہاتھ تھام کر اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔

''بہت اچھے' سارا دن کوئی بات نہیں ہوئی' میرے لوٹ آنے کا انتظار کررہی تھیں اور اب جانے کی ہورہی ہے۔ کوئی ناں۔ باتیں کریں گے۔'' وہ بے ساختہ اس کی شکل دیکھتی رہے گئی۔

''سمہان...... مجھے تمہارے لیے بہت ڈر لگا رہتا ہے۔ چلو ناں ہم دونوں کہیں دور چلے جائیں' جہاں یہ لوگ ہمیں نہ ڈھونڈ سکیں۔'' اس کے تھامے ہوئے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر وہ اس کے ساتھ محبت بھری زندگی گزارنے کی لالچ میں کہہ گئی۔ اس گھڑی نڈر' بے دھڑک بولنے والی عیشال جہانگیر کی جگہ ایک محبت کی ماری لڑکی نے لے لی تھی۔ سمہان کو اس کی فکرمندی اچھی لگی' اس کے اس معصومانہ انداز پر بہت پیار آیا۔

''پیا برداشت نہیں کریں گے اور وہ نرمین......''

''بس چپ۔'' اس کے ہاتھ پر دباؤ بڑھا کر اسے بے چارگی سے لب کھولتے دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

''تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا' نہ ہی خواہش تھی کہ میری ذات تمہارے لیے کسی صدمے کا باعث بنے' تب ہی دامن بچاتا رہا کہ ہرجائی' بزدل سمجھ کے برے لفظوں میں یاد کر کے کسی اور سے شادی کر کے ایک دن اس محبت کو بھول جاؤ لیکن وہ کب ہوا جو میں چاہتا تھا' تمہیں اسی صدمے سے دور رکھنے کی کوشش ہی تو کررہا تھا۔ اپنی پروا نہیں تھی۔ جان تو آنی جانی چیز ہے' روز حویلی سے نکلتے یہ نہیں سوچتا تھا کہ واپس آنا بھی نصیب میں ہوگا کہ نہیں' ہر پل کو آخری لمحہ سمجھ کر ہی جیتا آیا ہوں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب بہت طویل عمر تمہارے ساتھ جینے کی خواہش دل میں جاگ گئی ہے۔ اپنی نسلوں کو پروان چڑھانے کی حسرت ہے......''

''تب ہی تو کہہ رہی ہوں' چلو ناں' ہم کہیں دور چلے جاتے ہیں سب سے۔'' اس کی بات کاٹ کر وہ جلدی سے اپنی بات دہرا اٹھی اس نے مسکرا کر اس کی انگلیوں پر دباؤ بڑھایا۔

''اپنوں سے بھاگ کر جائیں گے بھی تو کہاں اور کیوں بھاگیں ان سے؟ تم سے محبت اپنی جگہ لیکن کبھی نہیں چاہا کہ میں ان سب کا بھروسا توڑوں' اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ راز محبت دل میں دبا' میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا مگر تم نے اپنا وجود کسی اور کو سونپنا گوارا نہیں کیا تو تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ دیتا۔ تم ریلیکس رہو' تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ بزدلوں کی طرح تمہیں لے کر نہیں بھاگوں گا۔ سزادیں گے سہ لوں گا' منانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اپنے کب تک پتھر دل ہو سکتے ہیں۔ بالفرض نہ بھی مانے تو کیا ہوگا' زیادہ سے زیادہ جان سے ماردیں گے ناں اس سے زیادہ تو وہ لوگ اور کچھ نہیں کرسکتے۔ ماما ڈیڈ تمہارا خیال رکھیں گے۔''

''مت کرو ایسی باتیں پلیز۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔

"خود کو مضبوط رکھو تم بہادر ہی اچھی لگتی ہو یہ ڈرپوک عیشال والا روپ تمہیں سوٹ نہیں کررہا۔ سب اللہ پہ چھوڑ دو جس نے ہمیں ایک کیا ہے آگے بھی وہی طے کرے گا۔ جو ہوگا اسے ہم دونوں قبول کرلیں گے۔" اس نے اسے حوصلہ دیا۔

"میں کچھ بھی برا قبول نہیں کرسکوں گی' تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی مرجاؤں گی۔ زندہ رہ کر پل پل نہیں مرسکتی تمہارے بغیر۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کررودی۔

"مت رو پلیز......" سمہان آفندی نے فوراً اس کے ہاتھ تھامے۔

"کیا چاہتی ہو؟"

"تمہارے ساتھ...... بہت سارا جینا چاہتی ہوں' بہت محبت کے ساتھ ہر پل تمہارے سنگ بتانا چاہتی ہوں بس اور کچھ نہیں چاہیے مجھے زندگی سے' بچھڑ گئے تو ایسا کچھ نہیں ہوسکے گا۔" وہ تردد سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیسی معصوم معصوم سی خواہشیں تھیں ان کی۔ لوگ زمین' جائیداد اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی سبقت کے لیے لڑتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی سنگت کے متمنی تھے' زندگی سے ان کی مانگ کچھ زیادہ تو نہیں تھی لیکن جابر و ظالموں کو اس خواہش کی کہاں پروا تھی سا نہیں تو بے رحم فیصلہ کرکے ارمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا آتا تھا بس۔

"بچھڑنے کی بات کرکے اس پل کو کیوں گنوارہی ہو' ابھی تو ہم ساتھ ہیں ناں۔ اس پل کو ہم ساری زندگی سمجھ کر تو گزار سکتے ہی ہیں' اسی لیے تو تم سے ضد کی تھی ساتھ چلنے کی۔" اسے کافی دیر بعد احساس ہوا۔

"مطلب یہ کہ لانگ ڈرائیو نہ سہی شارٹ ڈرائیو پر تو ہم اس وقت چل ہی سکتے ہیں۔ میں نے صبح سے ڈھنگ سے کچھ نہیں کھایا' باہر ڈنر بھی کرسکتے ہیں' واپسی میں واک کرتے آئسکریم بھی کھالیں گے۔ لڑنے جھگڑنے کے لیے آدھا گھنٹا کافی ہوگا میرے خیال سے' تم بولتی رہنا' میں چپ کرکے سن لوں گا۔ ٹھیک ہے ناں؟ مزید کسی چیز کی مسنگ لگی تو وہ راستے میں طے کرلیں گے...... چلو آؤ۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ خارجی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

"اس وقت...... تائی جان اور ندا آپی کو پتا چلا تو؟" اسے خوف آیا۔

"ندا جی کی خیر ہے' وہ کچھ نہیں پوچھیں گی۔ تائی جان اول تو سو رہی ہوں گی۔ اگر انہیں تمہاری غیر موجودگی محسوس ہوئی تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی کال کریں گی' تب بتادوں گا ہم ساتھ ہیں۔" وہ سب طے کیے بیٹھا تھا۔

"لیکن......" وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سمہان آفندی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے روک دیا اور اسے لیے گھر سے نکل آیا۔

سمہان آفندی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ اتنا خوش ہوئی تھی جتنا پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لانگ ڈرائیو' پھر ڈنر' سنو فال کے ساتھ واک کرتے آئسکریم کھاتے محبت بھری باتیں کرتے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سمہان ہے' جس کی طرف سے محبت بھرے جملوں کی منتظر رہ کے وہ ناشاد ہو کر اسی سے الجھنے لگتی تھی' یہ تو کوئی محبت کرنے والا شخص تھا جو محبوب بیوی کی ہر خواہش کو پوری کرنے چلا تھا۔ واپسی میں جب پھولوں کے کنگن اس کی کلائی میں پہنائے تو عیشال جہانگیر خود پہ نازاں ہونے لگی۔

"جتنی محبت تم نے مجھ سے کی ہے' اس سے کہیں زیادہ تمہیں لوٹاؤں گا' بشرط زندگی' یہ وعدہ رہا۔" وہ آسودگی سے مسکرا دی' اسی وقت سمہان کا فون بجنے لگا۔ اس کا ہاتھ تھامے ہی وہ کال پک کرگیا۔

"کیا حال ہیں برو؟" دوسری طرف شاہ زر شمعون تھا' اس نے گرم جوشی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں ٹھیک ہوں' تو ٹھیک ہے؟ مما' عیشال اور ندا کو لے کر نکلا ہوا ہے' ابھی داجان نے بتایا۔ سب ٹھیک ہے؟ ندا کو

کیسے اجازت دے دی داجان نے..... وہ ٹھیک تو ہے ناں؟" وہ حیران ہونے کے ساتھ تھوڑا متفکر بھی تھا۔
"سب ٹھیک ہیں پریشان نہ ہوں تائی جان' ندا جی تمہاری طرح مجھے بھی عزیز ہیں' تم ڈسٹرب نہ ہو اس لیے رابطہ نہیں کیا' کہاں ہو اس وقت قریب ہو تو جوائن کر لیتے ہیں ایک دوسرے کو اچھی کمپنی رہے گی۔" اسے شاہ زر شمعون کے ساتھ باتوں میں مصروف چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"ایشان کو دیکھنے کے بعد مجھے ماورا کی فکر نہیں رہی' ماورا مجھے موت مہلت نہ دے تو تم ایشان سے شادی کر لینا۔"
"نہیں..... ایشان سے شادی نہیں کرنا' اس کی ماں نے اچھا نہیں کیا اور تم بھی کہہ رہی ہو کہ ایشان نے جھوٹ بولا تھا تو لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ جہانگیر کا بیٹا تمہارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔"
"تم ایشان سے ہی شادی کرنا ورنہ کہاں جاؤ گی میرے بعد؟ تم ایسا کرنا جہانگیر کو بتانا' تم میری بیٹی ہو پھر دیکھنا وہ کیسے ایشان کو تم سے شادی پر مجبور کر دے گا' تم ایشان سے ہی شادی کرنا بس۔" بار بار پڑنے والی ضرب سے بالآخر تالا ٹوٹ ہی گیا تھا۔ گولڈ کا سیٹ نکال کر رکھتے اس کی نظر ڈائری پر گئی جو شاید سب سے اوپر رکھی ہی اس لیے گئی تھی کہ اسے دیکھ لیا جائے۔ جس شام صہبا آئی تھیں اس کے بعد کی رات ہی منزہ کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی تھی۔ پہلے ہی صفحے پر اس دن کی تاریخ کے ساتھ کافی کاٹ پیٹ کر ایک ہی بات کی بار بار تاکید کی گئی تھی۔ بار بار شادی کرنے اور نہ کرنے کی تکرار کے بعد آخر میں چودھری جہانگیر کا حوالہ دے کر جیسے بات ختم کر دی گئی تھی۔
عزت و پندار کی انہیں بھی پروا تھی لیکن زندگی کی تلخیوں کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا تب ہی وہ اپنی ہی سوچ کی نفی لیوں کو کاٹ کر کر چکی تھیں۔ منزہ کی آخری خواہش پڑھ کے ماورا ایک پل کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ جب منزہ کو اس نے چھپ چھپ کے ڈائری لکھتے دیکھا تھا اور آج ڈائری ہاتھ لگی تو وہ جلد سے جلد سب پڑھ لینا چاہ رہی تھی لیکن پہلے ہی صفحے نے واضح کر دیا تھا کہ منزہ اس کے لیے کس قدر فکر مند تھیں اور چودھری جہانگیر کا ہونا ان کے لیے کتنی سکون بخش بات تھی۔ ایشان کا سچ جاننے کے باوجود انہیں یقین تھا کہ جہانگیر اسے اپنے گھر کی بہو بنا لیں گے اور ان کا گماں کم بھی تو نہ تھا۔ چوہدری جہانگیر آن موجود ہوئے اور اپنا فیصلہ سنا گئے تھے۔ احساس دلا گئے تھے کہ وہ اکیلی نہیں ہے' جب چاہے ان کے گھر آ کر رہ سکتی ہے۔ چودھری جہانگیر نے کس بھرم سے کہا تھا کہ منزہ کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ ساکت ہو کر منزہ کے لفظوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈائری کھلی پڑی تھی' اور اس کی نظریں پہلے صفحے پر ہی ساکت رہ گئی تھیں۔
جانے وہ کتنے ہی لمحے بے حس و حرکت بیٹھی رہتی۔ دروازے پر ہونے والی دستک اور دھیمی سرگوشی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ڈائری کو دیکھتی دروازے تک آئی۔
"کون؟" رات کافی ہو گئی تھی' اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی تسلی کرنا چاہی تھی۔
"میں ہوں زاہد دروازہ کھولو۔" دبی آواز میں تعارف کے ساتھ حکم دیا گیا۔ اس نے شکر ہی ادا کیا کہ انوشا کے دھوکے میں اس نے دروازہ نہیں کھولا۔
"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ متعجب ہوئی۔
"نیند نہیں آ رہی تھی' تم بھی اکیلی ہو' جاگ رہی ہو' تمہیں ماں کے بچھڑنے کا غم ہے اور مجھے بیویوں کے چھوڑ جانے کا دکھ' کیوں نہ ہم ایک ساتھ مل کے کچھ پیار بھری باتیں کریں تاکہ اپنا غم بھول جائیں۔ دروازہ کھولو کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا سب سو رہے ہیں۔" وہ جانے اور کیا کیا بول رہا تھا ماورا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ اسے تنہا جان کر بھیڑیا اس کی طرف چلا آیا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلنگ پہ بیٹھ گئی۔ لوہے کا مضبوط دروازہ اسے کمزور لگ رہا تھا جسے توڑ کر زاہد

اندر گھس آتا۔ شور کرکے بلاتی بھی تو کسے..... انوشا کو؟ ایسا کچھ دیکھ کر اس گھر والے اپنے خون پر بھروسا کرتے یا چند گھنٹوں پہلے آئی لڑکی پر؟ انوشا مشکل میں آسکتی تھی۔ وہ خاموش ہی رہی۔ زاہدا سے رام کرکے دروازہ کھلوانے کے جتن کرکر کے تھک گیا تو باقاعدہ گالیوں پر اتر آیا۔ ذلت واہانت اور خوف کے احساس نے چند لمحوں میں اس پر واضح کردیا تھا کہ اس کی بی جی داری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ زاہد کافی دیر تک کوشش کرتا رہا تھا۔

فجر کی اذان کی آواز آنے لگی تو زاہد کو بھی یقین ہوگیا کہ وہ کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گی' دو تین بار دروازے کو جھٹکا دے کر اس نے اسے ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی اور وہ سچ مچ ڈر کے دیوار سے لگ بھی گئی تھی۔ وہ ناکام ہوتا گالیاں بکتا چلا گیا تھا۔ کئی لمحے وہ اس کے جانے کا یقین کرتی اس اہانت کو محسوس کرتی رہی۔ ضبط کے باوجود پلکیں نم ہوگئی تھیں۔ آنکھیں بے دردی سے رگڑتے اس نے سیل فون اٹھا کر تیزی سے نمبر ملایا۔ دوسری طرف بھی جیسے کوئی منتظر تھا فوراً کال پک ہوگئی تھی۔

''ایشان جاہ.....'' ناورایحیٰ کے منہ سے وہ اپنا نام سن کر ہی ساری جان سے متوجہ ہوگیا تھا۔

''میں سوئم میں جارہی ہوں تم لوگوں کا موڈ ہے چلنے کا؟'' ناشتے کی میز پر فائزہ دونوں لڑکیوں سے مخاطب ہوئیں۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مما' میں نہیں جاسکوں گی۔'' ندا جب تک قید کی زندگی گزار رہی تھی ٹھیک تھی لیکن آزاد فضا میں نکلتے ہی اس کی حساس طبیعت بوجھل ہوگئی تھی' کچھ چیزیں اتنی شدت سے یاد آنے لگی تھیں کہ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ سب کے سامنے اس نے اپنا بھرم رکھا ہوا تھا لیکن دل کو کھرچنے والی دل شکن یادیں بیمار کرگئی تھیں۔ وہ آزاد تھی اور کوئی عشق کے جرم میں منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔

اپنی ذات کے حوالے سے قتل عام بات نہیں تھی' راحیل اپنی موت مرتا تو اس کا غم ضرور ہوتا لیکن اس وقت تو اس کے قتل کی مجرم خود اس کی ذات تھی۔ اس کا کہیں آنے جانے کو دل نہیں کررہا تھا۔ ہر خوشی' آزادی اس نے خود پر حرام سمجھ لی تھی' قاتلوں کو اتنی آزادی بھی کہاں ہوتی ہے کہ وہ کھل کے مسکرا بھی سکیں۔

''ٹھیک ہے پھر عیشال اکیلے جاکے وہاں کیا کرے گی میں خود ہی ہوآؤں گی۔'' فائزہ نے کہا تو عیشال کو بھی سکون نصیب ہوا جانے کا خود اس کا دل بھی نہیں تھا۔

''کب تک جانا ہے تائی جان؟ میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔ جب واپس آنا ہو کال کردیجیے گا میں لینے آجاؤں گا۔'' سبحان آفندی نے اپنی خدمت پیش کی۔

''نہیں بیٹا..... تم زحمت نہ کرو میں نے آپا کو کال کردی ہے وہ حمزہ (بھانجے) کو بھیج رہی ہیں۔ واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوجائے گی۔ تم لڑکیوں کا دھیان رکھ لینا پھر تمہیں بھی اپنے کام دیکھنے ہوں گے۔'' فائزہ نے انکار کرکے اس کی ذمہ داری کا خیال کیا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ سرخم کرگیا۔

''واپسی کا کب تک ارادہ ہے؟ تمہارا کام کب تک ختم ہوجائے گا؟'' فائزہ کو واپسی کی فکر ہوئی عیشال جہانگیر کا ناشتا کرتا ہاتھ رک گیا۔ وہ بے ساختہ سبحان کی شکل دیکھنے لگی کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

''امید تو ہے کام آج مکمل ہوجائے گا ممکن ہوا تو کل صبح ورنہ کل دن کو نکل جائیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''چلو پھر ٹھیک ہے' میں بھی سب سے ملتی ملاتی آجاؤں گی۔ لڑکیوں تم لوگ پیکنگ کرلینا اپنی کہیں یہ نا ہو عین موقع پر ساری چیزیں یاد آئیں۔'' فائزہ کی یاددہانی پر دونوں نے سر ہلادیا۔ واپس جانے کا سن کر اس کے دل کو پتنگے لگ گئے

اندر گھس آتا۔ شور کرکے بلاتی بھی تو کسے...... انوشا کو؟ ایسا کچھ دیکھ کر اس گھر والے اپنے خون پر بھروسا کرتے یا چند گھنٹوں پہلے آئی لڑکی پر؟ انوشا مشکل میں آسکتی تھی۔ وہ خاموش ہی رہی۔ زاہد اسے رام کرکے دروازہ کھلوانے کے جتن کرکر کے تھک گیا تو باقاعدہ گالیوں پر اتر آیا۔ ذلت واہانت اور خوف کے احساس نے چند لمحوں میں اس پر واضح کردیا تھا کہ اس کی جی داری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ زاہد کافی دیر تک کوشش کرتا رہا تھا۔

فجر کی اذان کی آواز آنے لگی تو زاہد کو بھی یقین ہوگیا کہ وہ کسی صورت دروازہ نہیں کھولے گی‘ دو تین بار دروازے کو جھٹکا دے کر اس نے اسے ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی اور وہ سچ مچ ڈر کے دیوار سے لگ بھی گئی تھی۔ وہ ناکام ہوتا گالیاں بکتا چلا گیا تھا۔ کئی لمحے وہ اس کے جانے کا یقین کرتی اس اہانت کو محسوس کرتی رہی۔ ضبط کے باوجود پلکیں نم ہوگئی تھیں۔ آنکھیں بے دردی سے رگڑتے اس نے سیل فون اٹھا کر تیزی سے نمبر ملایا۔ دوسری طرف بھی جیسے کوئی منتظر تھا فوراً کال پک ہوگئی تھی۔

”ایشان جاہ......“ ماورا یحییٰ کے منہ سے وہ اپنا نام سن کر ہی ساری جان سے متوجہ ہوگیا تھا۔

”میں سوئم میں جارہی ہوں تم لوگوں کا موڈ ہے چلنے کا؟“ ناشتے کی میز پر فائزہ دونوں لڑکیوں سے مخاطب ہوئیں۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مما‘ میں نہیں جاسکوں گی۔“ ندا جب تک قید کی زندگی گزار رہی تھی ٹھیک تھی لیکن آزاد فضا میں نکلتے ہی اس کی حساس طبیعت بوجھل ہوگئی تھی‘ کچھ چیزیں اتنی شدت سے یاد آنے لگی تھیں کہ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ سب کے سامنے اس نے اپنا بھرم رکھا ہوا تھا لیکن دل کو کھرچنے والی دل شکن یادیں بیمار کرگئی تھیں۔ وہ آزاد تھی اور کوئی عشق کے جرم میں منوں مٹی تلے جاسویا تھا۔

اپنی ذات کے حوالے سے قتل عام بات نہیں تھی‘ راحیل اپنی موت مرتا تو اس کا غم ضرور ہوتا لیکن اس وقت تو اس کے قتل کی مجرم خود اس کی ذات تھی۔ اس کا کہیں آنے جانے کو دل نہیں کررہا تھا۔ ہر خوشی‘ آزادی اس نے خود پر حرام سمجھ لی تھی‘ قاتلوں کو اتنی آزادی بھی کہاں ہوتی ہے کہ وہ کھل کے مسکرا بھی سکیں۔

”ٹھیک ہے پھر عیشال اکیلے جاکے وہاں کیا کرے گی میں خود ہی ہوآؤں گی۔“ فائزہ نے کہا تو عیشال کو بھی سکون نصیب ہوا جانے کا خود اس کا دل بھی نہیں تھا۔

”کب تک جانا ہے تائی جان؟ میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔ جب واپس آنا ہو کال کردیجیے گا میں لینے آجاؤں گا۔“ سبحان آفندی نے اپنی خدمت پیش کی۔

”نہیں بیٹا...... تم زحمت نہ کرو میں نے آپا کو کال کردی ہے وہ حمزہ (بھانجے) کو بھیج رہی ہیں۔ واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوجائے گی۔ تم لڑکیوں کا دھیان رکھ لینا پھر تمہیں بھی اپنے کام دیکھنے ہوں گے۔“ فائزہ نے انکار کرکے اس کی ذمہ داری کا خیال کیا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ سرخم کرگیا۔

”واپسی کا کب تک ارادہ ہے؟ تمہارا کام کب تک ختم ہوجائے گا؟“ فائزہ کو واپسی کی فکر ہوئی عیشال جہانگیر کا ناشتا کرتا ہاتھ رک گیا۔ وہ بے ساختہ سبحان کی شکل دیکھنے لگی کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

”امید تو ہے کام آج مکمل ہوجائے گا ممکن ہوا تو کل صبح ورنہ کل دن کو نکل جائیں گے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”چلو پھر ٹھیک ہے‘ میں بھی سب سے ملتی ملاتی آجاؤں گی۔ لڑکیوں تم لوگ پیکنگ کرلینا اپنی کہیں یہ نا ہو عین موقع پر ساری چیزیں یاد آئیں۔“ فائزہ کی یاددہانی پر دونوں نے سر ہلا دیا۔ واپس جانے کا سن کر اس کے دل کو پتنگے لگ گئے

تھے۔ فائزہ نکلیں تو وہ اسے ڈھونڈتی اس تک چلی آئی جو خود بھی باہر نکلنے کی تیاری کررہا تھا۔

''میں نے نہیں جانا حویلی واپس۔''

''اچھا جی پھر کہاں جانا ہے آپ نے؟'' وہ اس کے نروٹھے انداز پر مسکرادیا۔

''کہیں بھی لے چلو لیکن حویلی نہیں۔'' اس کی ایک ہی منطق تھی۔

''پہلے حویلی چلیں گے پھر اس کے بعد دنیا کے جس کونے میں جانے کو کہو گی لے چلوں گا۔'' اس کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا۔

''بہلا رہے ہو ناں' جھوٹی آس تھما رہے ہو' پتا ہے حویلی گئے تو پھر شاید کبھی کہیں اور جانے کے قابل ہی نہ رہیں۔'' وہ آزردہ ہوئی۔

''اتنا نیگیٹو کیوں سوچتی ہو؟ ہوسکتا ہے' ہم جتنا نیگیٹو سوچ رہے ہیں' حقیقت اس کے الٹ ہو۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''تم حویلی والوں کے لیے اچھا سوچ سکتے ہو' میں بھولے سے بھی ایسی احمقانہ سوچ کا تصور نہیں کرسکتی۔ حویلی والوں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہیں۔'' اس کو ذرا خوش گمانی نہیں تھی۔

''اچھا ہی ہوگا' پریشان نہ ہو۔'' وہ دلاسا دے کر جانے لگا۔

''میں یہاں ٹینشن میں ہوں اور تمہیں جانے کی پڑی ہے۔'' وہ ٹھنکی۔

''حکم کریں..... آپ کی ٹینشن کیسے دور کرسکتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوکر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''اُفوہ..... سمجھو ناں' مجھے یہاں سے نہیں جانا واپس۔ حویلی جا کے ہم کھل کے بات بھی نہیں کرسکیں گے اور نا ہی ساتھ آزادی سے باہر جا کے انجوائے کرسکیں گے۔ میں اس لمحے کو ساری زندگی انجوائے کرنا چاہتی ہوں سمہان' جب کہ حویلی گئے تو پھر سے قید کی زندگی اور نکاح کی بات کھلنے پر جانے کیا ہو میں ساری زندگی یہیں جینا چاہتی ہوں۔'' وہ دلی خواہش بتارہی تھی۔

''اوکے..... اور جو حویلی کے لوگ یہاں آگئے کیونکہ یہ بھی حویلی والوں کی پراپرٹی ہے تو آپ کیا کریں گی' کہاں جائیں گی؟''

''ہیں..... حویلی والے یہاں آسکتے ہیں' ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''میری پگلی..... اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنوں سے بھاگا نہیں جاتا' ایک بار بات کھل جائے پھر جتنے دن کے لیے کہوں گی لے آؤں گا' اب مجھے جانے دو کام ہے ناں۔'' اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے وہ ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گیا تھا۔

ڈر اور خوف کا گھیراؤ رات کی تاریکی میں ہی گہرا ہوتا ہے یہ ادراک اسے سورج کی روشنی میں بخوبی ہوگیا تھا۔ صبح کی روشنی میں سارا منظر واضح تھا جو رات اس نے ڈر سہم کر اجنبی جگہ پر گزاری تھی اب اس کی سحر ہوگئی تھی' اب کوئی ڈر کوئی خوف نہیں تھا۔ گھر میں ہلچل سی محسوس ہوئی تو وہ بھی اسٹور روم سے نکل آئی' اندازے کے مطابق انوشا کچن میں ہی مل گئی تھی۔

''میں تمہاری مدد کرادوں۔'' اس کی آواز پر انوشا نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم کیوں چلی آئیں؟ میں اپنا اور تمہارا ناشتا لے کر آرہی تھی۔''

''چلو' ساتھ ٹرے سیٹ کرلیتے ہیں۔'' اس نے خوش دلی سے کہتے چیزیں سیٹ کرنا شروع کردیں۔

''تم ناراض ہو مجھ سے؟'' جانے کیوں اسے لگا انوشا خفا ہے۔

"نہیں تو...... تمہیں ایسا کیوں لگا؟" وہ مصروف انداز میں گویا ہوئی۔
"رات زیادہ بول گئی تھی۔تم ٹھیک کہہ رہی تھیں اور میں پتا نہیں کیا کیا بول گئی......سوری۔" لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
"کیوں فضول سوچ رہی ہو۔ پہلے کیا کبھی ہم میں لڑائی یا بحث نہیں ہوئی اب ایسا کون سا پہاڑ ٹوٹ گیا ہے جو سوری آ گئی ہمارے بیچ۔" انوشا نے حیرت کا اظہار کیا۔
"ناشتا کرلو پھر ہم مارکیٹ چلیں گے۔ موسم کے کچھ کپڑے لوں گی تم بھی اپنے لیے کچھ لے لینا۔"
"آج نہیں چل سکوں گی ابھی ایشان مجھے لینے آرہا ہے۔"
"ایشان......! لینے آرہا ہے لیکن کیوں؟" انوشا اس کے پُرسکون انداز پر بری طرح چونکی۔
"میں نے نکاح کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔تم ٹھیک کہہ رہی تھیں پھر اماں کی بھی شدید خواہش تھی تو رات میں نے بہت سوچا چند ہزار کے زیور بیچ کر میں کتنے دن ہاسٹل میں رہ سکوں گی اور پھر کبھی نہ کبھی تو شادی کرنی ہی ہے ناں ہمارے سر پہ باپ بھائی کا سایہ تو ہے نہیں کہ وہ شادی کے اخراجات اٹھائیں گے۔ میں ہمت کر کے جینے کی کوشش بھی کروں گی تو بھی تمہاری ٹینشن کم نہیں ہوگی کہ جانے کیسی ہے کس حال میں ہے؟ شادی ہوجائے گی تو تمہیں بھی سکون مل جائے گا۔" خود کو لاپروا ظاہر کرتے وہ مسکراتے ہوئے یوں گویا تھی جیسے من پسند موضوع پر بات کررہی ہو۔
"سچ بتاؤ ماورا......! کسی نے کچھ کہا تمہیں کوئی بات بری لگی یا پھر میری بات......" انوشا پلٹ کر اس کا ہاتھ تھام گئی۔
"پاگل ہوئی ہو ایسی کوئی بات نہیں رات بھر خوب سوچا جب وہ لوگ خود طلب گار ہیں تو میں کیوں بلاوجہ بہادر بی بی بن کے سب کو تمہیں اور خود کو بے رحم دنیا کے حوالے کروں اماں کی بھی تو یہی خواہش تھی ناں وہ ہم دونوں کو اپنے گھر کا کر کے جانا چاہتی تھیں اور ایشان تو انہیں بہت پسند بھی تھا۔تم مارکیٹ جاؤ تو سیزن کے کپڑوں کے ساتھ نکاح میں پہننے کے لیے اچھا سا جوڑا بھی لے لینا۔ میں چاہتی ہوں میری اکلوتی بہن نکاح میں سب سے زیادہ اچھی لگے۔" اس کی فکرو تردد دور کرنے کو وہ اسے سامنے کھڑا کیے باتیں کررہی تھی۔ انوشا بےیقینی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس میں اس کی باتوں کا عکس واضح تھا۔

"خیریت...... صبح صبح تیار ہوکر کہاں جانے کی تیاری ہے؟" یونیورسٹی تو وہ جا نہیں رہا تھا ایسے میں اسے کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر صہبا پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔
"ماورا کو لینے جارہا ہوں۔" اس کی بات پر چودھری جہانگیر بری طرح چونکے دونوں بہنوں کے انداز دیکھ کر وہ سمجھ تو گئے تھے کہ ان کی آمد اور پروپوزل انہیں کچھ خاص پسند نہیں آیا لیکن وہ اپنے تئیں ساری بات کر آئے تھے۔ وہ اب جواب کے منتظر تھے کیونکہ اس کے بعد ہی انہیں دوسرا اقدام اٹھانا تھا۔ وہ چاہے سختی سے کام لیتے یا نرمی سے ماورا کو انہوں نے اس گھر میں تو لازمی لانا ہی تھا۔
"اچھی بات ہے تم ماورا کو ساتھ لے آؤ ایشان۔ ہماری ہونے والی بہو بہن کے سسرال میں رہے یہ اچھی بات نہیں۔ اچھا اور بروقت فیصلہ کیا ہے۔ کل ہی ہمارے ساتھ چلی آتی میں نے کہا بھی تھا لیکن ابھی بھی کون سی دیر ہوئی ہے۔" انہوں نے سراہا اور صہبا ہونق کی طرح ان کی شکل دیکھتی رہیں۔ نرمین اس سارے مسئلے سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے سکون سے ناشتا کررہی تھی۔
"یہ ہو کیا رہا ہے؟ آپ دونوں مجھے بھی ذرا سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ کہاں تو کل تک وہ لڑکی جانی دشمن بنی ہوئی تھی اور آپ دونوں اسے ہر طرح سے ڈرا دھمکا رہے تھے اور اب کہاں اسے گھر لانے سے پہلے کمرہ تیار کروا رہے ہیں

نکاح بھی طے ہوگیا اور اب ایشان اسے لینے بھی جا رہا ہے آخر ایسا کیا ہوگیا اس کی ماں کی موت کے بعد کہ آپ دونوں اس سے ہمدردی کرتے نہیں تھک رہے ہمدردی تک بھی بات رہتی تو ٹھیک تھی وہ تو اس گھر کی بہو بننے آ رہی ہے ایک معمولی سی مڈل کلاس لڑکی اس گھر کی بہو۔" صہبا کا سوچ سوچ کے برا حال ہوگیا تھا۔

"مادرا کو بہو بنانے کے فیصلے میں ہمدردی یا ترس کی آمیزش نہیں ہے صہبا بیگم۔ اس فیصلے میں ایشان کی خواہش اور میری مرضی کا عمل دخل بھی ہے۔ مادرا ایشان کے لیے سوٹ کرتی ہے۔ رہی کلاس کی بات تو نکاح میں اتنا کچھ اس کے نام ہوگا کہ وہ مڈل کلاس سے نکل کر اپر کلاس میں پلک جھپکتے پہنچ جائے گی۔ بہو میں مزید کوئی اور خوبی دیکھنا چاہتی ہیں آپ تو وہ بتا دیں۔" چودھری جہانگیر کا جتاتا ہوا لہجہ باور کرا گیا تھا کہ وہ کسی عذر کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔

"نہیں اور کوئی اعتراض نہیں۔" وہ خائف سی ہوکر منہ پھیر گئی تھیں۔

بول چال تو دونوں میں ہی بند تھی۔ ایک سیر تھا تو دوسرا سوا سیر بننے کے در پر تھا۔ وہ چائے لے کر آئی تو اس کی کلائی تھام کر شاہ زرشمعون نے کھٹ سے تالا کھول کر زنجیر اس کی کلائی سے کھینچ لی۔ وہ اس اچانک مہربانی پر کلائی سہلاتی اسے دیکھنے لگی تھی۔ بنا کچھ کہے وہ اٹھ کر چلا گیا اور اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب کتے کی بھونکنے کی آواز قریب سے آنے پر اس نے دروازے کی سمت دیکھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا' باہر سے کنڈی اور تالا ڈالنے کی زحمت کیے بنا وہ دروازہ کھول کر غالباً اس کا امتحان لے رہا تھا۔ بھلے وہ اس کا امتحان لے رہا تھا' اسے یہاں کے لوگوں پر بھروسا ہو سکتا تھا لیکن شنائیہ اس غیر ذمہ دارانہ روش پر کسی طور مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ ہاشم کی آواز اکثر و بیشتر سنائی دیتی تھیں' اس کی جگہ کوئی بھی گھر میں گھس سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا کچھ دیر بعد ہاشم کی دبی آواز آنے لگی تھی وہ ایک بار پھر بہری اور گونگی بن گئی اور وہ تھک ہار کے واپس پلٹ گیا تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی جب کافی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"شاہ۔" باہر سے خشک آواز آئی تو وہ دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر کی سمت چل دی۔

"چور دروازے ڈھونڈنے والوں کے لیے نادر موقع تھا' فائدہ اٹھانا تھا' بھاگی کیوں نہیں؟" کڑوا لہجہ سماعت میں اودھم مچانے لگا۔ شنائیہ چوہدری کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھاگ کر جاؤں گی بھی تو کہاں؟ سب ہی آپ کے ہیں یہ ڈر دل سے نکال دیجیے کہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گی یا بھاگوں گی۔ جس طرح آپ لے کر آئے تھے' ویسے ہی ساتھ لے کر جائیں گے۔" اس پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہ کچن میں گھس گئی۔ شاہ زرشمعون کو اس کا یہ روپ کچھ سوچنے نہیں دے رہا تھا' جانے اس کے ذہن میں کیا سما گیا تھا۔

ایشان جاہ مادرا کو لینے پہنچ گیا تھا۔ وہ یاسر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یسریٰ بیگم بھی موجود تھیں۔ شفق ٹوہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ایک بار پھر سوچ لو مادرا۔ کہیں تم جذباتی تو نہیں ہو رہی ہو؟" انوشا کو جانے کیوں شرمندگی ہو رہی تھی۔ زاہد سے سامنا ہوا تو مادرا نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ جاتے ہوئے اسے تھپڑ مار کے جائے لیکن اس کے ہر عمل کو بھگتنا انوشا کو پڑتا' تب ہی وہ ضبط کر گئی۔ انوشا اسے اپنے فیصلے پر نظرثانی کا کہہ رہی تھی۔ پرس میں گولڈ کے زیور

کے ساتھ منزہ کی ڈائری کو اس نے انوشا کی نظر سے بچا کر رکھ لیا تھا۔ جانے ایسا کیا راز تھا جو منزہ اپنی موت کا سن کر اس پر درج کرتی چلی گئی تھیں۔ اگر تو کوئی دل شکن داستان ہوتی تو وہ اپنے تک ہی رکھتی‘ انوشا کو اس کی بھنک نہ پڑنے دیتی لیکن وہ چاہتی تھیں کہ ماورا اس ڈائری کو پڑھے اور ایسا کون سا راز تھا جسے منزہ کی بھی ہمت نہ ہوئی ان کے سامنے کھولنے کی۔ کچھ تو تھا جو پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہونا تھا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اور تم بھی اچھا سوچو اور نکاح کی تیاری کرو۔ میں پہنچ کر رابطہ کروں گی تم سے۔“ باتیں کرتی وہ انوشا کے ساتھ لاؤنج میں آ گئی۔ پرس کندھے سے لٹکائے سر پہ چادر لیے اسے دیکھ کر ایشان جاہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلیں......؟“ اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ایشان جاہ نے سوال کیا۔

”جی......“ انوشا سے گلے ملتے یسریٰ اور یاسر سے الوداعی کلمات کہتے وہ ایشان جاہ کے پیچھے گھر سے نکل گئی تھی۔

ایشان نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو راستے پر ڈال دیا تب بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل جس کے لیے وہ موسم کی سختی جھیل رہا تھا آج وہ اسی کار میں‘ اس کے ساتھ اس کے گھر تک کا سفر کر رہی تھی۔ یقین تو اسے اس وقت بھی نہیں آیا تھا جب ماورا نے کال کر کے اسے صبح لینے آنے کو کہا تھا۔ وہ تو اس کی کال کا منتظر ہی تھا‘ امید تھی وہ غصہ نکالنے کے لیے کال ضرور کرے گی‘ اسے پیچھے ہٹنے کو کہے گی لیکن اس نے جو کہا وہ ناقابل یقین ضرور تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ مہینوں ایک دوسرے سے دشمنی نبھانے والے اچانک دوست تو نہیں بن گئے تھے لیکن ان میں ایک بے نام معاہدہ ضرور ہو گیا تھا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ ویک اینڈ کی بجائے نکاح آج شام کو ہی ہو جائے؟“ خاموشی کا پردہ چاک کرتے ماورا کی دھیمی آواز گونجی تو ایشان جاہ نے گردن موڑ کر بے ساختہ اس کی سمت دیکھا۔ کہاں تو وہ نکاح و محبت کو ماننے کے در پر نہیں تھی اور اب کہاں اسے اتنی جلدی ہو رہی تھی۔

”کبھی کسی اجنبی جگہ پر رکنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تمہارے گھر بھی بناحق کے رہنا نہیں چاہتی۔“ وہ صاف گوئی سے جتا گئی۔

”او کے نکاح آج ہی ہو گا۔ تم پریشان نہ ہو۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہہ کر اس کا تردد دور کر دیا۔ گاڑی عالیشان بنگلے پر رکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر ایشان جاہ نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ خاموشی سے نکل کر اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ راہداری میں ہی اسے چودھری جہانگیر‘ صہبا کے ساتھ زمین ملی تھی۔ صہبا سے تو وہ واقف تھی‘ زمین کے متعلق ابھی اندازہ ہی لگا رہی تھی کہ ایشان جاہ نے بہن کہہ کر تعارف کرا دیا۔ صہبا کا انداز ایسا تھا جیسے بادل نخواستہ مل رہی ہوں‘ زمین بھی اپنے آپ میں ہی تھی۔

”ملنا‘ ملانا تو ہوتا رہے گا۔ پہلے تم آرام کر لو۔ ایشان ماورا کو اس کا کمرہ دکھاؤ بیٹا۔“ چودھری جہانگیر کے کہنے پر ایشان جاہ نے اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھ گئی۔ اجنبی لوگوں‘ اجنبی ماحول میں اسے خود الجھن سی ہو رہی تھی۔ ان کے کہے کو غنیمت سمجھتے اسے اس منظر سے نکلنا ہی مناسب لگا تھا۔ ایشان جاہ اسے کمرے تک لے آیا۔ کمرے کی آرائش و زیبائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”تم فریش ہو جاؤ‘ ملازم چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لاتا ہی ہو گا۔ میں ڈیڈ سے نکاح آج ہی رکھنے کی بات کر لیتا ہوں پھر تم چلنا میرے ساتھ نکاح میں پہننے کے لیے جوڑا لینے۔“ ایشان جاہ نے اس لمحے میں پہلی بار کوئی طویل بات

اس سے کی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں یہ انتظار ضرور تھا کہ وہ انحراف کرے گی۔ اختلاف کا پہلو ڈھونڈ نکالے گی لیکن جب اس نے ایسا کچھ نہ کہا تو وہ اسے دیکھتے رہا۔

"بہتر......" اس نے ایک لفظ میں بات ختم کردی تھی۔

آج ہی نکاح کا سن کر چودھری جہانگیر سوچ میں پڑ گئے تھے اگلے ہی لمحے انہوں نے حامی بھر کر صبا کو حیران کردیا۔

"ہاؤ لکی یو آر...... جھٹ پٹ نکاح کا دن طے ہوگیا اور ایک میں ہوں جیسے صرف تاریخ پر تاریخ مل رہی ہے۔" زمین نے دہائی کچھ اس انداز سے دی کہ ایشان جاہ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چپت لگا گیا۔

"آج ہی نکاح......! جہانگیر بابا جان کا کیا...... کیا حویلی سے کوئی اس نکاح میں شریک نہیں ہوگا؟" جس لڑکی کے گھر جا کر وہ اسے ذلیل کرآئی تھیں وہ ان کے بیٹے کے ساتھ اسی گھر میں لوٹ آئی تھی۔ گو اس نے کچھ جتایا نہیں تھا لیکن صہبا کو اس میں اپنی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی اب بھی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ نکاح رک جائے۔ انہیں اس جلد بازی کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی نہ ہی جہانگیر نے اب تک حویلی میں کسی کو اطلاع دی تھی۔

"حویلی سے کوئی شریک نہیں ہوگا اس نکاح میں انہیں خبر بھی دی تو وہ سب اس نکاح کے خلاف ہوں گے۔ اس لیے نکاح کے بعد ہی بتاؤں گا۔" چودھری جہانگیر کا انداز پُرسوچ تھا۔ سارے خیالات کو پس پشت ڈال کر وہ نکاح کی تیاری کرنے لگے تھے۔

منزہ کی بیٹی سے ان کے بیٹے کا نکاح تھا وہ بے حد خوش تھے۔

جس وقت نے آنا تھا اس سے ڈر کر کب تک بھاگ سکتے تھے۔ واپس حویلی تو جانا ہی تھا یہاں گزارے چند دنوں میں سمہان نے جتنی خوشی اس کے دامن میں بھردی تھی وہ برسوں کے لیے کافی تھی۔ فائزہ کا پیغام ملا تھا انہیں لوٹنے میں تھوڑی دیر ہوجائے گی۔ لڑکیاں اپنی تیاری مکمل رکھیں سمہان بھی شام تک اپنے کام ختم کرکے لوٹ آیا تھا۔ شام کی چائے تینوں نے ساتھ پی تھی ندا اپنے کمرے میں چلی گئی تو عیشال بھی اپنی پیکنگ میں لگ گئی۔ صبح انہیں حویلی کے لیے نکلنا تھا۔

"دروازہ کھلا ہے۔" دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے آواز لگائی اور پھر سے اپنے کپڑوں کو تہہ کرنے لگی۔ اندازہ تھا ملازم ہی ہوں گے لیکن سمہان آفندی کو دروازہ کھول کر آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ایک پل کو رکے۔

"پیکنگ ہو رہی ہے؟" وہ کمرے میں آگیا۔

"جی جناب۔"

"مزید رکنا ہے؟" وہ یہاں سے جانا نہیں چاہ رہی تھی اس کی خواہش کے پیشِ نظر سوال پوچھا۔ وہ ہاں کہتی تو وہ کچھ بھی کرکے مزید کئی دن رکنے کا انتظام کرسکتا تھا۔

"جانتی ہوں ہاں کہا تو تم کوئی نہ کوئی راہ نکال لو گے لیکن اب چلو۔ پہلے ذرا حویلی والوں سے نبٹ آئیں پھر دوبارہ آئیں گے تاکہ سکون سے سب انجوائے کریں ابھی تو بس ایک دھڑکا لگا ہوا ہے۔" کپڑے بیگ میں رکھتے وہ سر جھٹک گئی۔

"کافی سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔" وہ ہولے سے مسکرادیا۔

"جناب...... باتیں تو ہماری شروع سے سمجھداروں والی رہی ہیں آپ نے ہی محسوس کرنا اب شروع کیا ہے۔" وہ

ہولے سے مسکرا کر لا جواب کر گئی۔
"آپ کے لیے یہ گفٹ لایا تھا۔" سبحان آفندی کا ہاتھ جیکٹ سے باہر آیا تو اس میں موجود وائٹ گولڈ کی چین اور چھوٹے سے ڈائمنڈ سے بنے دل کو دیکھ کر وہ بے ساختہ سراہنے پر مجبور ہوگئی۔
"واؤ......! یہ تو بہت خوب صورت ہے۔" وہ جھٹ لے کر اس کی خوب صورتی کو سراہتے سنگھار میز کے آگے کھڑی ہوگئی۔
"پہلے تو کبھی سوکھا گلاب دینے کی بھی ہمت نہیں ہوئی اور اب کہاں تحفے یہ تحفے دیئے جا رہے ہیں۔" چین کو گلے سے لگاتے پسندیدگی بھری نظروں سے دیکھتے وہ شیشے میں پڑتے اس کے عکس کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ابرو چڑھا گئی۔
"شریک حیات کی بات اور ہے ویں ہر کسی کو تحفے تھوڑی نہ بانٹتا پھرتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے قریب ہوا۔
"اوہ......! یعنی نکاح سے پہلے میں بھی ہر کسی کی کیٹگری میں تھی؟" نظریں مزید تیکھی ہوئیں۔
"ناجی مقام تو آپ کا تب بھی خاص ہی تھا۔ مے آئی......" اس کے گلے سے لگے ہار کو دیکھتے اجازت طلب کی۔
"ہوں......" ہنکارا بھر کے وہ اپنے ہاتھ پیچھے کر گئی۔ وہ چین کا لاک کھولنے لگا' شہد رنگ بالوں کو سمیٹ کر بائیں شولڈر پہ کرتی وہ منتظر ہوئی۔
"پتا ہے' یہاں سے واپس نہ جانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔" وہ آئینے میں اس کا عکس دیکھ رہی تھی۔
"وہ کیا؟"
"یہاں رہ کے میں نے تمہارا بہت الگ روپ دیکھا ہے' بہت لونگ' کیئرنگ' جب کہ حویلی کے کاموں میں گھن چکر بنے ہمیشہ کھڑوس ہی لگتے تھے۔ تمہیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ تم ان لمحوں میں رنگ بھی بھر سکتے ہو۔"
"محترمہ...... ہر جذبے' ہر کسی کو دکھائے بھی نہیں جاتے۔ جو کچھ تمہارے لیے بطورت شریک حیات چھپا رکھا تھا وہ پہلے آشکار کرتا بھی تو کیونکر اور ابھی تو شروعات ہے' اس سے کہیں بڑھ کر تمہارے لیے بہت کچھ ہوا کرے گا جسے تم بڑے حق سے خود ہی وصول کیا کرو گی۔" چین گلے میں بہت سج رہی تھی۔
"سچ آ بیوٹی فل......!" عیشال کی انگلیاں دل کو چھوتی اس کی چمک سے منور ہوئی۔
"لائک یو؟" اس کے شانے پر ٹھوڑی ٹکاتے اس کی کمر کے گرد حصار کیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا حیا کی سرخی چہرے پر پھیل گئی تھی۔
"آئے وش یہ پل یہیں ٹھہر جائے۔ تمہارے ساتھ اب تو میرا بھی دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا۔" اس نے ہولے سے کہا تو مسکرا دی تھی۔

نکاح کی تیاری ہو چکی تھی۔ ایشان کے ساتھ جا کر وہ نکاح کا جوڑا لے آئی تھی۔ ایشان جاہ کی ہدایت پر نزمین نے بیوٹیشن کو گھر بلوا لیا تھا۔ ماورا تیار ہو رہی تھی۔ انوشا کے ساتھ یاسر' یسریٰ اور شفق بھی آئے تھے۔ بنگلے کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر سب ہی رشک و حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چودھری جہانگیر بار بار کہیں کھو جاتے تھے۔ اداسی ان کے انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ صہبا اور نزمین بھی اس تقریب کا حصہ تھیں اور ان کے پہناوے ان کے تیوروں کی طرح الگ ہی لگ رہے تھے۔ مولوی صاحب آئے تو نکاح کے کوائف چودھری جہانگیر اور ایشان سے مشورہ کر کے بھرنے لگے تھے۔
بالآخر قبولیت کا لمحہ بھی آن پہنچا' ماورا کے ارد گرد سب موجود تھے مولوی صاحب ایجاب و قبول کے الفاظ دہرا رہے تھے اور ماورا کی نظروں کے سامنے بس ایک ہی چہرہ تھا۔ اس کی ماں کا چہرہ۔ اسے لگ رہا تھا' منزہ کی روح کو سکون مل گیا

ہو۔ یہاں نکاح ہو رہا تھا اور دوسری طرف چوہدری حشمت کی کال جہانگیر کے نمبر پر آنے لگی تھی جسے وہ اس وقت تک نظر انداز کرتے رہے جب تک ایشان جاہ نے سائن نہیں کر دیے اور انہوں نے بیٹے کو مبارک باد نہ دے دی۔

''السلام علیکم! بابا جان۔'' ایشان جاہ کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھتے وہ ایک طرف ہو کر خود ہی کال ملا گئے تھے۔

''یہ ہم کیا سن رہے ہیں جہانگیر......'' چوہدری حشمت کا خشک لہجہ سماعت میں اترا۔

''مجھے نہیں پتا بابا جان آپ نے کیا اور کس سے سنا؟''

''یہ حویلی مزید بھونچال کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' انداز نافہم تھا۔

''اس حویلی کی بات تو آپ رہنے دیں بابا جان......'' ان کے لہجے میں ناگواری سی ناگواری تھی۔

''میں جلد آرہا ہوں آپ کے پاس حویلی۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ ایک دو دن میں فیملی بھی آجائے گی۔ آپ بھی سب کو بلالیں۔ نرمین کا نکاح بھی اب کے کروا کے آؤں گا اور اب اس کام کے لیے تاریخ مقرر نہیں ہوگی۔ بس سب کے پہنچتے ہی یہ کام ہوجائے گا۔ اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ فرصت میں آپ سے بات ہوگی۔ آرہا ہوں میں حویلی بہت جلد۔'' وہ اپنے مخصوص سرد انداز میں کہہ کر فون بند کر گئے۔ انہوں نے یہ بھی جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ انہوں نے کیا سنا اور کس سے۔

❁......❁......❁

وہ شاید مسحور کن خواب دیکھ رہی تھی۔ تیزی سے اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ مندی مندی آنکھیں کھول کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کی آنکھ کس شور سے کھلی ہے۔ دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ وہ دروازے تک آئی۔

''کیا ہوا......؟'' سمہان نے اس کا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔ ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

''تیاری کرلو، ہمیں تھوڑی دیر میں حویلی کے لیے نکلنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس وقت؟'' اس کی ساری نیند ہوا ہوئی۔

''ہاں، شاید کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ داجان کا بلاوا آیا ہے، ڈیڈ نے بھی جلدی پہنچنے کی تلقین کی ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

''پر اچانک کیوں......؟'' عیشال کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ محبت سے اس کے متوحش چہرے کو دیکھنے لگا۔

''معلوم نہیں۔ مجھے بس سب کو لے کر جلدی پہنچنے کو کہا گیا ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرادیا۔

''کہیں......'' وہ خوف زدہ ہوئی۔

''وہم مت کرو، دل مضبوط کر کے چلنے کی تیاری کرو۔ صبح بھی تو نکلنا تھا ناں پھر ابھی سہی۔'' وہ خود کو لاپروا ظاہر کر کے مڑا ہی تھا لیکن اسے چونک کے رکنا پڑا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

www.naeyufaq.com

طلسماتی ساحر کہیں کا

فوزیہ سلیم

"مجھے عدین مراد کہتے ہیں۔" ڈائس کے قریب کھڑی لڑکی کی مائیک پر ابھرتی آواز نے ایک پل کے لیے پورے کمرے میں خاموشی طاری کردی تھی۔ سب ہی سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

"میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا کرتی ہوں۔" آواز میں سختی نمایاں تھی۔

"ارے ہم تو ڈر......ر......ر...... گئے۔" شرارتی لڑکوں کی آواز گونجی۔

"آخری بات......" وہ کلاس پر بھرپور نظر ڈال کر بولی۔

"جی ارشاد۔" کوئی درمیان میں پھر بولا۔

"میں اپنا حق کسی کو نہیں دیتی اور جیت کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ مجھے انا پرست، خودغرض کے نام سے اکثر لوگ یاد کرتے ہیں۔" بشارالاسد کی آنکھیں عدین مراد پر جم سی گئی تھی۔ وہ سانولے سے رنگ کی اسمارٹ اور ذہین و فطین لڑکی تھی، تیکھے نقش کھڑے کھڑے اس کا اعتماد ہی چونکنے پر مجبور نہیں کرتا تھا بلکہ سانولے رنگ پر گہری سبز آنکھیں بھی مائل کرتی اور چونکاتی تھیں، سیاہ کرتے کے ساتھ گول گھیرے والا پلاؤز پہن رکھا تھا، سیاہ دوپٹا چہرے کے ہالے کو نمایاں کررہا تھا۔

وہ اپنی بات مکمل کرکے پُر وقار چال چلتی اپنی نشست پر اس کے برابر آکر بیٹھ گئی تھی۔ بشارالاسد نے گردن موڑ کر دوبارہ اسے نہیں دیکھا تھا، وہ اب ڈائس پر موجود دوسرے اسٹوڈنٹ پر نظریں جمائے عدین مراد کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا یہ اس کا یونیورسٹی کا آخری سال تھا۔ وہ بہت صاف ستھرے کردار کا مالک تھا۔ اس کو نہ صرف اساتذہ پسند کرتے تھے بلکہ لڑکے اور لڑکیاں بھی پسند کرتے تھے۔ نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ ہمیشہ سرگرم اور کامیاب رہتا تھا۔ یونیورسٹی کے در و دیوار بھی اس کی کامیابی کے عادی تھی۔ تالیوں کے بھرپور شور نے چونکنے پر مجبور کردیا تھا، بشارالاسد اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈائس پر آیا۔ عدن مراد نے اس کو بغور دیکھا۔

یونیورسٹی میں اردو مباحثے کا سن کر اس سے رہا نہ گیا تھا، وہ تو دھواں دھار تقریر کرنا خوب جانتی تھی۔ وہ کلاس ون سے پوزیشن لیتی آئی تھی اب تو تقریر کرنے میں وہ اتنی ماہر تھی کہ مقابل کو ہرادیتی۔ وہ جانتی تھی کہ طالب علم ایک جذباتی قوم ہے جس کا فیصلہ دماغ کے بجائے دل سے ہوتا ہے وہ بھی سامعین کی دکھتی رگوں پر یوں ہاتھ رکھتی تھی کہ سننے والا سانس لینا بھول جائے اور خصوصی طور پر جب موضوع غربت اور مہنگائی سے ستائے لوگوں پر ہو تو چھ منٹ کی اس تقریر میں حصہ لینے کے لیے وہ پوری تیاری سے آئی تھی۔ آرٹس کونسل کے اس وسیع عریض ہال میں ابھی ایک منٹ پہلے بشار الاسد کا نام پکارا گیا تھا وہ اس مقرر کو بہت حیرت اور رشک کے ملے جلے تاثرات سے دیکھ رہی تھی۔ اس مقرر کا نام سن کر ہال میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا تھا، عدین مراد نے جدھر بھی دیکھا وہیں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک عالم بے خودی میں اٹھتے اور والہانہ انداز میں تالیاں پیٹتے پایا۔ ان سب کے چہرے خوشی و مسرت کے جذبات سے دمک رہے تھے۔ معمول سے زیادہ شور نے اسے احساس دلایا کہ مذکورہ مقرر کوئی عام مقرر نہیں۔

تالیوں کا شور تھمنے کے بعد اس نے تقریر کی ابتداً ایک تازہ خبر سے کی تھی۔ یہ ایک مشہور اخبار کی سرخی تھی کہ مفلسی سے تنگ آکر ایک عورت نے اپنے دو بچوں کا قتل کردیا تھا۔ ہال میں بیٹھے تمام لوگ سانس روکے اس شخص کے لہجے کے طلسم میں کھوئے ہوئے تھے، وہ تو کوئی ساحر لگتا تھا۔ عدین مراد حیران سی بیٹھی اسے سن رہی تھی۔ بشارالاسد نے مذکورہ موضوع کے کچھ ایسے

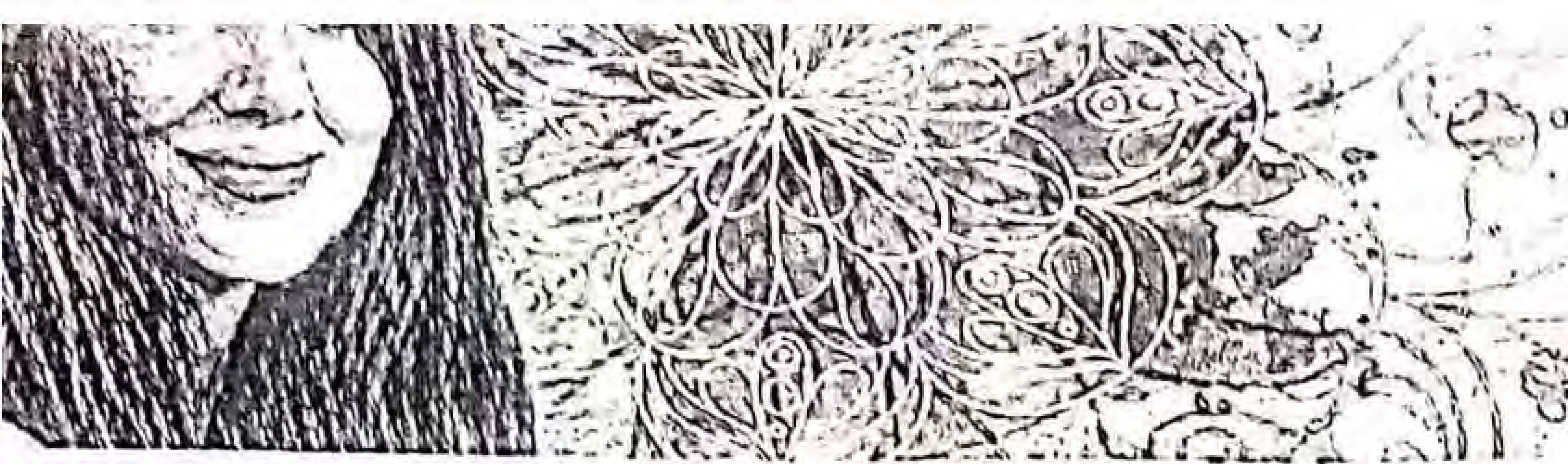

پہلوؤں پہ روشنی ڈالی تھی کہ سب دنگ رہ گئے تھے۔ چھ منٹ کی تقریر پلک جھپکتے میں ختم ہوئی اور تالیوں کی گونج ایک بار پھر بلند ہوگئی تھی۔ وہ نشست کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں ایسی تمکنت اور ٹھہراؤ تھا جو کسی فاتح کی چال میں خود بخود آ جاتا ہے جب وہ سیڑھیاں اتر کر اپنی نشست والی رو میں مڑنے کے لیے سب سے اگلی نشستوں کے سامنے سے گزرا تھا اس نے کئی پروفیسرز کو اپنی کرسیاں چھوڑ کر اٹھتے اور تعریفی انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے دیکھا تھا۔

وہ وہاں کا پرانا کھلاڑی تھا اور وہ نئی آئی تھی وہ جانتی تھی کہ یہاں کسی ایک شخص کا فیصلہ سب کا فیصلہ ہوتا ہے بغیر کسی تحقیق اور تجزیے کے ایسا نہ ہوتا تو معاشرے میں غلط روایات اور غلط اقدار جنم ہی نہ لیتیں جیسے کہ دو دفعہ انتخابات جیتنے والا تیسری دفعہ بھی ضرور جیتتا ہے، لوگ چاہیں یا نہ چاہیں مگر وہ جیتے گا۔ چونکہ وہ مقرر جو دو تین بار جیت جائیں ان کے جیتنے کی سامعین کو عادت سی ہو جاتی ہے اگر ججز وہی رہیں' سامعین وہی ہوتو ان کا جیتنا تو لازمی امر ہوتا ہے اور بشارالاسد کو جیت کی بھی عادت تھی نہ صرف بلکہ یقین بھی پختہ تھا لیکن اس بار بشارالاسد نہیں جانتا تھا کہ قسمت اسے چکر دینے والی ہے۔

دو مقررین کے بعد کمپیئر اب اس کا نام پکار رہا تھا۔

''اب میں دعوت دیتا ہوں عدین مراد کو جو اپنے زریں خیالات کا اظہار کریں گی ان کا تعلق انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔''

تقریر شروع کرنے سے پہلے اس نے ایک بھرپور نظر سامنے موجود سامعین پر ڈالی' ان سب کے چہرے پُرجوش نہیں تھا بلکہ نئے نام اور نئے چہرے کے لیے تجسس تھا۔ اس کی خوب صورت آواز ہال میں گونجی۔ اپنی تقریر کے آغاز میں اس نے ایک نہایت زبردست قسم کا شعر نہایت دل سوز انداز میں پڑھا' آواز اور انداز نے دل پر ہاتھ نہیں رکھا بلکہ دلوں کی دھڑکن تیز کردی تھی۔ بشارالاسد جو انتہائی بے زاری سے دیکھ رہا تھا اب خوب صورت آواز اور لہجے نے اسے ساکت کردیا تھا۔ ساحرہ تو وہ تھی' دھواں دھار قسم کی تقریر نے ثابت کردیا تھا کہ مقابلہ ہوتا کیسے ہے' دھڑکنوں کو تیز کیسے کرتے ہیں' شہ رگ پر ہاتھ کیسے رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ لمحے پہلے مسائل کے بخیے ادھیڑ آیا تھا اب وہ مسائل کا حل پیش کررہی تھی۔ چھ منٹ کی اس تقریر میں اس نے نہ صرف ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کو تالیاں بجانے پر مجبور کردیا بلکہ خوش اور پُرجوش انداز میں کھڑے ہوکر سراہنے پر بھی مجبور کردیا تھا۔ وہ واقعی ساحرہ ثابت ہوئی تھی جس نے ایک لمحے کے لیے سب کو غافل کردیا تھا' اس کا انداز' اس کا تانا بانا، تسلسل اور اس کی فہم و فراست' سب نے مل کر اسے ناقابل تسخیر بنادیا تھا۔ وہ حیران سا اس کے انداز اور اس کے پُرکشش سراپے کو تک رہا تھا اور وہ جیت کو اپنے مقدر میں لکھوا گئی تھی۔ مقابل اگر ٹکر کا ہوتو مقابلہ کرنے کو دل کرتا ہے بشارالاسد نے اس ہار کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی جیت قرار دیا تھا' کوئی

تو ملا جو ذہانت اور وجاہت میں اس کی ہمہ پلا تھی۔
جب ساری یونیورسٹی اسے مبارک باد دے رہی تھی وہ اس کو پُرسوچ انداز میں دیکھتا آنکھوں پر گلاسز لگا کر باہر نکل گیا تھا۔
''ملنا تو تمہیں پڑے گا عدین مراد لیکن ابھی نہیں۔''
وہ کسی دوسرے شہر سے یونیورسٹی میں مائیگریشن کروا کر آئی تھی اگر اس نے اپنے تعارف میں کہا تھا کہ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی ہوں تو ٹھیک ہی کہا تھا نہ صرف انگلش ڈیپارٹمنٹ میں بلکہ پوری یونیورسٹی میں اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ بہت سو نے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر منہ کی کھائی کتنی ہی لڑکیاں لڑکے اس سے متاثر ہو گئے تھے۔

ان کی پریکٹیکل ورکشاپ شروع ہو رہی تھی پروفیسر نے سی وی تیار کرنے کے لیے طالبات کے گروپ بنا دیئے تھے' ساری کلاس اپنی پسند کے طالبات کے ساتھ گروپ دیکھ کر خوش ہو گئے تھے لیکن عدین مراد کو حیرت کا زبردست جھٹکا لگا بشار الاسد کا نام دیکھ کر' ساری کلاس کے گروپ چھ سے آٹھ لڑکیوں پر مشتمل تھے جبکہ وہ ٹوٹلی چار' سارہ جو اس کی کلاس فیلو تھی۔ اس کو دوست تو نہیں کہا جا سکتا البتہ سارا دن گزارنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تو ہوتی ہے نہ سو اس لیے عدین مراد اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کے گروپ میں سارہ، بشار الاسد اور ہنس مکھ سا عثمان تھا جو بشار الاسد کے ساتھ اکثر نظر آتا تھا۔
بشار الاسد کا ایک بہت بڑا گروپ تھا جس میں ہر ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس تھے' بشار الاسد اس گروپ میں ہیڈ کی حیثیت رکھتا تھا' اس گروپ کو پروفیسر اور تمام چوکیدار جانتے تھے۔ کوئی سیاسی مسئلہ ہو یا علمی اسٹوڈنٹس کا اجتماعی معاملہ ہو یا پروفیسر سے لے کر چوکیدار تک کا انفرادی معاملہ ہو یہ گروپ ہر مسئلے کو زیر بحث لا کر حقائق سامنے لاتا اور پھر بھرپور طریقے سے حق کا ساتھ دیتا۔
''سر آپ نے کیا سوچ کر مجھے گروپ بندی میں شامل کیا' میں اپنی سی وی اکیلے تیار کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی گروپ منظور نہیں خصوصی طور پر لڑکے......'' وہ کسی صورت بشار الاسد کے ساتھ مل کر ورکشاپ پر کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے سر کے سامنے انکار کیا۔
''بیٹا ساری کلاس کے گروپ بنے ہیں' ایسے کام آسانی سے ہو جائے تم لوگوں کے پیپرز سر پر ہیں اگر الگ الگ کام ہوا تو بہت ٹائم ویسٹ ہو جائے گا۔ میں نے تو ساری کلاس سے پوچھا تھا' ایک سارہ کے علاوہ تمہارے ساتھ کوئی تیار نہیں تھا۔'' سر کا اطمینان قابل دید تھا۔
''کیوں میں کاٹتی ہوں؟'' وہ منہ پھیلا کر بولی تو زین سر کے ہونٹ پر مسکراہٹ آ گئی۔
''دراصل پوری کلاس تم دونوں کی ذہانت سے خائف ہے' وہ سب جانتے ہیں کہ تم لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے' اس لیے سب نے صاف انکار کر دیا' رہی بات بشار الاسد کی تو اس کے ساتھ تو ساری لڑکیاں تیار ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے نہ صرف سر زین کے ہونٹ مسکرائے تھے۔
''گویا میں اور سارہ لڑکیاں نہیں کوئی اور مخلوق ہیں۔'' وہ تپ کر بولی۔
''بیٹا جی غصہ نہیں کرو وہ تو میں نے سوچا جب انتہائی خطرناک دو ذہین لوگ مل کر پروجیکٹس تیار کریں گے تو نہ صرف تمہارا نام روشن ہوگا بلکہ اس یونیورسٹی کا بھی نام ہوگا اس شہر کا ہوگا' ہمارے ملک کا ہوگا۔''
''بات چونکہ میرے ملک کی عزت کی ہے تو میں مان رہی ہوں ورنہ مجھے قائل کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔'' اس کی بات پر سر نے مسکرانے پر اکتفا کیا' سر نے یہی بات بشار الاسد کو بھی کہی تھی۔
سارہ اور وہ کلاس سے نکل کر انگلش ڈیپارٹمنٹ کے لان میں آ بیٹھی تھیں' ساری کلاس ہی اپنے اپنے

گروپ کے ساتھ کام پر لگ گئے تھے ایک بشارالاسد اور عثمان کا کچھ پتا نہیں تھا اور نہ ہی عدین مراد نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

''عدین یار مجھے تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا اس خشک مضمون پر کیا لکھنا ہے۔'' سارہ نے بہت بے چارگی سے کہا۔

''تو تمہیں کون کہہ رہا ہے کہ تم اپنی چنگی بھر ذہن پر بوجھ ڈالو۔'' عدین سامنے رکھی کتاب پر اہم پوائنٹ لائن اپ کر رہی تھی' کتاب شاید کسی اور کی تھی جو واپس کرنا تھی جب کوئی ان کے قریب آ کر بیٹھا۔

''السلام علیکم! مجھے عثمان پیرزادہ کہتے ہیں۔'' عدین نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسمارٹ سا لڑکا آنکھوں میں شرارت لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔

''اگر آپ عثمان پیرزادہ ہیں تو آپ کو ثمینہ پیرزادہ کے پاس ہونا چاہیے یا پھر شوٹنگ پر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' عدین کو مداخلت کرنا پسند نہیں آیا تھا' وہ سر کھجانے لگا۔

''ویسے سلام کا جواب دیتے ہیں اور مجھے تو عثمان کہتے ہیں۔ آپ کو؟'' عدین نے اسے گھور کر دیکھا۔

''وعلیکم السلام' مجھے وزارت خارجہ کہتے ہیں۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں کہتی پھر کتاب پر جھک گئی۔ اس بار عثمان کا قہقہہ بلند ہوا۔ عدین نے ناگواری سے اسے دیکھا' یونیورسٹی میں وہ بہت مقبول تھی تو کوئی نہ کوئی راستہ روک کے اپنا تعارف کروانے لگتا تھا وہ اس سب کی عادی تھی۔

''مجھے دیکھ کر تو آپ کو حیرت نہیں ہوئی لیکن میرے ساتھ ملک شام کے صدر بھی آئے ہیں بشارالاسد ان سے تو ملیں گی۔'' اب کے عدین مراد چونکی' سر گھما کر دائیں طرف دیکھا وہ اپنے تمام طمطراق کے ساتھ ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا کیسی باغ بہار شخصیت تھی اس کی۔ بے حد ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک' اونچا لمبا گورا چٹا' بلو پینٹ اور گرے شرٹ میں ملبوس ہاتھوں میں فائل اور کچھ کاغذات تھام رکھے تھے اس کی ساحر آنکھیں انہماک کے ساتھ اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔

عدین نے ایک نظر عثمان کو دیکھا جو دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ دوسری نظر پاس بیٹھی سارہ پر جو ابھی بھی اسٹیچو بنی بشارالاسد کو دیکھ رہی تھی۔

''ملک شام کے صدر ہوتے تو زمین پر کب کے بیٹھ گئے ہوتے ہاں پاکستان کے صدر ہیں تو اکڑ کر کھڑے ہونے کے علاوہ ان جیسوں کو کچھ نہیں آتا نہ غریب لوگوں کی آہ و پکار نہ ملک کے حالات۔'' وہ نہ جانے کس بات کا غصہ اتار رہی تھی' آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کچھ فاصلے پر کھڑے بشارالاسد نے سن لی تھی۔ اس لیے تو وہ زیرلب مسکراتا ہوا ان کے قریب آ بیٹھا۔

عدین مراد اپنی ادھوری سی وی اس کے سامنے رکھ دی جو اس نے کام کیا تھا وہ سارے اہم پوائنٹ پر غور کیا جاسکتا تھا سب کچھ ڈسکس کرلیا اور وہ مہذب اور سنجیدہ بنا ورق گردانی کرتا رہا تھا۔ عدین مراد نے دو دن کے اندر کتنا مواد اور معلومات جمع کرلی تھی' وہ اس کی ذہانت سے متاثر نظر آ رہا تھا وہ اگر اچھا مقرر تھا تو اچھا سامع بھی ثابت ہو رہا تھا۔ ابھی ڈھیر سارا کام پڑا تھا انہیں ایگری کلچر اور اردگرد کے ماحول پر کام کرنا تھا۔ کچھ لوگوں کے انٹرویو لینے تھے یونیورسٹی سے باہر نکل کر کچی آبادی کی طرف جانا تھا۔ سڑکوں پر چلتی گاڑیوں پر سرچ کرنا تھا' کتنے ہی لوگوں سے روبرو بات کرنی تھی۔

''آپ تیار ہیں تو چلیں۔'' بشارالاسد نے ایک نظر پرکشش سراپے پر ڈالی تو وہ اور۔ ارہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''جانا کہاں ہے؟'' سارہ نے بے صبری سے پوچھا۔ وہ لوگ چلتے ہوئے بشارالاسد کی گاڑی کے پاس آ گئے۔

''سرنمس کی فیکٹری ہے' باریک بینی سے وہاں کا جائزہ لینا ہے اور پریکٹیکل ورک کرنا ہے۔'' بشارالاسد

نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بتایا۔
"لیکن آج ہم کچی آبادی کی طرف جارہے ہیں' جسے آج اس ورک کی سی وی تیار کرنی ہے۔" عدین نے کہا۔
"یہ وقت اس طرف جانے کے لیے ٹھیک نہیں ہے میں اور عثمان اس طرف کا ورک مکمل کرلیں گے۔ تم لوگ مت خوار ہونا ادھر۔"
"مسٹر بشارالاسد میں کام کے لیے ہی گھر سے نکلی ہوں' کتنا بھی خوار کیوں نہ ہونا پڑے اور مجھے کسی دوسرے کی محنت پر پوزیشن ہولڈر نہیں بننا۔" عدین نے سخت لہجے میں کہا تو بشارالاسد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
"آپ شاید میری بات نہیں سمجھیں' دوپہر کے وقت ان گھروں میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ صرف مرد ہوتے ہیں وہ بھی جو نشہ کرتے ہیں' جوا کھیلتے' تاش کھیلتے ہیں اور آوارہ گردی کرتے ہیں۔ جنہیں ہر غلط طریقے سے اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے' ہوس پوری کرنا ہوتی ہے' عورتوں کی عزت بہت نازک ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اس غلط وقت میں جاکر اپنی عزت کو خطرے میں ڈالیں۔" وہ دھیمے لہجے میں اپنی بات کی وضاحت کررہا تھا۔
"آپ میرے گروپ فیلو ہیں' باڈی گارڈ نہیں اور میں بھی اسی دنیا میں رہتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ کس کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔" اس نے بھی انتہائی غصے سے کہا۔
"بے وقوف بدتمیز......" بشارالاسد نے انتہائی طیش کے عالم میں کار کو ایک جھٹکے سے روکا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا عدن مراد تیزی سے گاڑی سے اتری گندی گلیوں کی طرف بڑھ گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نجانے کہاں غائب ہوگئی۔ بشارالاسد نے غصے کو نہ جانے کیسے ضبط کیا تھا مٹھیاں سختی سے بند تھیں' آنکھوں میں واضح سرخی اتر آئی تھی۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ اسی سڑک کی طرف چل دیا۔

"تم گاڑی اسٹارٹ رکھنا اور موبائل ہاتھ میں اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں تمہیں کال کروں گا۔" عثمان نے باعجلت سارہ سے کہا اور بشارالاسد کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ گھروں میں جھانکتا اندازہ لگارہا تھا کہ عدن مراد کہاں ہوگی جب نسوانی چیخ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ اس آواز کو لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے گھر کی طرف بڑھا اور دروازے کو ٹھوکر مارتا اندر داخل ہوا تھا اس کی انٹری کسی فلم کے ہیرو کی طرح ہوئی تھی اور وہ شیر کی طرح جھپٹ پڑا تھا۔ وہ ایک صحت مند سا اوباش مرد تھا۔ وہ اندھا دھند اس کو ماررہا تھا جب عثمان پہنچا تھا عدین دیوار کے ساتھ لگی کانپ رہی تھی اور بے تحاشا رورہی تھی۔ عثمان نے بھی ان کو مارا پندرہ منٹ کے اندر وہ بھاگ گیا تھا۔ وہ اب بھی دیوار کے ساتھ لگی کانپ رہی تھی' بشارالاسد نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا وہ اندر تک لرز کے رہ گئی تھی۔
"ذہانت اور بہادری میں فرق ہوتا ہے مس عدین مراد۔" وہ اس کے پاس رکا اور دانت پیس کر کہا۔ "بے شک آپ کا کردار بہت بلند ہے اور انا بھی لیکن آج عزت چلی جاتی تو کچھ نہیں رہتا۔" وہ اس پر طنز نہیں کررہا تھا لیکن آئندہ کے لیے باور کرارہا تھا تاکہ پھر یہ غلطی نہ ہو' عدین مراد کے رونے میں مزید شدت آگئی تھی۔
وہ اس کو سہارا دیتا گاڑی تک لایا اور پہلے عثمان اور سارہ کو ان کے گھر چھوڑا پھر عدن مراد کو نزدیکی کلینک لے آیا تھا۔ غالباً اس غنڈے سے بچ بچاؤ کے دوران اس کے پیر میں موچ آگئی تھی۔
"انسان اپنے آپ کو اپنے کردار سے عظیم بناتا ہے۔" اس کو گھر چھوڑتے وقت اس نے بہت آہستہ آواز میں کہا تھا۔
وہ ہیبت ناک مکروہ چہرہ یاد آگیا۔ جو اس کا سب کچھ چھیننے والا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر شدت سے رو پڑی تھی۔

''کیا ہوا...... آپ رو کیوں رہی ہیں' کیا نرس نے ٹھیک سے مرہم نہیں لگایا یا بہت درد ہو رہا ہے؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا تب عدین مراد نے سر اٹھ کر اسے دیکھا جو بہت پریشان نظر آ رہا تھا صرف اس کے لیے۔

''نہیں...... کچھ نہیں ہوا' میں ٹھیک ہوں بس وہ خوفناک منظر یاد آ گیا تھا۔'' عدن مراد نے کہا۔

''ویسے مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا آپ کو چوٹ کیسے لگی؟'' وہ شاید سارے راستے اسی بات کو سوچتا آیا تھا تب ہی اتنا خاموش تھا۔

''جب آپ اس کو مار رہے تھے تب آپ کا پاؤں پیچھے آنے کی وجہ سے میرے نازک پاؤں پر آ پڑا تھا بس تبھی اگلی انگلیوں کا کچومر نکل گیا تھا۔'' وہ بات بتاتے وقت مسکرائی۔

''سوری......'' وہ بس اس ہی قدر ہی کہہ پایا تھا۔

اسائنمنٹ مکمل ہونے کے بعد ان کے امتحانات شروع ہونے والے تھے' ان کا یونیورسٹی میں آخری ہفتہ تھا۔ سارے لمحے ہوا بن کر تحلیل ہو گئے تھے' لگتا ہی نہیں تھا کہ آخری سال ختم ہو رہا ہے اور وہ سب بچھڑنے والے ہیں۔ اس لیے جس کے دل میں کچھ خاص کوئی معافی تلافی' گفٹ' فون نمبرز سب کچھ ایک دوسرے سے شیئر کر رہے تھے۔ وہ اس دن بڑی تیاری سے آئی تھی۔ یونیورسٹی کے باہر گاڑی لاک کر کے باہر نکلی تو نظر سامنے بشارالاسد پر پڑی جو کڑی دھوپ میں سن گلاسز لگائے کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ عدین مراد جانتی تھی وہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے' اس کے ہاتھ میں پھول تھے وہ اسے نظر انداز کرتی تیزی سے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ بشارالاسد اس کا وہیں انتظار کرتا رہا تھا اور جب وہ واپس آئی تو پھول اس کے سامنے کر دیئے تھے۔

''پلیز بشارالاسد ابھی کچھ کہہ کر میرے پیروں میں بیڑیاں مت ڈالنا۔ میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں اور پھر یہ جگہ اس بات کے لیے ٹھیک نہیں، یہاں ہم تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں نا کہ رشتے بنانے۔'' بشارالاسد نے بغور اس کو دیکھا۔

''تھینک یو...... تم نے یہ نہیں کہا کہ تم انگیج ہو۔'' وہ بھرپور انداز میں مسکرایا اور پلٹ گیا تھا۔

بشارالاسد نے دوبارہ اس کا راستہ نہیں روکا تھا' دل میں اس کا مقام مزید بلند ہو گیا۔ امتحانات کے بعد شاندار رزلٹ آیا تھا' سر نے ٹھیک کہا تھا وہ دونوں مل کر کام کریں گے تو شاندار رزلٹ آئے گا۔ انہوں نے شاندار نمبرز لے کر ریکارڈ توڑا تھا نہ صرف یونیورسٹی بلکہ ضلع میں پوزیشن لے کر ملک کا نام روشن کر دیا تھا۔

کتنے ہی برس خواب کے دریچوں میں ڈھل کر چاہتوں کا سماں بن گئے تھے' بشارالاسد نے اپنے باپ کے کاروبار کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دی تھی لیکن عروج کو چھونے سے پہلے اس نے عدین مراد کے والدین سے کردار کی بلندیوں کو چھوتی اس وجود کو مانگ لیا تھا پھر دو برس بعد جب اس نے اپنی الگ شناخت و مقام سب بنا لیا تو وہ اس کے روبرو تھا۔ منہ دکھائی کا گفٹ دیتا وہ چاروں شانے چت ہو گیا تھا' وہ ایک بار پھر نم آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

''کیا کوئی نظارہ اس سے بھی دلفریب ہو سکتا تھا؟'' وہ بے اختیار ابولا تھا۔

www.naeyufaq.com

شاہدہ اور رضیہ خالہ

کرن نعمان

"شاہدہ بیٹا...... مردے نہلانے والی ماسی آ گئی ہے۔" شاہدہ جو ساس کی چارپائی سے لگی ان کا چہرہ یک ٹک دیکھ رہی تھی ساتھ والی پڑوسن بلقیس آپا کی بات سن کر چونک گئی۔

"کیوں......؟" اس نے حیرت سے بلقیس آپا سے پوچھا۔

"بیٹا...... رضیہ خالہ کو غسل دینا ہے۔"

"بلقیس آپا پچھلے پانچ سالوں سے ہفتے میں دو بار میرے ہاتھ ہی انہیں غسل دیتے رہے ہیں اور اب جب ان کی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی تو آپ کا کیا خیال ہے میں کسی اور کے حوالے کردوں گی ان کا بے جان جسم' نہیں آپا ان کی یہ آخری خدمت بھی میں ہی اپنے ہاتھوں سے کروں گی آپ ماسی کو واپس بھیج دیں۔" بوڑھے' اپاہج کمزور اور لاغر وجود جوان صحت مند انسانوں کے لیے اعصابی بوجھ جیسے ہوتے ہیں' جوڑوں کے درد جیسے ہوتے ہیں' اٹھتے بیٹھتے دکھتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی انسان کو اپنے ہی درد سے پیار ہوجاتا ہے۔ شاہدہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا' پانچ سال اس کی ساس یعنی رضیہ خالہ فالج کا شکار ہوکر بستر پر پڑی تھیں' تب شاہدہ نے ان کی خدمت کا بیڑا اللہ کے خوف سے اٹھایا تھا پر جس ہمت اور لگن سے اس نے ان کے تمام کام کیے اللہ نے ایک عجیب سی محبت اس کے اندر پیدا کردی تھی۔

شاہدہ رضیہ خالہ کی بھانجی تھی۔ ان کی بیوہ بہن بے بی کی اکلوتی بیٹی' انہوں نے اس کے پیدا ہوتے ہی اسے اپنے سلیم کی دلہن مان لیا تھا۔ پر دوسری طرف اکبر خالو کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ اپنی بھتیجی سلمٰی کے لیے۔ جب کہ سلیم کو کسی کے دل کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اپنے آپ میں ہی مگن بڑا ہورہا تھا۔ اکبر خالو کا شمار کھاتے پیتے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ رضیہ خالہ ان کی منظور نظر تھیں خوب کھلایا پلایا اور سونے سے پیلا کیے رکھا۔ سارے خاندان میں رضیہ خالہ کی دھوم تھی سب کا خیال تھا رضیہ خالہ کی بہوؤں کو سسرال سے زیور بہت ملے گا پر جب سلیم کی شادی کا وقت آیا تو عجیب ہی منظر سامنے آیا تھا جس دن رضیہ خالہ اپنی بہن کے گھر اس کی بیٹی شاہدہ کو بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کرکے آئیں اس سے ایک دن پہلے اکبر خالو نے اپنے بھائی اصغر سے اس کی بیٹی سلمٰی کے رشتے کے سلسلے میں بات کرلی تھی۔

"لے بھئی رضیہ' میں تجھ سے ایک ضروری بات کرنے لگا ہوں۔" رات جب بڑے سے صحن میں چارپائیاں بچھ گئیں' کھانا لگ گیا دونوں ماں باپ اور بیٹے سلیم' سلمان کھانے کے ساتھ خوش گپیاں بھی کررہے تھے تو اکبر نے بات شروع کی۔

"میں نے ہی تجھ سے ایک بات کرنا ہے سلیم کے ابا۔" ماں باپ کی باتیں سن کر دونوں بیٹے حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے۔

"چل پھر پہلے تو ہی کر۔" اکبر خالو نے لاڈ سے کہا۔

"نہ...... نہ پہلے تو نے بات شروع کی ہے تو بتا اپنی بات۔" رضیہ خالہ شوہر کو عزت دیتے ہوئے بولیں۔

"میں نے اصغر سے بات کرلی ہے سلیم اور سلمٰی کے رشتے کے لیے۔" رضیہ خالہ چند لمحے شوہر کو دیکھتی رہی پھر تو جیسے پھٹ سی گئیں۔

"تجھے سارے زمانے میں ایک وہی ہی چالاکو ماسی ملی تھی میرے سلیم کے لیے۔ ایک دفعہ بھی تجھے میری بیوہ بہن کی یتیم بچی کا خیال نہ آیا' اپنی بہن ہی نہ پوچھے گی تو اور کون جائے گا اس کے دروازے پر رشتہ لے کر۔"

"نہ تو تیری بہن بیوہ ہوگئی تو اس میں میرا یا میرے بیٹوں کا کیا قصور کہ تیری بہن کی کالی کلوٹی بیٹی کو گھر اٹھا لائیں۔" شاہدہ کالی کلوٹی تو ہرگز بھی نہ تھی پر گوری چٹی میں بھی اس کا شمار نہ ہوتا تھا۔ دبتا ہوا سانولا رنگ تھا اس کا۔

”کان کھول کر سن لے رضیہ میں اصغر سے بات کرچکا ہوں اور اب سلمٰی ہی اس گھر میں بہو بن کر آئے گی۔“ اکبر نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے۔

”میں بھی بے بی سے بات کرچکی ہوں‘ میری بہو صرف شاہدہ بنے گی۔“ رضیہ خالہ نے کھانے کے ساتھ ساتھ ہری مرچ بھی چبالی۔

”چلو پھر دیکھتے ہیں۔“ اکبر خالو نے اپنا رومال زور سے جھٹک کر پھر سے کندھے پر ڈالا اور پاؤں میں چپل ڈالتا چارپائی سے اٹھ گیے۔

”ہونہہ......“ رضیہ خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے دور دفعہ کرتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ سلیم اور سلمان اس ساری صورت حال پر ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ کر رہ گئے۔

اس کے بعد تو دونوں میاں بیوی میں رسہ کشی شروع ہوگئی۔ دونوں رشتے کی اس رسی کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے پر رضیہ خالہ زیادہ سیانی نکلی۔ اسے پتا تھا کہ زیادہ دیر تک اس کی شوہر کے آگے نہ چل سکے گی۔ اس لیے ایک رات وہ سلیم کے پاس آئی اور اسے اپنے سر کی قسم دے کر بولی کہ تو شاہدہ کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اتنے دنوں سے جاری ماں باپ کے بیچ شاہدہ سلمٰی کی تکرار میں سلیم نے اپنا دل ٹٹولا تو اسے بھی اپنے دل کا جھکاؤ شاہدہ کی طرف ہی لگا وہ خود سادہ لوح انسان تھا‘ اس لیے اسے سیدھی سادھی شاہدہ ہی اپنے لیے مناسب لگی شاہدہ کی بہ نسبت سلمٰی خوب گوری چٹی‘ فیشن ایبل اور طرح دار تھی‘ بہرحال ماحول کو مزید تناؤ سے بچانے کے لیے سلیم نے اکبر سے شاہدہ کے سلسلے میں بات کی۔

اکبر کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا جہاندیدہ آدمی تھا جانتا تھا کہ جوان بیٹے کے خلاف جا کر سوائے بیٹے کو باغی کرنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا‘ پر اپنی انا کو تسکین دینے اور بھائی سے کی ہوئی بات نبھانے کے لیے اس نے الگ راہ نکال لی تھی اس نے رضیہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شاہدہ کو بہو صرف اس شرط پر بنائے گا جب رضیہ سلمٰی سلمان کے لیے بیاہ کرلائے گی یہ سن کر رضیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے سلیم کے ابا پتا بھی ہے کہ سلمٰی سلمان سے دو سال بڑی ہے۔“

”تو‘ کیا ہوگیا اگر بڑی ہے تو‘ دنیا میں بڑی لڑکی اور چھوٹے لڑکے کی شادی نہیں ہوتی‘ تیری اپنی چاچی بھی تو تیرے چاچے سے کئی سال بڑی ہے۔“ یہ سن کر رضیہ کچھ گھبرائی واقعی اس کی چاچی اس کے چاچے سے بڑی تھی‘ جائیداد کے چکر میں اس کا دادا بڑی عمر کی عورت کو بیاہ لایا تھا۔

”پر اگر سلمان نہ مانا تو......؟“ رضیہ بددلی سے بولی۔

”تو پھر جیسے سلیم کو منایا ہے ویسے ہی سلمان کو بھی منا لینا۔ سن لے رضیہ میں تیری پسند پر راضی ہوگیا ہوں تو تجھے بھی میری بات نبھانی پڑے گی ورنہ پھر خود ہی دونوں بیٹوں کی باراتیں چڑھا لینا میرے بغیر میں دونوں کی شادی میں شامل نہ ہوں گا۔“ اور یہ تو رضیہ جانتی تھی کہ اکبر کے تعاون

کے بغیر وہ کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ اس لیے چپ چاپ مان گئی۔ شاہدہ سلیم کی دلہن بن کر گھر آ گئی اس نے اپنی خدمت اور اطاعت گزاری سے سب کے دل جیت لیے پر اکبر خالو کے دل میں لگی گرہ نہ کھول سکی۔ رضیہ خالہ اکبر خالو کے ساتھ جا کر سلمیٰ کے لیے باقاعدہ رشتہ ڈال آئیں' سلمان شہر کے کالج میں پڑھتا تھا۔ اس پر شہر کی ہوا کا اثر تھا۔ اسے اپنے لیے سلمیٰ بالکل مناسب لگی اکبر خالو اور دونوں بیٹوں نے مل کر شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا ایک اچھے علاقے میں دو منزلہ مکان خریدا جس کے لیے اکبر خالو نے کافی ساری زمین بیچ دی تھی۔

سلیم کو اس کے حصے کی زمین بیچ کر جنرل اسٹور کھلوا دیا۔ سلمان نے شہر میں نوکری کر لی اس کے حصے کی زمینیں بیچ کر اکبر خالو نے اس کی شادی خوب دھوم دھام سے کروی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ آگے سرک رہا تھا۔ سلیم گھر کے نچلے حصے میں رہتا تھا اور سلمان اوپر والے حصے میں۔ اکبر خالو اور رضیہ خالہ نیچے سلیم کے ساتھ رہتے تھے۔ پر اکبر خالو کا جھکاؤ ہمیشہ سلمیٰ کی طرف رہا اور وہ اپنا زیادہ وقت بھی ان کے پورشن میں ہی گزارتا تھا' رضیہ خالہ کا دلی جھکاؤ شاہدہ کی طرف تھا وہ صرف ضرورتاً ہی اوپر سلمیٰ کی طرف جاتی تھی۔ پر سلمیٰ اور شاہدہ میں کبھی ان بن نہیں ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بنا کر رکھی تھی۔

سلمیٰ میں چالاکی زیادہ تھی' وہ شاہدہ سے اپنے کام نکلواتی رہتی تھی۔ اپنی بچیاں اس کے پاس چھوڑ کر آرام سے میاں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلی جاتی تھی' شاہدہ بازار جاتی تو سلمیٰ اپنا سامان بھی منگوا لیتی تھی۔ جب کہ اکثر شاہدہ پیسے بھی نہیں لیتی تھی۔ سلمیٰ کی دو بیٹیاں تھیں اور شاہدہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی...... شاہدہ کی شادی کو پندرہ سال بیت چکے تھے اور سلمیٰ کی شادی کو تیرہ سال' گھر کا زیادہ تر خرچا سلیم نے اٹھایا ہوا تھا کیونکہ سلمان نے کبھی لگ کر کام نہ کیا تھا۔ آئے دن نوکری چھوڑ دیتا تھا۔ سلیم اور شاہدہ ان دونوں میاں' بیوی کو احساس دلائے بغیر ان کے اکثر خرچا پورے کردیتے تھے پر ایک دن اچانک وہ ہوا جس کی کسی کو امید نہیں تھی۔

"سلیم بھائی' سلیم بھائی۔" دروازے پر تیز دستک کے ساتھ فضل کی گھبرائی ہوئی آواز بھی آئی۔

"لو کیا ہو گیا فضل بھائی سب خیریت تو ہے ناں؟"

سلیم اسٹور پر جانے کے لیے جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا' آدھا ادھورا ناشتہ کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فضل سلیم کا پڑوسی تھا اس کی پلاسٹک کے برتنوں کی دکان تھی۔

"سلیم بھائی جلدی چلو۔ تمہاری دکان کے تالے ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو فضل بھائی؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

سلیم کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بنا گھر میں کچھ بتائے دکان کی طرف دوڑ پڑا پر پیچھے اکبر خالو اور شاہدہ نے بھی فضل اور سلیم کی باتیں سن لی تھیں' اکبر خالو بھی ناشتہ ادھورا چھوڑ کر بیٹے کی طرف چل دیے اور شاہدہ دروازے کے پاس کھڑی ہاتھ مسلتی دل میں قرآنی آیتوں کا ورد کر رہی تھی۔

رات سب گھر والے صحن میں پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ سلیم کی دکان میں چوری ہوئی تھی۔ چور دو لاکھ روپے اور کافی سارا سامان لے گئے تھے۔ جس میں کمپنیوں کے فریج اور ڈیپ فریزر بھی تھے۔ سلمان آج کل پھر فارغ تھا۔ کچھ لوگوں کا ادھار بھی چکانا تھا' بڑی مشکل آ گئی تھی' سلیم کو حالات دوبارہ بہتری کی طرف لانے کے لیے کافی سارے پیسوں کی ضرورت تھی۔ زمینیں ساری بک چکی تھیں' پر رضیہ خالہ اور سلمیٰ کے پاس زیور بہت تھا' شاہدہ کو تو اکبر خالو نے صرف دو سونے کے سیٹ چڑھائے تھے' میکے سے بھی اسے زیور کے نام پر صرف بالیاں اور لاکٹ ہی ملا تھا۔ رضیہ خالہ نے اپنا کچھ زیور دینا چاہا تو اکبر خالو نے سختی سے منع کر دیا پر سلمیٰ کو اکبر خالو نے چار سیٹ بارہ چوڑیاں نتھ بندیا اور پنجا کلہ بھی چڑھایا تھا۔ سلیم بھاوج سے تو اس کا زیور نہیں مانگ سکتا تھا پر ماں کے آگے ہاتھ پھیلا گیا۔ رضیہ خالہ کو اپنا زیور بہت پیارا تھا اور کس عورت کو نہیں ہوتا خاوند کے بعد اس کے زیور ہی اس کی بادشاہت ہوتی ہے

پر اولاد کی تکلیف کے آگے وہ اپنا سب کچھ ہار دیتی ہے۔ رضیہ خالہ بھی اپنا زیور بیچنے کو تیار تھیں پر اکبر خالو ظالم سماج بن کر بیچ میں آ گئے۔

''دیکھ رضیہ، سن لے میری بات جتنا زیور سلیم کو دے گی اتنا ہی سلمان کو بھی دینا ہوگا کیونکہ وہ بھی اس وقت بے روزگار ہے۔''

''سلیم کے ابا کچھ اللہ کا خوف کر، مشکل کا وقت آیا ہے اس وقت ضرورت سلیم کو ہے۔'' اکبر خالو کی بات پر سب ہی حیران تھے بس ایک سلمٰی کے دل میں سکون اترا تھا۔

''ہاں تو میں نے کب کہا کہ تو سلیم کو نہ دے میں تو صرف دونوں بھائیوں میں انصاف چاہتا ہوں، اگر سلیم پر پھر ایسی مشکل آ گئی تو تو نے پھر باقی کا زیور اٹھا کر اسے دے دینا ہے سلمان کا حق تو پھر مارا جائے گا ناں۔'' دکھ سے سلیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پر بولا کچھ نہیں۔

''سلیم کے ابا یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے، کل کس نے دیکھی ہے۔'' رضیہ خالہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اکبر اتنا خود غرض بھی ہو سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے، کل کسی نے نہیں دیکھی پر میں دور کی نظر رکھتا ہوں اور پھر دیکھ ناں میں نے بھی تو اپنی ساری زمینیں دونوں میں بانٹ دیں کس کا حق تو نہیں مارا تو بھی ایسا فیصلہ کر جس سے کل کسی کو شکایت نہ ہو۔''

''رہنے دو ابا جی مجھے نہیں لینا زیور شیور کچھ نہ کچھ کر لوں گا میں آپ چاہو تو سارا زیور سلمان کو دے دو، میں گلہ نہیں کروں گا۔'' یہ کہتا سلیم اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا۔ اس سے ابا کا خود غرضانہ رویہ اب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اکبر خالو نے دزدیدہ نظروں سے سلیم کو دیکھا اور پھر ہنکارہ بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات گئے سلیم گھر آیا تو شاہدہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی کھانا گرم کر کے لائی اور اداس بیٹھے سلیم کو اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ سلیم نے خاموشی سے دو چار نوالے کھائے اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ شاہدہ نے نوالہ پلیٹ میں ہی چھوڑا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہ سلیم نہ بس کر کوئی مرد ایسے روتے ہیں میں ہوں نہ تیرے ساتھ۔'' شاہدہ سلیم کا ہاتھ تھپک تھپک کر اسے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ دروازے کی جھری سے یہ سارا منظر رضیہ خالہ دیکھ رہی تھیں، وہ پہلے ہی بیٹے کے لیے پریشان تھیں اور شوہر کے رویے پر کڑھ رہی تھیں دونوں طرف کی پریشانی لے کر بستر پر لیٹیں تو پھر اٹھ نہ سکی۔ منہ اندھیرے اکبر خالو نے سلیم کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا سلیم اور سلمان ماں کو ہسپتال لے کر بھاگے پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ رضیہ خالہ پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا کچھ دن رضیہ خالہ کو ہسپتال میں رکھ کر بیٹے واپس گھر لے آئے، ہسپتال کا بل بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا، شاہدہ نے اپنی بالیاں اور لاکٹ بیچ دیئے اور جب رضیہ خالہ گھر آئیں تو وہ سلیم کمرے میں جا کر پریشان لیٹ گیا، اکبر خالو الگ پریشان پریشان اور شرمندہ سے رضیہ خالہ کے بستر کے پاس بیٹھے تھے۔ شاہدہ نے اپنے سسرالی زیور کے ڈبے الماری سے نکالے اور سلیم کے پاس لے آئی۔

''یہ کیا ہے۔''

''میرا زیور ہے۔''

''تو......''

''بیچ دے۔''

''تیرا دماغ ٹھیک ہے...... اس کے سوا اور کیا ہے تیرے پاس؟''

''تو ہے میرے پاس، میرے بچے ہیں، تو یہ بیچ کر کام بڑھا جب چل جائے تو پھر سے بنوا دینا۔'' سلیم نے شاہدہ کے ہاتھ سے ڈبے لے کر ایک طرف رکھے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

''چل چل، اب زیادہ مسکے نہ لگا۔'' شاہدہ نے کچھ شرما کے کچھ اٹھلا کے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیے۔

''تو بہت اچھی ہے شاہدہ۔'' سلیم کی آنکھوں میں سارے جہاں کا پیار سمٹ آیا تھا۔

''یہ تو مجھے پتا ہے۔'' اس بات پر سلیم کے لب مسکرا اٹھے۔

وقت گزر جاتا ہے پر اپنے نشان، کبھی گلے شکوؤں، کبھی اچھی یادوں اور کبھی احسان مندیوں کی صورت چھوڑ جاتا ہے مشکلات کہیں تو انسانوں کے دل تنگ کر دیتی ہیں اور کہیں دل بڑے کر دیتی ہیں شاہدہ نے دل بڑا کر کے اپنا سارا زیور سلیم کو دیا جسے بیچ کر سلیم نے دوکان میں ضروری سامان ڈالا اور اپنی دوکان داری بڑھانے لگا۔ معاشی حالات میں کچھ بہتری آئی پر دوسری طرف ایک بڑا امتحان رضیہ خالہ کی صورت اس گھر کی دونوں عورتوں پر آ پڑا' رضیہ خالہ کا سیدھا ہاتھ اور سیدھی ٹانگ بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے بولنے میں بھی مشکل تھی کوئی بات واضح طور پر سمجھا نہیں سکتی تھیں' ساس کو سنبھالنے کی ذمہ داری سلمیٰ شاہدہ دونوں نے برابر بانٹ لی تھی۔

پر یہاں بھی سلمیٰ اپنی چالاکیوں سے باز نہ آئی۔ جب اس کے کرنے کا وقت آتا تو اوپر سے نیچے ہی نہ آتی تھی اور جب شاہدہ کر دیتی تو نیچے آ کر بہانے بنانے لگ جاتی۔ شاہدہ رضیہ خالہ کو وقت پر پرہیزی کھانا پکا کر کھلاتی انہیں صاف کرتی وقت پر دوائیاں دیتی ہر دو دن بعد ان کے کپڑے بدلتی اور ہفتے میں دو بار بڑی مشکل سے انہیں نہلاتی' سلمیٰ آہستہ آہستہ بالکل ہی اپنی جان چھڑاتی جا رہی تھی جو سب کو نظر آ رہا تھا۔ شوہر یا سسر کچھ کہتے تو سو مجبوریاں نکال کر بیٹھ جاتی اور کہتی اوپر سے نیچے جا کر کرنا آسان نہیں۔ بھابی تو ہر وقت وہی چلتی پھرتی ہیں' میرے لیے اپنے کام چھوڑ کر جانا مشکل ہے۔ دونوں اس بات پر چپ ہو جاتے۔ پر اس ساری صورت حال سے شاہدہ چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ شوہر کے سامنے سلمیٰ کی لاپرواہیوں کا رونا روتی تو وہ چپ کر کے سن لیتا پر اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ جو ایک دن سلمان کے ساتھ بحث میں پھٹ نکلا' سلیم نے سلمیٰ کو خوب برا بھلا کہا' شاہدہ اسے روکتی رہی جس پر سلمان نے اس سے کہا۔

''بس بس زیادہ ڈرامے نہ کرو شوہر کو دیورانی کے خلاف بھڑکاتی ہو اور اوپر سے اسے روک کر اچھی بننا چاہ رہی ہو۔'' صدمے سے شاہدہ کی زبان گنگ رہ گئی۔ جب کہ سلیم نے بیوی سے بدتمیزی پر چھوٹے بھائی کو تھپڑ دے مارا۔ دونوں بھائی گتھم گتھا ہو گئے تو سلمیٰ بولی۔

''بس پڑ گئی دل میں ٹھنڈ' ہو گیا کلیجہ ٹھنڈا جو چاہتی تھیں وہ کروا ہی لیا ناں۔'' شاہدہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بڑی مشکل سے اکبر خالو نے دونوں کو الگ کروایا سلمان گھر سے باہر چلا گیا اور سلمیٰ بکتی جھکتی اوپر چلی گئی۔

''شاہدہ تو نے اب ہاتھ نہیں لگانا اپنی خالہ کو۔ دیکھ لیا ہم نے تو کتنی سگی نکلی اپنی خالہ کی۔ اب رضیہ کا جو بھی کام ہوگا وہ سلمیٰ کرے گی۔'' اکبر خالو کی بات سن کر شاہدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہونہہ' کر لیا سلمیٰ نے۔'' سلیم نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''نہیں کرتی تو نہ کرے میں خود کر لوں گا آخر کو میری بیوی ہے پر اب مرتی ماں کے سامنے جوان بیٹوں کی لڑائی منظور نہیں ہے مجھے۔'' اس سارے فساد میں کسی کو خیال ہی نہیں رہا کہ یہ سب کچھ رضیہ خالہ کے سامنے ہو رہا تھا۔ شاہدہ نے رضیہ خالہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاہدہ اندر ہی اندر تڑپ اٹھی۔

''ہائے کیسی بے بسی ہے رضیہ خالہ کے جوان بیٹے لڑ رہے ہیں اس کے سامنے اور وہ ہاتھوں سے تو کیا زبان سے بھی انہیں روک نہیں سکتی۔''

سلمیٰ نے دو دن خوب ساس کی خدمت کی پر جو بھی کام کرتی ساتھ ہی ساتھ زور زور سے بڑبڑائے بھی جاتی' تیسرے دن سے ڈنڈی مارنی شروع کر دی' ناشتے میں رس اور چائے پلائی تو دن کو بھی وہی کھلا دیا کرتی' ایک وقت باتھ روم لے گئی تو باقی سارا دن اوپر سے نیچے ہی نہیں آتی تھی۔ رضیہ خالہ کی حاجت بستر پر ہی خطا ہوتی رہتی کمرہ بدبو سے بھر جاتا۔ اکبر خالو بھی اس صورت حال سے پریشان رہنے لگے۔ شاہدہ کا احساس جرم بھی اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا کہ کاش وہ سلیم کو نہ بتاتی چپ چاپ سہتی

رہتی تو اچھا تھا' ایسے دل برے تو نہ ہوتے' ایک دن اس نے دیکھا اکبر خالو خود رضیہ خالہ کا بستر صاف کر رہے تھے' شاہدہ کی نظریں شرم سے زمین میں گڑ گئیں۔

اس دن شاہدہ تمام حالات کو صحیح کرنے کا عزم اور حوصلے سے فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے فیصلے پر صبر اور استقامت مانگی تھی۔ شاہدہ نے حلوہ پکایا اور شیشے کا پیالہ بھر کر اوپر لے آئی۔ سلمیٰ اور سلمان دونوں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ شاہدہ کو دیکھ کر حیران ہوئے۔

''سلمیٰ اور سلمان اگر تم دونوں یہ سمجھتے ہو کہ یہ لڑائی میں نے کروائی ہے تو میں تم دونوں سے معافی مانگتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ حالات پھر سے پہلے کی طرح اچھے ہوجائیں' رضیہ خالہ میری خالہ ہیں ان کی خدمت میرا فرض ہے سلمیٰ کا نہیں' آج کے بعد ان کا ہر کام میں کروں گی اور کبھی کسی سے شکوہ نہیں کروں گی۔ سلمان' سلیم تیرا بڑا بھائی ہے تو چل کر اسے منا لے میرے بھائی' وہ تیرا برا نہیں چاہتا۔''

''ہاں ہاں سلمان بھابی صحیح کہہ رہی ہیں پھر وہ بڑی ہیں خود چل کر اوپر آگئی ہیں تو تم بھی ناراضی چھوڑو سلیم بھائی کے پاس چلے جاؤ۔'' سلمان سلمیٰ کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ ابھی چند لمحوں پہلے شاہدہ جب اوپر نہیں آئی تھی تو سلمیٰ کی زبان مسلسل شاہدہ اور سلیم کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ سلیم کی سپورٹ کے بغیر سلمان کا ہاتھ تنگ تھا' اس کا گزارا بہ مشکل ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور شاہدہ کے ساتھ نیچے آ کر سلیم کے گلے لگ گیا۔ شاہدہ نے اکبر خالو سے بھی معافی مانگی اور بتادیا کہ اب رضیہ خالہ کی تمام ذمہ داری میری ہے اکبر خالو نے سکون کا سانس لیا اور دوسری طرف سلمیٰ کی جان میں جان آئی۔ اگلے دن سے شاہدہ نے اپنا دن تقسیم کرلیا' رضیہ خالہ' گھر کے کاموں اور اپنے بچوں میں' شروع شروع میں شاہدہ کا بہت دل دکھتا کہ وہ کتنی ہی تنگ کیوں نہ ہو وہ کسی سے اظہار نہیں کرسکتی اور پھر اس پر سب سے ہنس ہنس کر بات بھی کرنا پڑتی تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ذمہ داری اس پر بوجھ ہے پر جلد ہی

naeyufaq.com

مغربی اور مشرقی ادب کی منتخب کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ نئے اُفق کراچی

لفظ لفظ ہنگامے سطر سطر تجسس سے بھرپور تحریریں
ایسی کہانیاں جو اس سے قبل آپ نے نہیں پڑھی ہوں گی

مغربی ادب سے انتخاب
جرم وسزا کے موضوع پر ہر ماہ منتخب ناول
مختلف ممالک میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں
معروف ادیبہ زرین قمر کے قلم سے مکمل ناول
ہر ماہ خوب صورت تراجم دیس بدیس کی شاہکار کہانیاں

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی
خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کے عنوان سے مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (03008264242)

Info@naeyufaq.com
(021)35620771/2
0300-8264242

اس نے اپنے دل میں بھرے سواد کو راہ دے دی۔

اب وہ اپنی ہر بات رضیہ خالہ کو سنانے لگی۔ میاں سے شکوے، دیور دیورانی کے گلے، بچوں کی غلطیاں، شرارتیں، اپنی تھکن اور دردوں کی داستان سب کچھ، رضیہ خالہ بھی اسے سمجھ گئی تھیں جب بھی وہ ان کے پاس بیٹھ کر اپنا دکھڑا سناتی تو وہ الٹے ہاتھ سے اس کا گوڈا تھپکتی جاتی وہ ہنستی تو ساتھ مسکرا دیتی اور جب وہ روتی تو رضیہ خالہ کی آنکھیں بھی نیر بہانے لگتیں، اگلے پانچ سالوں میں رضیہ خالہ کمزور سے کمزور تر اور ان کی حالت ابتر ہوتی گئی ان کے جسم کا گوشت ختم ہو کر ایک پنجر کی صورت رہ گیا۔ ایک دن شاہدہ انہیں دلیہ کھلا کر اٹھنے لگی تو انہوں نے اپنے نحیف ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ ان کا اشارہ سمجھ کر ان کے قریب آئی تو انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولیں۔

"شاہدہ تو جنتی ہے دیکھنا میرا رب تجھے کیسے بھاگ لگائے گا۔ اللہ تجھے سدا سہاگن رکھے اور تجھے تیرے بچوں کی بہاریں دکھائے۔" شاہدہ خالہ کو صحیح صحیح بولتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ رات سلیم آیا تو خوشی خوشی اسے بتانے لگی۔

"سلیم مجھے لگتا ہے خالہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ آج اس نے بڑی صاف آواز میں باتیں کی ہیں۔"

"واقعی...... چل اچھا ہے اماں ٹھیک ہو جائے گی تو تیری پریشانی کچھ کم ہو جائے گی۔" سلیم نے شاہدہ کو تسلیم دی۔

"لے میں کوئی اپنی پریشانی کی وجہ سے تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ وہ تو بے چاری خود اتنی تکلف میں ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" اور اسی رات اللہ نے اس کی سن لی۔ صبح جب شاہدہ رضیہ خالہ کو صاف کرنے ان کے پاس آئی تو اسے احساس ہوا کہ روح کا پرندہ جسم کے پنجرے سے اڑ چکا ہے۔ رضیہ خالہ کی میت کو غسل شاہدہ نے اپنے ہاتھوں سے دیا اور اپنے ہاتھوں سے ہی کفن پہنا کر رخصت کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ساس کے مرنے پر بہو ایسے پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھی جیسے اس کی کوئی ہر دلعزیز سہیلی دنیا سے چلی گئی ہو۔ سوئم کے اگلے دن سلیم دکان پر چلا گیا، بچے اپنے اپنے مدارس چلے گئے۔ شاہدہ اکیلی بیٹھی دانے پڑھ رہی تھی تب ہی سلمٰی اس کے پاس آئی۔

"وہ بھابی! اکبر چاچا رضیہ چاچی کے سیف کی چابی مانگ رہا ہے۔" شاہدہ کو حیرت ہوئی پھر بھی اس نے اٹھ کر چابی دے دی۔ پر یہ دیکھ کر اس کے دکھ کی انتہا نہ رہی کہ اکبر خالو نے رضیہ خالہ کا سارا زیور نکال کر سلمٰی کو دے دیا۔ رات سلیم آیا تو شاہدہ اسے بتاتے بتاتے رو پڑی۔

"ہائے، سلیم خالو کو ذرہ خیال نہ آیا کہ تو بھی خالہ کا بیٹا تھا میں بھی اس کی بہو تھی اور پھر سب سے بڑھ کر اکیلی پانچ سال تک خالہ کی خدمت کرتی رہی، اس کا یہ صلہ دیا خالو نے۔" دکھ سلیم کو بھی بہت ہوا پر اسے تسلی دینے کے لیے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا۔

"او جھلی! اپنی خدمتوں کا صلہ بندے سے کیوں مانگ رہی ہے تجھے صلہ ابا نہیں میرا رب دے گا، دکھ مجھے بھی اس بات کا بہت ہے، یہ دیکھ میں اسی بات کا گلہ ابا سے کروں گا تو کہیں ایک بار پھر کوئی لڑائی نہ ہو جائے۔ وہ زیور ابا نے اماں کو بنا کر دیا تھا اماں خود بانٹ جاتی تو اچھا تھا اب تو ابا ہی مالک ہے تو دل چھوٹا نہ کر دیکھنا میرا رب تجھے کیسے بھاگ لگائے گا جو نیکی تو نے اماں کے ساتھ کی ہے وہ کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔" شاہدہ کے آنسو رک گئے۔ اس نے حیرت سے سلیم کو دیکھا۔

"سچ سلیم، خالہ نے مرنے سے پہلے مجھ سے یہی بات کی تھی جو تو کہہ رہا ہے۔"

"واقعی......" سلیم نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"پر سلیم میں اب سلمٰی کے ساتھ مزید نہیں چل سکتی اسے اب اپنا باورچی خانہ الگ کرنا پڑے گا۔" شاہدہ اور سلمٰی ایک ہی باورچی خانہ استعمال کرتی تھیں، سلمٰی نے ہمیشہ پکانے کا حساب کتاب تھوڑا رکھا پر شاہدہ کھلا پکاتی اور کھاتی تھی۔ سلمٰی اور اس کے بچوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ شاہدہ کی ہانڈی میں سے جب چاہیں اور جتنا چاہیں لے لیں روکا کبھی سلمٰی نے بھی نہیں پر وہ اتنا کم بناتی کہ شاہدہ کی کبھی

ہمت ہی نہ ہوئی کہ اس کی ہانڈی میں سے کچھ لے لے۔

"یہ تیرا حق ہے شاہدہ تیری اپنی گرہستی ہے تو جیسے چاہے ویسے چلا میں تیرے ساتھ ہوں۔" سلیم کی بات سن کر شاہدہ نے سکون سے سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

اگلے دن اس نے اکبر خالو سے کہہ دیا کہ سلمٰی سے کہہ دیں اب اپنا باورچی خانہ الگ کرلے۔ اکبر خالو کو یقین تھا کہ شاہدہ اور سلیم سارا زیور سلمٰی کو دینے پر جھگڑا کریں گے پر جب ایسا کچھ نہ ہوا تو وہ اندر ہی اندر احساس شرمندگی میں مبتلا ہوگئے اس لیے چپ چاپ شاہدہ کی بات سن لی اور سلمٰی کو کہہ دیا کہ اپنا باورچی خانہ اپنے حصے میں ہی بنائے سلمٰی کو یہ بات گراں گزری تھی پر چونکہ فیصلہ اکبر چاچا نے کیا تھا اس لیے ماننا ہی تھا ورنہ تو وہ نیچے صحن میں جا کر اپنا کھانا پکاتی اور اپنے برتن دھو کر آ جاتی تھی۔ باقی سب تو شاہدہ ہی سنبھالتی تھی پر اس کے اصل رنگ تو اب کھلنے تھے۔

اکبر خالو کا رجحان ہمیشہ سے سلمٰی کی طرف زیادہ رہا تھا۔ شاہدہ سے اسے ازلی بُرخاش تھی اس لیے رضیہ کا سارا زیور سلمٰی کو دینے کے بعد اس نے مستقل سلمٰی کے پاس ہی رہنا اور کھانا پینا شروع کردیا۔ سلمٰی اپنا مطلب نکلوا چکی تھی۔ اس لیے اب اسے چاچا کھٹک رہا تھا۔ چند دن تو سلمٰی نے چاچا کا خوب خیال کیا۔ پر آہستہ آہستہ اس کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا۔ سلمٰی چاچا کو زیادہ منہ نہ لگاتی واجبی سا کھانا دیتی نہ اس کے کپڑے دھوتی نہ استری کرتی جب وہ خود اپنے لیے کچھ کرنے لگتا تو جھڑک دیتی اس کی دیکھا دیکھی اس کی بیٹیاں بھی دادا کو جھڑکتی رہتیں جلد ہی اکبر خالو کو احساس ہوگیا کہ اس نے سلمٰی پر بھروسا کر کے سخت غلطی کی ہے، جس کا اب مداوا ممکن نہیں چند ہی دنوں میں اکبر خالو مرجھا کر رہ گئے۔ سلمٰی کا رویہ اسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ دن بدن اسے شاہدہ کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک دن اس پریشانی میں گھر سے نکلے تو روڈ پر چلتے ہوئے ایک گاڑی سے ٹکرا کر شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔

ہوش آنے پر اکبر خالو نے آنکھیں کھولیں تو شاہدہ کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہدہ نے اس کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا اور جب کچھ حالت سنبھلی تو اسے ڈسچارج کروا کر اپنے گھر لے آئی۔ وہیں جہاں رضیہ خالہ رہتی تھیں اسی رات اکبر خالو نے ہاتھ جوڑ کر شاہدہ سے معافی مانگی۔

"نہ خالو نہ یہ تو کیا کر رہا ہے ایسے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر مجھے شرمندہ نہ کر جو میرا نصیب نہیں تھا مجھے نہیں ملا اور پھر زیور ہی سب کچھ تو نہیں ہوتا اس کے بغیر بھی زندگی اچھی گزر جاتی ہے۔"

"شاہدہ.....! تو اللہ کی چنی ہوئی بندی ہے تیری خالہ تجھے سمجھ گئی پر میں بدنصیب کھوٹے کھرے کی پہچان نہیں کرسکا۔ میری دعا ہے اللہ تجھے اور سلیم کو بے انتہا خوشیوں سے نوازے۔"

"بس خالو تیری دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔" شاہدہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

اس رات ایک دعا اکبر خالو نے اپنے لیے بھی رب کے حضور گڑگڑا کر کی۔

"یا اللہ پانچ سال تک شاہدہ نے تن تنہا رضیہ کو سنبھالا اب مجھے اس کے لیے کوئی امتحان نہ بنانا۔ یا اللہ تو مجھے جلد اس دنیا سے اٹھا لے۔"

اور اللہ نے جلد ہی اکبر اور شاہدہ کی مشکل آسان کردی۔ کچھ عرصے میں ہی شاہدہ کو اس کی خدمتوں کے صلے میں اللہ نے بھاگ لگا دیئے۔ سلیم کا کاروبار بہت اچھا ہوگیا۔ اس نے آس پاس کی دکانیں خرید کر اپنے جنرل اسٹور کو بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں تبدیل کرلیا۔ اس کا ایک بیٹا انجینئر بن گیا اور دوسرا بینک میں بڑے عہدے پر فائز ہوگیا۔ بیٹی اچھے خاندان میں شادی ہو کر دبئی چلی گئی۔ اسے اپنی زندگی میں سب کچھ مل گیا۔ پر رضیہ خالہ جیسی سہیلی نہ مل سکی جو خلا اس کی زندگی میں رضیہ خالہ کے جانے سے پیدا ہوا تھا وہ خلا پُر نہ ہوسکا تھا۔

www.naeyufaq.com

قسط نمبر ۱۱

عشق نگر کے مسافر

ندا حسنین

(گزشتہ قسط کا خلاصہ)

تجل فطرتاً لالچی عورت ہوتی ہے۔ بچپن میں جو اس کے ساتھ زیادتی ہوئی اس کا بدلا وہ اب مردوں سے اپنا مقصد پورا کر کے لے رہی ہوتی ہے۔ محمود بیگ اس کی فطرت سے واقف ہوتا ہے جب ہی یاور بخت کے لیے اس کو استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یاور بخت کی غیر موجودگی میں تجل سے ملنے یاور بخت کے گھر جاتا ہے۔ تجل اس کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ تجل اب یاور بخت کی ہمراہی میں پاکیزہ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ پر محمود بیگ اس کے دل میں خوف پیدا کرتا پھر سے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ عاصم صبیحہ کو پا کر بے انتہا خوش ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ صبیحہ اپنا ماضی بھول جائے اور اس کے ساتھ خوش گوار زندگی گزارے پر صبیحہ کو کبھی کبھی یاور بخت اس طرح یاد آتا ہے کہ وہ عاصم کے سامنے اس کا ذکر کر جاتی ہے۔ صبیحہ اور عاصم کی زندگی میں ایک خوشگوار سی تبدیلی آنے والی ہوتی تھی۔ صبیحہ ماں بننے والی ہوتی ہے اور عاصم اس کا بے حد خیال رکھ رہا ہوتا ہے۔ تجل محمود بیگ کی بات مان لیتی ہے۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں رہتا۔ یاور بخت کو دھوکے میں رکھ کر ہی وہ یاور سے اپنا مطلب پورا کر سکتی تھی۔ ورنہ تجل کی حقیقت جان کر وہ اسے بھی گھر سے چلتا کر دیتا، یہ باتیں محمود بیگ نے اس کے دماغ میں بٹھا دیں تھیں۔ یاور بخت سیاسی مصروفیت سے جب واپس آتا ہے تو تجل اسے ماں بننے کی خوش خبری سناتی ہے۔ یاور بخت خوش ہو جاتا ہے اور مٹھائی لے کر صبیحہ کے گھر جاتا ہے۔ جہاں سے اسے صبیحہ کی دوسری شادی کی خبر کے ساتھ ماں بننے کی اطلاع بھی ملتی ہے اس کی خوشی دم توڑ جاتی ہے۔ فاریہ اپنے باپ دلاور بخت کا ماضی جاننا چاہتی ہے۔ دلاور بخت کے ماضی میں ایسا کیا ہوا تھا جو ایک بند کمرے میں قید تھا۔ اس بند کمرے سے فاریہ کو چند چیزیں مل جاتی ہیں جن کو وہ قمر جہاں کے سامنے رکھ کر الجھ جاتی ہے۔ بند کمرے میں رکھی تصویر بہت حد تک شبنم سے شباہت رکھتی ہے۔ کمرے میں کچھ اخبار کے تراشے بھی ہوتے ہیں جن میں مہرو اعظیم کے قتل کے حوالے سے درج ہوتا ہے اور اس حوالے سے جاننے کے لیے وہ اور قمر جہاں اخبار کے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ حماد ارسل بھائی کے لیے فکر مند ہوتا ہے تب ہی شبنم کو ہمراہ لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور یہاں آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ ارسل بھائی ٹراما میں چلے گئے ہیں اس خبر سے وہ حیران رہ جاتا ہے۔ حماد فیروز حسن کو ارسل کے ٹراما میں چلے جانے کا بتاتا ہے۔ تب وہ اس کو ارسل کے پہلے بھی اس کیفیت کا شکار ہونے کا بتا کر مزید حیران کر دیتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

کیسے کہوں کہ وہ غم الفت فریب تھا
کیسے یقین کروں کہ زلیخا چلی گئی

بے یقینی ان کے جسم میں سرائیت کرنے لگی تھی۔
"کیسے ممکن ہے بھلا۔ وہ تو بانجھ تھی؟" اس کے اندر سے کسی نے سوال اٹھایا۔
"بانجھ ہونا تو فقط تمہارا الزام تھا حقیقت نہیں۔" مرتضیٰ شفیق کی کرخت آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
"اگر وہ اولاد دے سکتی تھی تو پھر مجھے کیوں نہیں دی۔ میرے ساتھ کیوں یہ ڈراما رچایا۔ کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا تھا اگر اولاد کی خوشی وہ مجھے دے دیتی تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ ہمارا گھر آباد رہتا۔ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوتے ہم ایک دوسرے کے ساتھ۔" صبیحہ کے گھر سے واپسی کے سفر پر وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہو گئے تھے۔
"تم کیوں پچھتا رہے ہو یاور بخت۔ کیا خبر یہ بات جھوٹی ہو۔ مرتضیٰ شفیق نہیں چاہتے ہوں کہ صبیحہ تم سے ملے اور تمہاری کوئی خوش خبری اسے حسد کی آگ میں جلا کر بھسم کردے۔ اس لیے ممکن ہے کہ انہوں نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔" عقل نے تاویل دی۔
"ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ یہی ہوا ہوگا۔ مرتضیٰ شفیق نے یقیناً جھوٹ بولا ہوگا۔ صبیحہ اتنے سالوں سے میرے ساتھ تھی اگر وہ صلاحیت رکھتی تو مجھے اولاد ضرور دیتی۔ آخر بجل نے بھی تو مجھے خوشی کی خبر سنائی تھی۔ وہ بھی سنا سکتی تھی۔ مرتضیٰ نے ضرور مجھے پچھتاوے کی آگ میں جھلسانے کے لیے یہ سب کچھ کہا ہوگا مگر اب یاور بخت کسی کے بھی دام میں نہیں آئے گا۔" خود سے تہیہ کرتے ہوئے انہوں نے گاڑی یک دم روک دی۔ سامنے مسجد تھی۔ جہاں سے عصر کی آذان کی صدا گونج رہی تھی۔
"اتنی بڑی خوشی ملی تمہیں ایک زمانے کے بعد۔ اللہ کا شکر ادا کرنا تو لازم ہے یاور بخت ایک زمانے سے تم نے رب کے آگے ماتھا نہ ٹیکا۔ ایک وہ ہی تو ہے جو اپنے آگے سر بسجود لوگوں کی جھولیاں بھرتا ہے۔" ان کے دل نے فلاح کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ دل کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے مسجد کی جانب بڑھنے لگے۔

کرتے ہیں سجدوں میں ہم
اپنی ہی حسرتوں کی خاطر اقبال
اگر کرتے صرف عشق خدا میں
تو کوئی حسرت ادھوری نہ رہتی

مسجد سے نکلے تو انہیں کچھ فاصلے پر وہی جوتشی بیٹھا نظر آیا۔ جس نے کچھ ماہ قبل ان کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر خبردار کیا تھا۔ کچھ ساعتوں تک وہ تھوڑی پر ہاتھ جمائے سوچتے رہے پھر اس نجومی کے پاس آگئے۔ اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا کر وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ نجومی نے چونک کر یاور بخت کو دیکھا اور پھر یاور بخت کا ہاتھ تھام کر لکیروں کی زبان پڑھنے لگا۔
"یہ لکیریں بڑی جانی پہچانی لگ رہی ہیں۔ صاحب..... شاید میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں انہیں۔" اس نے قسمت کی لکیروں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
"ہاں کچھ ماہ قبل تم نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ میری بلندی تک جاتی ہر لکیر پر ایک ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہے۔ جو مجھے پستی میں دھکیل دیتا ہے۔" یاور بخت نے مسکراتے ہوئے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
"ایسا ہی ہے صاحب۔ ایسا ہی ہے۔ وہ ناگ بہت قریب ہے۔ بہت خوفناک فریب ہے۔ آپ کی لکیریں کہتی ہیں یہ سب کچھ....." وہ عجیب سے انداز میں کہتا چلا گیا۔ تب ہی یاور بخت اسے سختی سے ٹوک گئے۔

''بس کرو۔ نوسرباز ہو تم' کوئی علم نہیں تمہیں ان لکیروں کا جانتے بھی ہو میری قسمت کے ستارے بلندی پر ہیں۔ ان لکیروں نے پہنچایا ہے مجھے بلندی پر۔ میں جو کچھ اس زندگی سے چاہتا تھا۔ مجھے مل گیا اور تم بکتے ہو میں فریب میں مبتلا ہوں ارے نجومی کے روپ میں بہروپے...... اتنا ہی تمہارا علم ہوتا تو آج اپنی لکیروں کو پڑھ کر کسی بلند مقام پر پہنچ گیا ہوتا مگر تو بے علم و بے فیض ہے ہونہہ۔'' یاور بخت نے نجومی کو بری طرح جھاڑتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''صاحب میں صرف ان لکیروں کو پڑھتا کر ان کا تعاقب کرتا ہوں مگر ان لکیروں پر میرا کوئی زور نہیں۔ میں ان کی راہیں تبدیل نہیں کرسکتا۔ یہ لکیریں حکم کی تو تابع ہیں مگر میری نہیں کسی اور کے حکم کی۔'' جوتشی نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔

''اچھا پھر کس کے حکم کی تابعدار ہیں یہ لکیریں؟'' یاور بخت نے متعجب لہجے میں سوال کیا۔

''اس ذات کی تابعدار ہیں' جس کی اطاعت ہم سب پر لازم ہے۔ جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ جو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو بس پھر وہ ہو جاتا ہے۔'' اس کے لبوں پر ہنوز مسکراہٹ تھی۔ یاور بخت تمسخرانہ انداز میں ہنس دیئے۔

''یہ تو تم نے بڑی کمال کی بات بتائی۔ بے وقوف انسان یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر تو کیوں یہاں بیٹھا خالی خولی میں اپنی دکان چمکا رہا ہے۔ جب نہ تو تیرے بس میں کچھ ہے نہ تو تیرے علم میں ہے۔''

''نہیں صاحب علم میں ہے...... بہت کچھ ہے۔ ان لکیروں پر انسان کے اعمال کا بھی بڑا زور ہے۔ رب تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے نیک نیتوں سے اور عمل کرنے والوں سے۔ تب مقدر بدل دیتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک روشن تھی یاور بخت کچھ ثانیے تک اس کا چہرہ تکتے رہے۔

''فلسفی کہیں کا۔ کچھ علم نہیں بس جملے بناتا رہتا ہے۔ ہونہہ۔'' پھر بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹک کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔

''ایک بات یاد رکھنا صاحب۔ بہت مشکل وقت نزدیک ہے۔ کڑا امتحان ہے۔ انصاف کرنا...... انصاف ورنہ ایسا خسارہ تمہاری ذات سے چمٹے گا کہ نسلیں برباد ہو جائیں گی۔'' اس نے یاور بخت کو اٹھتے دیکھا تو خبردار کیا۔ یاور بخت نے غضب ناک انداز میں نجومی کو گریبان سے پکڑ کر کہا۔

''چند سکوں کی خاطر میری نسلوں تک نہ پہنچ بڈھے...... ورنہ تجھے جلا کر راکھ کردوں گا۔'' وہ ان کی دھمکی اور غضب و غضب کو دیکھ کر بری طرح سہم گیا۔ ارد گرد سے لوگ جمع ہونے لگے۔ چند ایک نے بیچ بچاؤ کرا کے نجومی کو یاور بخت سے چھڑا لیا۔

یاور بخت سر جھٹک کر وہاں سے چلے گئے تھے ان کی سمجھ میں اس وقت نجومی کی باتیں نہیں آرہی تھیں پر یہ طے تھا کہ آنے والا وقت ان کے لیے بڑی آزمائش لے کر آنا تھا۔

⁂

وہ بگڑے ہوئے مزاج کے ساتھ گھر پہنچے مگر بجل کو دیکھ کر تمام پریشانی عنقا ہوگئی۔ وہ تکمیل کے مراحل سے گزرتی نڈھال ہوئے جارہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنا' اترنا' اس کے لیے دوبھر ہوا جارہا تھا۔ صبیحہ اور نجومی کی باتیں یاور بخت کے ذہن سے نکلنے لگیں۔ بجل کی خراب حالت فوری طور پر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا گئی تھی۔

''اپنا خیال رکھو بجل۔ تم نہیں جانتیں تمہاری ذات' میرے لیے اب کتنی اہم ہوگئی ہے۔'' جب سے اولاد کی خوش خبری ملی تھی تب سے یاور بخت اٹھتے بیٹھتے یہ بات ضرور بجل کو باور کراتے تھے۔ حسب معمول آج بھی وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مخمور نگاہوں سے تکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''جانتی ہوں یاور جی۔'' بجل نے ایک تفاخر کے عالم میں مسکرا کر کہا۔

''اچھا' تو کیا یہ بھی جانتی ہو کہ پہلے تم میری زندگی کا ایک اہم حصہ تھیں اور اب زندگی بن گئی ہو۔'' یاور بخت اس کے حسن کے سحر میں کھوتے ہوئے بولے۔

"جانتی ہوں۔"

"اچھا اور کیا کیا جانتی ہو تم تجل میرے بارے میں؟" یاور بخت نے اس بار اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
تجل نے ایک معنی خیز نگاہ یاور بخت کے چہرے کی اندر رکی اور پھر ذو معنی لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھ سے زیادہ اب آپ کو کوئی جان ہی نہیں سکتا یاور جی۔ آپ کے دل کا حال عیاں ہے۔ مجھ پر آپ کا حال، مستقبل اب صرف تجل ہے۔ آپ کی نگاہوں میں پنہاں ہے میں نے کھوج لیا ہے۔"

"جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تب میں مبہوت سا رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے قبل تم سا حسین بے مثال نہیں دیکھا۔ ان دنوں جب تم میرے ساتھ ہوتی تھیں تب تمہیں دیکھ کر میں خود پر سے قابو کھونے لگتا تھا۔ تم میرے حواسوں پر بھی سوار ہوگئی تھیں۔ تمہاری موجودگی میں میں سب کچھ بھولنے لگا تھا۔ کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا مجھے۔" یاور بخت نے تجل کو دیکھ کر بے خودی کے عالم میں کہا۔

"صبیحہ بھی نہیں؟" تجل نے ان کی مخمور نگاہوں میں جھانکتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"کہاناں کوئی بھی نہیں، صبیحہ بھی نہیں۔" یاور بخت صبیحہ کے ذکر پر بدمزہ ہوتے ہوئے بولے۔

"اس کے باوجود آپ کو مجھ سے عشق نہیں ہوا یاور جی۔ آپ نے میری سنگت میں حسین لمحات بتائے اور پھر تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔" تجل نے شکوہ کیا۔

"تنہا نہیں، تمہیں بطور امانت عزیز کو سونپ کر گیا تھا۔" یاور بخت نے وضاحت دی۔

"بطور امانت نہیں، بطور محبوبہ اور محبوباؤں کو ہمارے معاشرے میں قابل احترام نہیں بلکہ ایک گالی سمجھا جاتا ہے یاور جی۔" تجل نے تمسخرانہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر جواب دیا۔ یاور بخت نظریں چرانے پر مجبور ہو گئے۔

"بس کچھ دنوں کی بات تھی تجل پھر تو تمہیں بیوی بنا کر اس گھر کی ملکہ بنا دیا۔" یاور بخت نے کمزور سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں مگر ان کچھ دنوں کی اذیتیں غضب کی تھیں۔" تجل نے آہ بھرتے ہوئے یاور بخت کو سلگایا۔ یاور بخت کے ذہن کے پردے میں بھی وہ وقت خوفناک پرچھائیوں کی صورت گھومنے لگا۔ خاموشی کچھ پل پیسے کے لیے ان دونوں کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔

"ایک بات پوچھوں یاور جی؟" تجل نے سلسلہ کلام کا پھر سے آغاز کیا۔

"اجازت...... تم نے میری زندگی میں داخل ہوتے وقت نہ لی۔ اب بات کرتے وقت کیسی اجازت تجل۔" یاور بخت خیالوں میں گم عجیب سے لہجے میں کہہ گئے۔

"انداز بیاں کچھ تیکھا سا ہے جان حیات کا۔" تجل نے جھٹ ان کے لہجے پر چوٹ کی۔ یاور بخت اس کی بات پر بے اختیار مسکرا اٹھے اور پھر نرمی سے گویا ہوئے۔

"خفا نہ ہو۔ زندگی نے بڑے تلخ موڑ سے روشناس کردیا ہے۔ راستوں کی تلخی کبھی کبھی لہجے میں در آہی جاتی ہے۔"

"جانتی ہوں...... ان راستوں کی تلخیاں صرف لہجے کو ہی نہیں بعض اوقات انسان کو سرتاپیر متاثر کر دیتی ہیں۔" تجل نے بھی کھوئے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

راستے اگر اتنے تلخ نہ ہوتے
نہ جانے تب ہم کیسے لوگ ہوتے

"تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟" یاور بخت نے استفسار کیا۔

"اتنی بڑی خوشی دے رہی ہوں، محبت کے اس عظیم نذرانے پر مجھے انعام کیا دیں گے؟" تجل کے انداز میں شوخی کا

عنصر نمایاں ہوا۔

"جو تم کہو جو تم چاہو۔" یاور بخت مسکراتے ہوئے بولے۔

"اس عظیم محل کی ملکہ بنایا ہے تو محل بھی ملکہ کے نام ہونا چاہیے۔ کیوں یاور جی؟" تجل نے اٹھلا کر جواب دیا۔

"ایسا ہی ہوگا اب سے یہ محل اور جو کچھ بھی کہو گی تمہارے نام ہو جائے گا۔" یاور بخت جذبات کی رو میں بہتے ہوئے وعدہ کر گئے۔

"سچ......! وعدہ بھول تو نہیں جائیں گے یاور جی؟" تجل سرخوشی کے عالم میں بولی۔

"نہیں...... بالکل بھی نہیں۔" یاور بخت اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

"ایک بات پوچھوں تجل؟" وہ یک دم بولے۔

"ہزار بات پوچھیں جناب۔" تجل کی آنکھیں بھی مسکرائیں۔

"یہ راجدھانی تمہارے نام ہو جائے تو بے دخل تو نہ کرو دو گی جان حیات کو؟" یاور بخت کا لہجہ ہی نہیں؟ نگاہیں بھی سوالیہ تھیں تجل کے چہرے سے مسکراہٹ گم ہوگئی۔

"ایسا سوچا بھی کیسے......" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"بس یوں ہی خیال گزرا تو پوچھ لیا مگر جواب جانتا ہوں۔ ایسا کرنے کی ہمت نہیں تم میں۔" یاور بخت مغرور سے لہجے میں گویا ہوئے۔ تجل نے چند ثانیے تک ان کے چہرے پر رقص کرتے تکبر کو دیکھا اور پھر نظریں چرا گئی۔

"کچھ دن قبل وہ آیا تھا۔" مرتضیٰ شفیق نے چائے کا گرم گھونٹ بھرتے ہوئے اچانک کہا۔ وہ اور صبیحہ گھر کے لان میں بیٹھے ڈھلتے سورج کی تمازت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صبیحہ کچھ دیر قبل ہی عاصم کے ہمراہ ننھے نومولود کو لیے گھر آئی تھی۔ عاصم اسے یہاں چھوڑ کر کسی کام کی غرض سے واپس چلے گئے تھے۔ زچگی کے بعد پہلی بار میکے آمد پر صبیحہ بے حد مسرور تھیں۔ ان کی خواہش پر ہی مرتضیٰ شفیق نے چائے اور ناشتے کے دیگر لوازمات کا انتظام لان میں کروایا تھا۔

"کون آیا تھا......! کس کی بات کر رہے ہیں آپ بابا جان؟" صبیحہ اپنے بیٹے سے باتوں میں مگن تھیں۔ اس کی کلکاریوں پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ مرتضیٰ شفیق کی بات پر انہوں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا۔

"یاور بخت...... اس بد بخت کی بات کر رہا ہوں۔" مرتضیٰ شفیق کی نگاہیں بیٹی کے چہرے پر جمیں۔ صبیحہ نے بے اختیار ان کی سمت دیکھا۔ ان کی توجہ اپنے بیٹے کی جانب سے مکمل طور پر ہٹ گئی تھی۔ ان کے لب ہولے سے ہلے۔

"یاور بخت......!" انہوں نے غیر محسوس انداز میں نام دہرایا۔

"ہاں...... وہی بد بخت آیا تھا۔ مٹھائی لے کر۔ تمہیں ڈھونڈ رہا تھا اور کہہ رہا تھا خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ میں باپ بننے والا ہوں۔" مرتضیٰ شفیق صبیحہ کو تفصیل سنانے لگے۔ صبیحہ چپ سادھے ان کی بات سنتی رہیں۔

"وہ باپ بننے کا مژدہ سنا رہا تھا۔ اس پل مجھے اس شخص پر بڑا ترس آیا۔ میں حیران بھی ہوا کہ جس انسان نے میری بیٹی پر ظلم کی انتہا کر دی اس پر بھلا کیسے ترس آسکتا ہے مگر صبیحہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔ جسے پڑتی ہے اس کا حال دیکھ کر ترس آ ہی جاتا ہے بیٹی۔" وہ کہتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے رکے۔ صبیحہ ہنوز خاموش تھیں۔ ان کی گود میں چند ماہ کا مہمان کلکاریاں مارتے مارتے تھک سا گیا تو اونگھنے لگا۔

"وہ بڑے تکبر سے تمہیں محرومی کی آگ میں جلانے لگا تھا مگر اس کے سارے ارادے ہوا ہو گئے۔ میرے اللہ نے تمہیں بروقت سرخرو کر دیا صبیحہ اس پل مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا۔ تم عاصم کی رفاقت میں ماں بننے کے

اعزاز پر بھی فائز ہوگئی ہو۔ میں نے تمہارے گھر سے آئی مٹھائی اسے کھلائی۔ بڑے تعجب سے پوچھنے لگا۔ کس بات کی ہے مٹھائی تو میں نے کہا صبیحہ نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اس بات کی ہے مٹھائی۔ اس کا منہ دیکھنے لائق تھا۔ کچھ کہنے سننے کے قابل نہ رہا تھا۔ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا مگر افسوس ہوا۔ وہ واقعی بدبخت ہے۔ نہ جانے کس کا گناہ ہے جو اپنے سر پر تاج کی طرح سجائے گھوم رہا ہے۔" مرتضیٰ شفیق افسوس بھرے لہجے میں ساری کتھا سنا گئے۔

"اب وہ آئے تو مجھ سے ملاقات ضرور کرائیے گا۔ اسے کہیے گا کہ میرا انتظار کرے اور مجھے ضرور اطلاع کیجئے گا۔ میں دلاور کے ساتھ اس بدبخت سے ملنے آؤں گی۔" یاور بخت کی داستان سن کر صبیحہ مستحکم لہجے میں بولیں۔ آخری جملہ انہوں نے اپنی گود میں سوئے بیٹے کے ماتھے کو چوم کر ادا کیا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ وہ پھر آئے گا؟" مرتضیٰ شفیق تعجب سے بولے۔

"ہاں وہ ضرور آئے گا بابا جان...... میں اسے جانتی ہوں۔ اس کے لیے مجھ سے ایک ملاقات بے حد ضروری ہوگئی ہے۔" صبیحہ نے ٹھوس لہجے میں اپنے بیٹے دلاور کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ آج کل ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ سیاست میں قدم رکھتے ہی ان کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ آبائی زمین جو ایک مدت سے محمود بیگ کے قبضے میں تھی۔ وہ اب ان کی تحویل میں آ گئی تھی۔

"بس اب اس خبیث محمود بیگ کا انتظام کرنا ہے۔ اسے کس طرح راستے سے ہٹاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ علوی صاحب؟ وہ آن کی آن میں کمپنی کے نصف شیئر کا مالک بن بیٹھا ہے۔" وہ افسوس میں علوی صاحب کے ہمراہ بیٹھے کافی دیر تک منصوبے بناتے رہے۔ دفعتاً محمود بیگ کی آمد ہوئی۔

"چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات بتا رہے ہیں کہ مجھے شدت سے یاد کیا جا رہا ہے۔" محمود بیگ نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا تو یاور بخت جل بھن گئے۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو محمود بیگ؟" وہ سخت لہجے میں بولے۔

"تمہاری طرح اب میں بھی اس کمپنی میں اہمیت رکھتا ہوں یاور بخت' تمہارے برابر کا حصہ دار ہوں۔" محمود بیگ نے جتاتے ہوئے کہا تو یاور بخت بھنا اٹھے۔

"ہونہہ...... خواب سے جاگ جاؤ' محمود بیگ' جس طرح تمہارے ہاتھ سے زمین نکل گئی بالکل اسی طرح ان شیئرز کی ملکیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے تم۔ میرا برا وقت گزر گیا' اب تو اچھا وقت شروع ہوا ہے اور اب تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔" یاور بخت دھمکی آمیز انداز میں گرجے۔ محمود بیگ نے تمسخرانہ قہقہہ لگایا۔ یاور بخت کا چہرہ شدت غیض وغضب سے سرخ ہوگیا تھا۔

"تمہیں وقت کی پہچان ہے یاور بخت......؟ مذاق مت کرو یار...... جو لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وقت کی فہم انہیں کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ جس وقت کے بھلے ہونے کے تم دعویٰ دار ہو' تمہیں کیا خبر کہ وہ وقت بہترین ہے یا بدترین۔" محمود بیگ کا ذومعنی لہجہ یاور بخت کے ساتھ ساتھ علوی صاحب کو بھی چونکا گیا۔

"تم دو کوڑی کے انسان مجھے وقت کی قدر و اہمیت سمجھاؤ گے۔ ارے حاصل کیا ہی کیا ہے تم نے اپنی زندگی میں جو مجھے سبق پڑھانے چلے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ میرے آفس سے۔" وہ طیش میں اسے دھتکارنے لگے۔

"پہلے واقعی کچھ حاصل نہیں کیا تھا مگر اب بہت کچھ حاصل کر چکا ہوں یاور بخت۔ اتنا کچھ کہ جان جاؤ گے تو جینے کے قابل نہ رہو گے اور بے غیرتوں کی طرح زندہ بھی رہے تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گے۔" محمود بیگ نے کاٹ دار

لہجے میں کہا۔اس کے لبوں پر پراسراری مسکان تھی۔یاور بخت اس مسکان کے اسرار سے ناواقف‘ بری طرح چلا اٹھے۔

”نکل جاؤ میرے آفس سے۔دفع ہوجاؤ میری نظروں سے۔“ محمود بیگ چلا گیا مگر یاور بخت کا مزاج بری طرح بگڑ گیا تھا۔

”یہ...... یہ سب کچھ صبیحہ اور اس کے باپ کی بدولت ہوا ہے۔وہ جانتی تھی محمود بیگ کو......اسی نے اپنے باپ کو اس کمینے شخص کو شیئرز فروخت کرنے کا مشورہ دیا ہوگا۔چھوڑوں گا نہیں میں اس کم ظرف عورت کو۔“ وہ غضب ناک تیور لیے آفس سے باہر نکل گئے۔علوی صاحب کف افسوس سے سر ہلاتے رہ گئے تھے۔

”صاحب جی‘ گیٹ پر یاور صاحب کھڑے ہیں۔ملنا چاہتے ہیں۔“ چوکیدار نے مرتضیٰ شفیق کو اطلاع دی تو وہ اخبار پڑھتے ہوئے یکدم چونکے۔

”یاور بخت......!“ ہولے سے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے بے اختیار صبیحہ کی جانب دیکھا۔جو کچھ فاصلے پر دلاور کو گود میں لیے عاصم کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھی۔

”بھیج دو اسے اندر۔“ وہ چوکیدار کو اجازت کا پروانہ دیتے اخبار لپیٹنے لگے۔

یاور بخت تہیہ کر کے اندر داخل ہوئے تھے کہ مرتضیٰ شفیق اور صبیحہ کو آج ضرور سبق سکھائیں گے اور اگر مرتضیٰ شفیق نے صبیحہ سے ان کا سامنا نہ کرایا اور پھر کوئی جھوٹ گڑھا تو وہ سیدھا صبیحہ کے کمرے میں داخل ہو کر آئینے میں اس کا فریبی چہرہ دکھلائیں گے مگر سارے ارادے خاک میں مل گئے۔جب گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے باغیچے میں صبیحہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ایک ننھا اور خوب صورت سا بچہ اس کی گود میں کلکاریاں مارتے ہوئے ہنس رہا تھا اور وہ بے حد مسرور‘ ایک خوبرو نوجوان کی محبت کے حصار میں تھی۔اس نوجوان کی نگاہوں میں صبیحہ کے لیے چاہتوں کے دیپ روشن تھے۔یاور بخت پتھر کے بت کے مانند بالکل ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔

”آجاؤ یاور بخت۔“ مرتضیٰ شفیق اس کے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولے۔ان کے پکارنے پر صبیحہ نے چونک کر یاور بخت کی جانب دیکھا اور اپنی جگہ تھم سی گئی تھیں۔عاصم نے ایک نظر یاور بخت کو دیکھا اور پھر نرمی سے صبیحہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔یاور بخت ایک گہری نگاہ صبیحہ کے چہرے پر ڈال کر مرتضیٰ شفیق کی جانب بڑھ گئے۔

”کہو‘ کیسے آنا ہوا آج؟ کیا پھر کوئی خوش خبری لائے ہو یا پھر اس خوشی کو دیکھنے آئے ہو جس کی مٹھائی کھا کر گئے تھے۔“ مرتضیٰ شفیق نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔یاور بخت کو اس مسکراہٹ میں چھپا طنز بہ خوبی سمجھ آ گیا تھا۔

”ایک سوال لے کر آیا ہوں آپ کی بیٹی سے۔کچھ پوچھنا چاہتا ہوں صبیحہ سے۔“ انہوں نے مرتضیٰ شفیق کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا اور ان کی ساتھ والی کرسی پر براجمان ہوگئے۔نگاہیں اب بھی گاہے بگاہے کچھ فاصلے پر کھڑی صبیحہ پر ہی تھیں۔

”صبیحہ سے اب تمہارا کوئی ایسا تعلق نہیں رہا۔جو تم اس سے کبھی سوال جواب کے بہانے اور کبھی خوش خبری کے بہانے یہاں ملنے آؤ۔تمہاری راہیں اب میری بیٹی سے جدا ہوگئی ہیں۔بہتر ہے کہ تم اب اپنے راستے پر آگے بڑھ جاؤ۔“ مرتضیٰ شفیق نے اس بار ترش لہجے میں انہیں تنبیہ کی۔

”میں دلچسپی نہیں رکھتا صبیحہ سے ملاقات کرنے میں۔میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے حصے کے شیئرز محمود بیگ کو کیوں بیچے؟“ یاور بخت نے سوال کیا۔

”شیئرز صبیحہ نے نہیں‘ میں نے مارکیٹ میں فروخت کیے تھے۔کس نے خریدے‘ کس نے نہیں‘ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں یاور بخت۔تم‘ تمہاری کمپنی‘ تمہارا گھر اور تمہارے دشمن تمہارے مسئلے ان سب سے اب مجھے اور صبیحہ کا کوئی تعلق

نہیں۔ بار بار اپنے دکھڑے رونے یہاں مت چلے آیا کرو یاور بخت۔" وہ قطعیت سے کہتے اسے طعنہ دے گئے۔
"میں صبیحہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" یاور بخت ان کی ہر بات نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ مرتضیٰ شفیق نے انہیں خفگی سے گھورا اور صبیحہ کو دیکھا۔
"گھبرانا نہیں۔ بے خوف ہوکر اعتماد کے ساتھ اس کا سامنا کرنا۔" عاصم نے دلاور کو صبیحہ کی گود سے لیتے ہوئے کہا۔
"آپ جب ساتھ ہیں تو مجھے گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بڑی سے بڑی آزمائش کا سامنا کرسکتی ہوں میں اور گھبرانے کی ضرورت یاور بخت کو ہے۔ مجھے نہیں۔" صبیحہ نے پُراعتماد انداز میں کہا۔
"جانتا ہوں مگر میرا خیال ہے وہ تم سے اکیلے ملنا چاہے گا۔ میرا فی الوقت تمہارے ساتھ ہونا مناسب نہیں۔" عاصم نے اس کے شانے کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"وہ وقت گزر گیا عاصم جب میرے فیصلے یاور بخت کی چاہتوں کے محتاج ہوا کرتے تھے۔" صبیحہ عاصم کا ہاتھ تھام کر بولی اور یاور بخت کی جانب بڑھ گئی۔
یاور بخت کی آنکھوں میں کرچیاں سی چبھ گئیں۔ وہ بے ساختہ نگاہ پھیر گئے۔ مرتضیٰ شفیق یاور بخت کے چہرے کے بدلتے تاثرات بغور دیکھ رہے تھے۔
"کہو یاور بخت کیسے آنا ہوا...... کیا کوئی اور خوش خبری بھی ہے جو سنانے آئے ہو؟" صبیحہ نے قریب آکر پوچھا۔
"نہیں، تمہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ دوسری شادی کے بعد بالآخر تم نے بچہ گود لے ہی لیا...... دیکھ رہا ہوں تمہارا اپنا شوہر تمہاری محرومی ذرا بھی برداشت نہ کرسکا اور میں سالہا سال تمہیں، تمہاری کمی سمیت برداشت کرتا رہا پھر بھی تم نے میری قدر نہ کی۔" یاور بخت کاٹ دار لہجے میں عاصم کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ ان کے طنز پر صبیحہ بے اختیار مسکرا اٹھیں۔ ایک نظر گہری نیند سوئے دلاور کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھا اور پھر دھیمے مگر مضبوط لہجے میں گویا ہوئیں۔
"یاور بخت ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ دراصل تم جب تک میری زندگی کا حصہ رہے، محرومی میرا مقدر بنی رہی۔ تمہاری زندگی سے نکلنے کے بعد میرا استقبال ہر خوشی نے کیا۔ میری گود میں گہری نیند سویا یہ ننھا وجود میرے اور عاصم کے وجود کا حصہ ہے۔" یاور بخت اس کی بات پر چپ سے رہ گے۔ کہنے کے لیے کوئی لفظ ہی نہ رہے تھے۔
"تم آج تک سمجھ ہی نہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دو لوگ نکاح جیسے مقدس بندھن میں بندھتے ہیں تب ان کے نصیب بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ عورت مرد کے لیے خوش بختی لاتی ہے اور مرد کے نصیب سے عورت کو اولاد ملتی ہے۔ اولاد تمہارے نصیب میں نہیں تھی یاور بخت میری یہ خوشی تمہاری محتاج تھی اور میں تم سے وفا نبھاتے نبھاتے قربان ہوتی چلی گئی مگر تم نے میری قدر نہ کی۔ اولاد نہ ہونا گناہ نہیں مگر اولاد کے حصول کے لیے لوگوں کی زندگیاں برباد کرنا ضرور گناہ ہے۔" صبیحہ کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس نے اس کی زندگی سے خوشیاں چھین لی تھیں اور آج ایک تفاخر کے عالم میں اس کے سامنے بیٹھا زندگی اجاڑنے پر اسے موردالزام ٹھہرا رہا تھا اس کے باوجود وہ نرمی اختیار کرگئی۔
"گناہ......! گناہ کیسا؟ ہمارا بچھڑنا تو تمہیں خوب راس آیا، بلکہ میں کہوں گا کہ ہمیں خوب راس آیا۔ تم نے دوسری شادی کرلی اور ماں بھی بن گئیں اور میں بھی جلد اولاد سے نوازے جانے والا ہوں اور اگر تمہیں یاد دلاؤں تو گناہ گار تم ہو۔ جس نے نجل پر حملہ کیا اور اس کے بچے کو مار دیا۔ جس دن آئینے میں تمہیں اپنی اصل شکل نظر آئے گی۔ اس دن تم مجھ سے معافیاں مانگو گی۔" یاور بخت نہ جانے اب کس غم وغصہ کا شکار تھے جو یوں دل کے پھپھولے پھوڑنے لگے۔ عاصم بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ صبیحہ نے ہاتھ تھام کر روک دیا۔
"میری فکر نہ کرو یاور بخت۔ میں نے اپنی جنت بسالی ہے۔ تمہارے جہنم میں لوٹنے کا میرا اب نہ ارادہ ہے نہ ہی

ارمان مگر یاور بخت اب میرے گھر پر بار بار آ کر رسوا ہونا بند کرو۔ تم باپ بنتے ہو یا نہیں۔ مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔ تمہاری حالت دیکھ کر اور باتیں سن کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے بہت زور سے نیچے گرنے والے ہو اور اگر اب زخم کھاؤ تو کوئی اور گھر تلاشنا کیونکہ اس گھر میں تمہارے لیے کوئی مرہم یا پھایا نہیں رکھا۔" صبیحہ چیخ کر بولیں اور یاور بخت ایک قہر آلود نگاہ صبیحہ اور عاصم پر ڈالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"رکو یاور بخت۔ اس بار دھر لیے۔ مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار میرے باپ سے کر گئے تھے اگلی بار کرنے کی جرأت نہ کرنا' صبیحہ اب عاصم کی ہے اور تم اتنا تو جان ہی گئے ہو گے کہ وفاداری کے معاملے میں کتنی پکی ہوں میں' تمہارے منہ سے اب اپنا نام سننے کی بھی خواہش مند نہیں ہوں۔ اب کھائی میں بھی جا گرو تو مجھے نہیں پکارنا۔" صبیحہ اتنا کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔ عاصم نے ایک نگاہ صبیحہ کی پشت کو دیکھا اور پھر اگلی نگاہ یاور بخت کے توہین کی احساس سے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی۔ وہ ان دونوں کے احساسات بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔

نفرت بتا رہی ہے کہ
کبھی محبت غضب کی تھی

یاور بخت پیر پٹخ کر واپس لوٹ رہے تھے۔

"سنو یاور بخت۔" عاصم نے اسے پکارا مرتضیٰ شفیق بھی حیرانگی سے عاصم کو دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں جانتا ہوں قسمت نے تمہارے اور صبیحہ کے ساتھ بہت برا کھیل کھیلا مگر اب جب تم دونوں کی راہیں جدا ہو گئی ہیں تو بار بار اس سے ٹکرانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ ٹکراؤ تمہیں تو تکلیف پہنچائے گا مگر میری صبیحہ بھی رنج کی کیفیت میں مبتلا رہے گی اور یہ ایک بات میں کسی طور پر بھی برداشت نہ کر سکوں گا' تمہاری وجہ سے اسے اب مزید کوئی تکلیف یا دکھ ملے۔ اپنے راستے پر جاؤ یاور بخت' بار بار ہماری راہوں میں آ کر ہمارے راستے منتشر نہ کرو۔ اس کی فکر کرو جو اب تمہاری منتظر ہے۔" عاصم ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے یاور بخت کو بہت کچھ باور کرا گئے۔

"عاصم ٹھیک کہہ رہا ہے یاور بخت۔ اس گھر کو تم سے اب نفرت کا رشتہ رکھنا بھی گوارا نہیں۔ اپنی نئی دنیا میں لوٹ جاؤ۔ میں' صبیحہ اور عاصم ہم میں سے کوئی بھی تمہاری شکل دوبارہ دیکھنے کا روادار نہیں۔" مرتضیٰ شفیق نے بھی یاور بخت کو باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے بہت کچھ جتا دیا۔ یاور بخت زندگی میں پہلی بار احساس اہانت سے متعارف ہوئے تھے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ اس چوکھٹ پر اپنے قدم پھر کبھی نہ رکھنے کی قسم کھا چکے تھے۔

....

نجل آج کل خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ جب سے اس نے یاور بخت کو ماں بننے کی خبر سنائی تھی تب سے وہ اس پر جان چھڑکنے لگے تھے۔ اس کی ہر بات سر آنکھوں پر سجاتے' اس کی خواہشوں کی تکمیل کو حکم کا درجہ جان کر پورا کرتے۔ زندگی میں پہلی بار کوئی شخص اسے اتنی بھرپور توجہ اور محبت دے رہا تھا۔ سنگھار میز کے سامنے کھڑی وہ اپنے جسم کی بدلتی ہیئت کو یک ٹک دیکھتی ہوئی خود پر نازاں ہوئی تھی۔

"ماں بننے کا احساس واقعی انوکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری کائنات تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو۔ ہاں' ایک ننھی وجود کو اپنے وجود میں پالنا ایک انوکھا احساس ہی تو ہے۔" نجل نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر غالباً اس ننھے وجود کو چھونا چاہا۔

"اور یاور بخت تو بالکل دیوانہ ہو گیا ہے۔ ابھی یہ ننھی جان دنیا میں آئی نہیں تب وہ میرے اتنے ناز نخرے اٹھا رہا ہے اور جب میں ماں بن جاؤں گی تب تو شاید وہ اپنی سانسیں بھی میری اجازت کے بغیر نہ لے گا۔" ایک احساس تفاخر اسے رفتہ رفتہ اپنے حصار میں لینے لگا۔

''اور جب یہ ننھی جان دنیا میں آ جائے گی تو میں یہ محل نما بنگلہ' گاڑی اور جائیداد سب کچھ اپنے نام کروالوں گی۔'' وہ مستقبل کے خواب سجانے لگی۔

''تب کوئی خوف' کوئی اندیشہ مجھے نہ ستائے گا۔ کوئی مجھے اس محل سے بے دخل کرنے کی جسارت نہ کرپائے گا اور یہ یاور بخت ہمیشہ کے لیے میرا غلام بن کررہ جائے گا۔'' اس کے ہونٹوں پر مغرور مسکراہٹ بجی۔

''لیکن یاور بخت...... یاور بخت زندہ رہے گا تو میرا غلام بنے گا ناں۔ کیا محمود بیگ اسے زندہ چھوڑے گا؟ اس کے ارادے اس کے تیور تو انتہائی خطرناک ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یاور بخت کی جان لے کر چھوڑے گا اور اگر یاور بخت مر گیا تو میرا بچہ یتیم ہوجائے گا اور امیر ہو یا غریب یتیم ہونا اس کسی کو نہیں آتا۔'' سجل کے ماتھے پر یک دم شکنیں ابھریں۔ سنگھار میز کی جانب سے منہ موڑ کر وہ کمرے میں بے چینی سے چہل قدمی کرتے ہوئے مسلسل مستقبل کی فکر میں الجھتی جارہی۔

''مجھے محمود بیگ سے اس حوالے سے بات کرنا ہوگی۔ میں آنکھ بند کرکے اس پر اعتماد نہیں کرسکتی۔ اس کے ارادے کیا ہیں۔ مجھے بھی علم ہونا چاہیے۔ مجھے ابھی محمود بیگ سے بات کرنی چاہیے۔'' وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کی حالت کے پیش نظر یاور بخت نچلی منزل کے کمرے میں منتقل ہوگئے تھے۔ یوں سجل کو گھریلو معاملات اور ملازمین پر نظر رکھنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اس وقت بھی وہ راہ داری سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ دیوار پر نصب گھڑی پر وقت دیکھ کر اس نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا اور یاور بخت کے آفس کا نمبر گھمانے لگی۔ یاور بخت کی آواز سنتے ہی وہ لگاوٹ سے بولی۔

''یاور جی دوپہر کا وقت بیتا جارہا ہے؟ اب تک کھانے پر گھر نہیں آئے۔''

''اوہ میری جان۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ آج مجھے پارٹی کے اجلاس کے سلسلے میں دو دن کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔'' یاور بخت مسکراتے ہوئے بولے۔

''اوہ ہاں' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یاور جی۔ آپ نے تو ذکر کیا تھا مگر میرے ذہن سے نکل گیا۔ جناب عالی اب اگلے دو دن تک مجھے آپ کے بغیر ہی کھانا' کھانا پڑے گا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں یاور جی۔'' سجل نے اداس ہونے کی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''مجبوری ہے میری جان۔ بس زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گا۔ جلد ہی لوٹ آؤں گا اپنی جان کے پاس۔'' محبت کی چاشنی ان کے لہجے میں گھلی ہوئی تھی۔ لبوں پر سجی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''آپ کی یہ مجبوریاں میرے حسین لمحات کو کھا جاتی ہیں۔'' سجل نے چہرے پر جھولتی لٹ کو شہادت کی انگلی میں لپیٹتے ہوئے نروٹھے پن سے کہا۔

''اب کہیں نہیں جانے دوں گا ان حسین لمحات کو' وعدہ ہے تم سے یاور بخت کا۔'' ان کے لفظوں سے چاہت کے ساگر چھلک رہے تھے۔

''آپ کے وعدے پر پھر سے اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ابھی تو کھانا اکیلے ہی کھانا پڑے گا مجھے۔'' سجل نے شوخی بھرے انداز میں اٹھلا کر کہا۔

''اوہ تم نے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ سجل کتنی بار کہا ہے کہ اپنا خیال رکھو۔ اب جاؤ جلدی سے کھانا کھاؤ۔'' یاور بخت فکر مندی سے بولے۔

''آپ کا انتظار کررہی تھی یاور جی۔ چلیں آپ اپنی منزل تک پہنچیں۔ میں اپنی پیٹ پوجا کا انتظام کرتی ہوں۔'' سجل نے الوداعی کلمات ادا کرکے ریسیور کریڈل پر رکھ کر ایک بار پھر گھڑی پر نگاہ کی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یاور بخت تجل سے گفتگو کے بعد آفس سے باہر نکل گئے۔ انہیں آج ایک ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے شہر سے باہر جانا تھا مگر کچھ دیر قبل ہی اجلاس کے ملتوی ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ انہوں نے تجل سے جان بوجھ کر یہ خبر چھپائی تھی۔ غیر متوقع طور پر گھر پہنچ کر وہ تجل کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کرنے کے خواہش مند تھے۔ آفس سے نکل کر وہ اپنے مخصوص سنار کی طرف گئے۔ تجل کے لیے انہوں نے سونے کے کڑے خریدے۔ وہ اسے تحفہ دینا چاہتے تھے۔ گھر سے کچھ فاصلے پر پہنچے تھے کہ بری طرح ٹھٹکے۔ تجل کو انہوں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں جاتے ہوئے دیکھا تو حیران ہوئے۔

''اس حالت میں تجل کہاں جارہی ہے آخر؟ کچھ قبل بات ہوئی تو اس نے کہیں جانے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔'' وہ غیر ارادی طور پر اس کا تعاقب کرنے لگے۔ ٹیکسی کئی موڑ مڑتی ایک بنگلے کے سامنے رکی۔ تجل کرایہ ادا کر کے اس بنگلے میں داخل ہوگئی۔ یاور بخت حیران سے رہ گئے۔

''یہ کس کا گھر تھا۔ جہاں تجل اتنی بے تکلفی سے اندر چلی گئی۔'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔ دروازہ ہنوز کھلا ہوا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس بنگلے کے اندر داخل ہوئے۔ اندر داخل ہوتے ہی اندھیرے اور سناٹے نے ان کا استقبال کیا۔ نچلی منزل کا بغور جائزہ لے رہے تھے کہ بالائی منزل سے تجل کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتے گئے سامنے ہی ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا مگر کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ ادھ کھلا تھا۔ وہ اس کھڑکی کی جانب بڑھے۔ ادھ کھلے پٹ سے جھانکنے کی کوشش کی۔ سامنے ہی تجل کا مسکراتا چہرہ نظر آ گیا۔ ان کا خون کھول اٹھا۔ تجل کسی مرد کی بانہوں میں تھی۔ وہ مرد کون تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھے۔ وہ کھڑکی کی جانب پشت کیے کھڑے رہے۔ غصے کی ایک شدید لہر ان کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ قبل اس کے کہ وہ جذبات سے مجبور ہو کر اس کمرے میں داخل ہوتے اس مرد کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''تم یاور بخت کی فکر کیوں کرتی ہو تجل۔ اس کی قسمت میں، میں نے سسک سسک کر مرنا لکھ دیا ہے اور اپنے بچے کے یتیم ہونے کا خوف تمہیں کیوں کھائے جارہا ہے اس بچے کا اصل باپ میں ہوں...... میرا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس بچے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری جان۔'' وہ شخص، تجل کے رخسار پر انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ تجل نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بلند قہقہہ لگاتے ہوئے پلٹا تھا۔ اس کا چہرہ اب یاور بخت کے سامنے تھا۔

''جمشید بیگ......'' یاور بخت بے یقینی سے اسے دیکھتے رہ گئے انہیں اس پل اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

❀ ❀ ❀

''آؤ فاریہ بیٹا بیٹھو۔'' فاریہ نے اندر داخل ہو کر فیروز حسن اور رضیہ بی بی کو سلام کیا تھا۔ فیروز حسن نے پُرشفقت انداز میں جواب دیتے اس کو بیٹھنے کا کہا۔ فاریہ ایک نظر ان دونوں کے اداس چہرے کو دیکھ کر ان کے درمیان بیٹھ گئی۔

''میرا اب تک حماد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ارسل بھائی کی خیر خبر کی کوئی اطلاع ملی؟'' اس نے ماحول پر چھائی اداسی کو محسوس کر کے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

''تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی حماد سے بات ہوئی ہے۔ ارسل کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ شدید ترین ذہنی الجھاؤ سے گزر رہا ہے۔ اس کا لاشعور تو بیدار ہے مگر شعوری طور پر وہ کوئی رسپانس نہیں کررہا۔'' فیروز حسن فاریہ کو ارسل کی تمام کیفیات سے آگاہ کرنے لگے۔

''فاریہ بیٹا بیٹھو...... میں ذرا نماز پڑھ کر آؤں۔ دل کو سکون نہیں مل رہا۔ بہت بے چینی محسوس کررہا ہوں۔'' فیروز حسن

کچھ دیر تک اس سے بات کرتے رہے پھر معذرت کر کے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فاریہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر انہیں جاتا دیکھنے لگی پھر اس کی توجہ سامنے خاموشی سے بیٹھیں رضیہ بی بی کی جانب مبذول ہوگئی۔ انہیں دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اردگرد سے مکمل طور پر بیگانہ ہو کر کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ اس نے انہیں دھیرے سے پکارا۔

''رضیہ بی بی۔'' وہ بری طرح چونکیں۔ سامنے بیٹھی فاریہ کو حیرت سے دیکھا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں۔

''جی بیٹا...... میں کچھ چائے پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔ آپ بیٹھیے۔'' وہ اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں مگر فاریہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام کر واپس بٹھالیا۔

''نہیں رضیہ بی بی۔ مجھے چائے کی خواہش نہیں۔ آپ بس میرے پاس بیٹھیے۔'' فاریہ کے اس انداز پر رضیہ بی بی چونکتے ہوئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''دراصل میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔'' فاریہ نے ان کی آنکھوں میں مچلتے سوال کو پڑھتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا۔

''میں بھی تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں فاریہ۔'' رضیہ بی بی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں رضیہ بی بی؟'' فاریہ حیران ہوئی۔

''وہ ساڑھی...... جو تم نے اس دن پہن رکھی تھی۔ وہ کس کی تھی؟'' رضیہ بی بی نے اٹکتے ہوئے سوال کیا۔ فاریہ نے الجھن بھری نگاہوں سے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا۔

''وہ ساڑھی...... میری والدہ کی تھی۔'' اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ رضیہ بی بی اس کے جواب پر خاموشی سے اسے دیکھنے لگیں۔ یوں جیسے اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئیں ہوں۔

''مجھے شبنم کے حوالے سے کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔'' فاریہ نے ان کی خاموشی سے جھنجلا کر کہا۔

''شبنم کے حوالے سے......!'' رضیہ بی بی حیران ہوئیں۔

''ہاں شبنم کے حوالے سے...... وہ کون ہے آپ کی؟'' فاریہ نے اٹکتے ہوئے سوال کیا۔

''میری نواسی ہے۔'' رضیہ بی بی نے سادگی سے جواب دیا۔

''اور آپ کی بیٹی کہاں ہے۔'' فاریہ نے فوراً اگلا سوال کیا۔

''وہ شبنم کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی۔'' رضیہ بی بی نے فاریہ کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا...... یوں جیسے اس کے نین نقش پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''ایک منٹ رکیں۔ میں آپ کو ایک تصویر دکھاتی ہوں رضیہ بی بی۔'' فاریہ اتنا کہہ کر پرس سے اپنا موبائل نکالنے لگی۔

''یہ دیکھیں...... اس تصویر کو غور سے دیکھیں۔ کیا آپ اس عورت کو پہچانتی ہیں؟'' فاریہ انہیں موبائل کی گیلری میں محفوظ کی گئی اس تصویر کو دکھانے لگی جس کو اس نے بند کمرے میں رکھا دیکھا تھا۔ رضیہ بی بی اس تصویر کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''آپ جانتی ہیں ناں اس عورت کو۔ مجھے بتائیں کہ یہ عورت کون ہے میرے گھر کے ایک بند کمرے میں اس عورت کی تصویر ایک پینٹنگ کی صورت رکھی ہے اور میں حیران ہوں اس بات سے کہ اس کی تصویر میں موجود اس عورت کی شباہت حیران کن حد تک شبنم سے ملتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ یہ عورت کون ہے؟ نہ جانے کیوں مجھے یہ بھی احساس ہو رہا ہے جیسے شبنم کا اس عورت سے کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔'' فاریہ پُر جوش سی اپنی رو میں کہتی چلی گئی۔ رضیہ بی بی یک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔

''تمہارے باپ کا نام کیا ہے فاریہ؟'' اچانک انہوں نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔

"دل آور..... دل آور بخت نام ہے ان کا۔" فاریہ نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر پُر اعتماد لہجے میں بولی۔ رضیہ بی بی دل تھام کر رہ گئیں۔

"دل آور بخت......!" یہ نام ان کے لبوں نے کپکپاتے ہوئے ادا کیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلنے لگے۔ وہ متوحش سی کہنے لگیں۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔ کبھی بھی نہیں آنا چاہیے۔ لوٹ جاؤ ورنہ برباد ہو جاؤ گی۔" وہ ہذیانی کیفیت میں کہتیں وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ فاریہ ہکا بکا سی رضیہ بی بی کو جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ دفعتاً اس کا موبائل بج اٹھا۔ کال قمر جہاں کی تھی۔ اس نے گہری سانس لبوں سے خارج کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"جی کہیے۔"

"جلد گھر لوٹو فاریہ...... مجھے بند کمرے میں کچھ ملا ہے۔" قمر جہاں پُر جوش سی کہہ رہی تھیں۔

"مجھے بھی آپ کو کچھ بتانا ہے۔ آ رہی ہوں میں۔" فاریہ نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اتنی نڈھال سی آواز کیوں ہو رہی ہے تمہاری۔" قمر جہاں فکرمندی سے بولیں۔

"کچھ نہیں ٹھیک ہوں۔ بس دل گھبرا رہا ہے، بہت۔" وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"اوہ میری جان...... زیادہ اسٹریس نہ لو۔ میرے خیال سے ہمیں اپنی اس مہم کو اب ترک کر دینا چاہیے۔ کیا فائدہ ماضی میں جھانکنے کا جب اندازہ ہو گیا ہے کہ ماضی کی داستان خوش گوار نہیں بلکہ بہت تلخ ہے۔" قمر جہاں ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

"نہیں قمر۔ اب تو جاننا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ماضی میرے خاندان کا جتنا بھی تلخ سہی۔ میں اس سے جڑی ہوئی ہوں اور اپنی جڑوں کے حوالے سے باخبر ہونا وقت کی ضرورت بھی ہے اور میرا حق بھی۔" فاریہ نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"فاریہ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس خاندان کا ماضی بھلے جتنا بھی تلخ ہو۔ میری ذات اس سے اس قدر متاثر نہیں ہو گی جتنی کہ تم اور جب ماضی کی تلخیاں حال سے بڑنے لگتی ہیں تو مستقبل ان تلخیوں کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔" قمر جہاں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں گھر لوٹ رہی ہوں قمر جہاں پھر بات کرتی ہوں آپ سے۔" فاریہ نے آزردگی سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور تھکے تھکے سے انداز میں گاڑی کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

......✿......✿......

"تم آخر کس الجھن کا شکار ہو ماریانہ۔" وہ گریبی کے سامنے سر جھکائے شش و پنج میں مبتلا بیٹھی تھی۔ گریبی اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے پریشانی سے استفسار کرنے لگیں۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا گریبی۔ زندگی میں پہلی بار میں اپنے احساسات و جذبات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ارسل کا یوں ہم سب سے زندگی سے بیگانہ ہو جانا صرف ایناپاؤل کی وجہ سے ہے۔" ماریانہ اپنی کیفیات سے جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

"ایناپاؤل کی وجہ سے کیا مطلب اس بات کا؟" گریبی حیران ہوئی۔ ماریانہ انہیں ارسل اور ایناپاؤل کے حوالے سے سب کچھ بتانے لگی۔ حتیٰ کہ وہ آخری ملاقات کی تفصیل سناتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس وقت جب ہم لوگ ساتھ تھے۔ تب میں نے ایناپاؤل کی آنکھوں میں اداسی دیکھی تھی وہ جب ارسل کو دیکھ رہی تھی

تو اس کی آنکھوں میں حسرت چمک رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ یوں پیش آ رہی تھی جیسے ارسل کو مجھے سونپ رہی ہو۔ گرینی ہے ناں عجب سی بات ارسل صرف اس کی راہنمائی کر رہا تھا مدد کر رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اور انداز میں کوئی اور جذبہ تھا جو وہ دے رہا تھا.....'' ماریانہ روانی میں اپنے خدشات بیان کرتی چلی گئی۔

''تم اینا پاؤل سے حسد محسوس کر رہی ہو ماریانہ؟'' گرینی نے اسے بے یقینی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں گرینی، حسد نہیں..... یہ کوئی اور جذبہ ہے جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔ گرینی آپ جانتی ہیں، ارسل ہوش میں آیا تھا اور اس پل مجھے بڑی مشکل سے اس سے ملاقات کی اجازت ملی تھی مگر اس لمحے میں مجھ سے ایک خطاء ہوگئی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''کیسی خطاء ماریانہ.....؟'' گرینی نے فوراً پوچھا۔

''وہ چند لمحوں کے لیے ہوش میں آیا تھا اور میں اس سے اینا پاؤل کی موت کا ذکر کر بیٹھی اس کی طبیعت اس خبر کو سن کر اچانک بگڑنے لگی اور پھر اگلے دن ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ٹراما میں جاچکا ہے، گرینی ارسل کو در حقیقت اینا پاؤل کی موت کا صدمہ ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں مگر کسی سے یہ بات کہہ نہیں سکتی۔'' ماریانہ نے حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....! یہ تو بہت بُرا ہوا ماریانہ مگر میں سمجھ نہیں پا رہی کہ تم کسی کو یہ بات بتا کیوں نہیں سکتی ہو؟'' گرینی نے الجھن بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ اینا اور ارسل کا تعلق ایک راز ہے اینا نہیں چاہتی تھی کہ ارسل سے اس کی دوستی کا علم کسی کو ہو کیونکہ اس طرح ارسل کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ خود ارسل نے اپنے دوست پیڈرو تک کو اس بات سے انجان رکھا پھر میں سب کو یہ کیسے کہہ دوں کہ ارسل اینا پاؤل کی موت کی خبر سن کر اس ٹراما میں چلا گیا ہے اور یہی بات مجھے مزید الجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔'' ماریانہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔

''کون سی بات؟'' گرینی ایک بار پھر حیرت کا شکار ہوئیں۔

''یہی کہ اینا ارسل کے لیے اتنی اہم ہوگئی تھی کہ اس کی موت کا سن کر وہ ہم سب سے منہ موڑ بیٹھا ہے۔''

''اوہ ماریانہ..... خدارا بیوقوفی کی باتیں بند کرو۔ اینا اور ارسل کا تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ارسل اس کا راہ نما تھا۔ اینا ایک ایسی کھائی میں جا گری تھی جہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ ارسل تھا جس نے اسے تاریکی سے نکلنے میں مدد کی۔ ارسل اس کا محسن تھا اور محسن کوئی بھی ہو۔ اس سے ایک گہرا لگاؤ ہو ہی جاتا ہے۔ اینا کو بھی ارسل سے ویسا ہی لگاؤ ہو گیا تھا۔ ارسل نے بناء کسی غرض و مقصد کے اینا پاؤل کی مدد کی تھی اور اس نے اپنی زندگی کو درپیش خطرے کی بھی پروا نہیں کی۔ ایسے لوگ اب اس دنیا میں کہاں پائے جاتے ہیں اور جنہیں مل جائیں وہ قدر نہ کریں تو کہو ماریانہ پھر وہ کیا کریں۔ اینا اسے اپنا مہربان سمجھتی تھی اور ہر کوئی اپنے مہربان کو عزیز رکھتا ہے۔'' گرینی اسے ارسل اور ماریانہ کے تعلق کی حقیقت سمجھانے لگیں۔ جس بات کی تہہ تک وہ پہنچ نہ پا رہی تھی گرینی اس تہہ تک لمحوں میں جا پہنچی تھیں۔ ماریانہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''آپ کیسے یہ ساری باتیں سمجھ گئیں گرینی؟'' وہ بلآخر سوال کر رہی گئی۔

''یہ ساری باتیں تمہیں خود سمجھنی چاہیے تھیں ماریانہ۔ یہ میرے بتانے کی باتیں تو نہ تھیں۔ ارسل نے اینا کے معاملے میں صرف تم پر اعتماد کیا اور تم ہی آج اس موقع پر جب وہ شدت غم سے نڈھال ہے تو اس کے جذبات کو سمجھنے کے بجائے مشکوک بنا رہی ہو۔'' گرینی خفگی سے اسے سنا گئیں۔

''وہ شدت غم سے نڈھال کیوں ہے گرینی؟'' ماریانہ کی سوئی ہنوز اس ایک بات پر اٹکی ہوئی تھی۔ گرینی نے اسے

افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا۔
"کیونکہ اینا پاؤل۔ نے نفرت جھوٹ اور گناہوں کی تاریکی کو ختم کرکے بھلائی کی شمع کو جلانا چاہا تھا۔ ہر کوئی اتنا باہمت اتنا عظیم نہیں ہوگا مگر وہ تھی اور کسی عظیم انسان کا قتل سانحہ ہوتا ہے اور سانحے دلوں میں غم چھوڑ جاتے ہیں۔ ارسل بھی غمگین ہے۔ وجہ تم بھی ہو۔ کاش تم یہ بات سمجھ سکو۔" گرینی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے شرمندہ کرگئیں۔
"میں کیسے ہوں وجہ......؟" ماریانہ تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔
"تمہیں کیا ضرورت تھی ماریانہ کہ ارسال کے ہوش میں آتے ہی اسے اینا پاؤل کی موت کی خبر سناؤ۔ ایک ماہر تنویم ہوتے ہوئے بھی تم اس کی کیفیت نہیں سمجھ سکی اور ابھی بھی یہاں بیٹھ کر اس کے ٹراما میں چلے جانے پر سوالات اٹھا رہی ہو اس وقت تو تمہیں اس کے گھر والوں کے ساتھ ہونا چاہیے انہیں حوصلہ دینا چاہیے۔ وہ دونوں بہن بھائی ہمارے دیس میں اجنبی ہیں اور سخت غمزدہ بھی ہمیں ان کا سہارا بننا چاہیے۔ ماریانہ خدارا صوفیہ کی راہ پر نہ چلو...... ورنہ خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔" گرینی اس کو سمجھاتے ہوئے بری طرح جھنجھلائیں۔ آخری فقرہ ادا کرکے وہ اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ماریانہ ششدر سی ان کی کہی گئی آخری بات پر غور کرتی رہ گئی۔
"میں ہسپتال جارہی ہوں۔ واپسی پر ارسل کے بہن بھائی کو لے کر آؤں گی۔ آج سے وہ لوگ ہمارے گھر پر قیام کریں گے۔" گرینی واپس کمرے سے آئیں تو انہوں نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ اپنے پرس میں ضروری سامان اور گھر کی چابیاں رکھتے ہوئے انہوں نے اسے مطلع کیا۔
"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔" ماریانہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے چلو پھر۔"
"آپ نے مجھے مما کا طعنہ کیوں دیا گرینی؟" اس نے ان کے پیچھے پیچھے گھر سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ ماں کا طعنہ اس کے دل کو لگا تھا۔
"کیونکہ تمہاری ماں نے بھی اپنی نادانیوں کے باعث بہت کچھ کھودیا تھا۔ وہ بھی بہت جلد بدگمان ہوجایا کرتی تھی اور راہ حق اسے بھی منظر نہ آسکی۔" گرینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"اور آپ کو لگتا ہے کہ میں بھی ان کا پرتو ہوں۔ ان کی طرح جلد بدگمان ہوجانے والی صحیح راہ کا انتخاب نہ کرنے والی بیوقوفیوں کے باعث بہت کچھ کھودینے والی؟" ماریانہ نے سخت برا مناتے ہوئے شکوہ کیا۔
"میں نہیں کہنا چاہتی تھی مگر آج تم نے ثابت کرہی دیا۔ خاور نے زندگی سے جیسے ہی منہ موڑا۔ صوفیہ نے اس کے گھر آنے کو حتی کہ اس کی اولاد کو بھی تنہا چھوڑ دیا اور آج جب ارسل کٹھن وقت کا شکار ہوا تو تم نے بھی اس سے بدگمان ہوکر منہ پھیرلیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے تمہیں خاور کی طرح اعلیٰ ظرف بنانا چاہا مگر تم صوفیہ کی بیٹی نکلیں۔" گرینی کا لہجہ کڑوا ہوا۔ ماریانہ نے بےیقینی سے گردن موڑ کر گرینی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

پیڈرو کو ضروری کام تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ یک دم تنہائی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ شبنم کی نگاہیں ارسل کے بیڈ کا طواف کرتیں ہوئیں پہلو میں بیٹھے حماد پر آکر ٹھہر گئیں۔
"حماد بھائی......" اس نے ہولے سے پکارا مگر وہ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ بالکل متوجہ نہ ہوا۔ یوں جیسے خیالوں کی کسی دنیا میں جی رہا ہو۔ شبنم خاموش ہوگئی۔
"تم جانتے ہو ناں تمہارا بھائی بچپن میں بھی اس کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔" فیروز حسن کی کہی گئی بات اب تک اس

افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا۔
"کیونکہ اینا پاؤل۔ نے نفرت' جھوٹ اور گناہوں کی تاریکی کو ختم کرکے بھلائی کی شمع کو جلانا چاہا تھا۔ ہر کوئی اتنا باہمت' اتنا عظیم نہیں ہوگا مگر وہ تھی اور کسی عظیم انسان کا قتل سانحہ ہوتا ہے اور سارے دلوں میں غم چھوڑ جاتے ہیں۔ ارسل بھی غمگین ہے۔ وجہ تم بھی ہو۔ کاش تم یہ بات سمجھ سکو۔" گرینی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے شرمندہ کر گئیں۔
"میں کیسے ہوں وجہ.....؟" ماریانہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔
"تمہیں کیا ضرورت تھی ماریانہ کہ ارسال کے ہوش میں آتے ہی اسے اینا پاؤل کی موت کی خبر سناؤ۔ ایک ماہر تنویم ہوتے ہوئے بھی تم اس کی کیفیت نہیں سمجھ سکی اور ابھی بھی یہاں بیٹھ کر اس کے ڈراما میں چلے جانے پر سوالات اٹھا رہی ہو' اس وقت تو تمہیں اس کے گھر والوں کے ساتھ ہونا چاہیے' انہیں حوصلہ دینا چاہیے۔ وہ دونوں بہن بھائی ہمارے دیس میں اجنبی ہیں اور سخت غمزدہ بھی' ہمیں ان کا سہارا بننا چاہیے۔ ماریانہ خدارا صوفیہ کی راہ پر نہ چلو...... ورنہ خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔" گرینی اس کو سمجھاتے ہوئے بری طرح جھنجلائیں۔ آخری فقرہ ادا کرکے وہ اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ماریانہ ششدر سی ان کی کہی گئی آخری بات پر غور کرتی رہ گئی۔
"میں ہسپتال جارہی ہوں۔ واپسی پر ارسل کے بہن بھائی کو لے کر آؤں گی۔ آج سے وہ لوگ ہمارے گھر پر قیام کریں گے۔" گرینی واپس کمرے سے آئیں تو انہوں نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ اپنے پرس میں ضروری سامان اور گھر کی چابیاں رکھتے ہوئے انہوں نے اسے مطلع کیا۔
"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔" ماریانہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے چلو پھر۔"
"آپ نے مجھے مما کا طعنہ کیوں دیا گرینی؟" اس نے ان کے پیچھے پیچھے گھر سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ ماں کا طعنہ اس کے دل کو لگا تھا۔
"کیونکہ تمہاری ماں نے بھی اپنی نادانیوں کے باعث بہت کچھ کھو دیا تھا۔ وہ بھی بہت جلد بدگمان ہوجایا کرتی تھی اور راہ حق اسے بھی منظر نہ آسکی۔" گرینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"اور آپ کو لگتا ہے کہ میں بھی ان کا پرتو ہوں۔ ان کی طرح جلد بدگمان ہوجانے والی صحیح راہ کا انتخاب نہ کرنے والی' بیوقوفیوں کے باعث بہت کچھ کھودینے والی؟" ماریانہ نے سخت برا مناتے ہوئے شکوہ کیا۔
"میں نہیں کہنا چاہتی تھی مگر آج تم نے ثابت کر ہی دیا۔ خاور نے زندگی سے جیسے ہی منہ موڑا۔ صوفیہ نے اس کے گھر آنے کو حتی کہ اس کی اولاد کو بھی تنہا چھوڑ دیا اور آج جب ارسل کٹھن وقت کا شکار ہوا تو تم نے بھی اس سے بدگمان ہوکر منہ پھیر لیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے تمہیں خاور کی طرح اعلیٰ ظرف بنانا چاہا مگر تم صوفیہ کی بیٹی نکلیں۔" گرینی کا لہجہ کڑوا ہوا۔ ماریانہ نے بے یقینی سے گردن موڑ کر گرینی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

پیڈرو کو ضروری کام تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ یک دم تنہائی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ شبنم کی نگاہیں ارسل کے بیڈ کا طواف کرتیں ہوئیں پہلو میں بیٹھے حماد پر آکر ٹھہر گئیں۔
"حماد بھائی......" اس نے ہولے سے پکارا مگر وہ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ بالکل متوجہ نہ ہوا۔ یوں جیسے خیالوں کی کسی دنیا میں جی رہا ہو۔ شبنم خاموش ہوگئی۔
"تم جانتے ہو ناں تمہارا بھائی بچپن میں بھی اس کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔" فیروز حسن کی کہی گئی بات اب تک اس

"خاور کے انتقال کے بعد صوفیہ کو اس کے وعدے کا پاس نہ رکھنا، تمہیں چھوڑ جانا اور خاور کی محبت کو سزا سمجھنا ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطیاں ہیں۔ وہ بدگمان ہوگئی تھی۔ خاور سے شادی اس کو پچھتاوے میں گھیر رہی تھی۔ جب تک وقت پھولوں کی طرح مہکتا رہا۔ تب تک وہ بے حد خوش تھی مگر خاور کی موت کے بعد وہ کسی آزمائش میں پوری نہ اتر سکی اور یہی حال میں تمہارا دیکھ رہی ہوں ارسل جیسے مشکل میں گرفتار ہوا تمہارا دل اس سے بدگمانی میں گھیرنے لگا۔ اسی وجہ سے زندگی میں پہلی بار تم مجھے اچھی نہیں لگ رہیں ماریانہ۔" وہ دونوں پبلک ٹرانسپورٹ میں سوار ہوگئی تھیں۔ گرینی نے اپنی خفگی مٹاتے ہوئے اسے احساس دلایا تھا۔ پہلی بار ماریانہ کو اپنی جلد بازی اور بلا جواز بدگمانی کا احساس ہوا اور اس کا سر شرمندگی کے احساس سے جھکتا چلا گیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ارسل سے یوں بدگمان ہونے کے بجائے اس پل اسے اس کیفیت سے نکالنے میں اس کے گھر والوں کی مدد کرنا چاہیے تھی۔" وہ پشیمان سی اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

"دیر آید درست آید۔" گرینی اس تمام گفتگو میں پہلی بار مسکرائیں تو وہ بھی دھیرے سے مسکرادی۔

"ماریانہ تمہیں اس کے بھائی سے پوچھنا چاہیے۔ بچپن کی یادوں کے حوالے سے یا وہ باتیں جن سے ارسل کی خاص انسیت ہو۔" گرینی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں گرینی۔"

"وہ دونوں ہمارے گھر آجائیں تو تم انہیں اپنا اور ارسل کے تعلق سے بھی آگاہ کرسکتی ہو۔ شاید حقیقت جاننے کے بعد کچھ بات بن جائے۔" گرینی نے اہم نکتہ اٹھایا۔

"ہاں یہ بھی ممکن ہے اس حوالے سے تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" ماریانہ کو ان کی بات کافی حد تک مناسب لگی۔

"تمہارا مسئلہ ہی یہی ہے کہ تم سوچتی کم ہو اور اگر یہ کام کرنے لگ بھی جاؤ تو سوچوں کی سمت بے حد فضول ہوتی ہے۔" گرینی نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"گرینی......" ماریانہ نے ہنستے ہوئے احتجاجاً صدا بلند کی۔

"حماد بھائی، فاریہ کی کال آئی تھی۔ تب ہی ڈاکٹرز کمرے میں آگئے تھے۔ میں نے انہیں بعد میں کال کرنے کا کہہ دیا تھا۔" ڈاکٹر کے جانے کے بعد شبنم نے جھوٹ کی ذرا سی آمیزش کے بعد فاریہ کی کال کے حوالے سے حماد کو آگاہ کیا۔

"ٹھیک کیا تم نے شبنم...... میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔" حماد فکرمندی سے کہتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی گرینی ماریانہ کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔

"اوہ ماریانا آپ...... شکر ہے آپ آگئیں۔" شبنم خوش ہوتے ہوئے بے ساختہ اس کی جانب بڑھی۔

"مجھے تو آنا ہی تھا یہاں شبنم...... ان سے ملو یہ میری گرینی ہیں۔" ماریانہ نے مسکرا کر شبنم کو گلے لگاتے ہوئے گرینی سے متعارف کروایا۔ شبنم نے مودبانہ انداز میں انہیں سلام کیا۔

"خوش رہو بیٹا...... تمہارا بھائی کہاں ہے؟" گرینی نے سلام کا جواب دے کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"حماد بھائی...... کسی کام سے باہر گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔" شبنم نے کہا۔

گرینی شبنم سے بات چیت کے بعد ارسل کی جانب بڑھ گئیں گہری نیند سویا وہ دنیا جہاں سے بے نیاز...... انہیں ماضی کی اس شام کی یاد دلا گیا جب خاور حیات آنکھیں بند کیے کفن میں لپٹے ان کے سامنے گہری نیند میں سوئے ہوئے

تھے۔ وہ بے اختیار ارسل کی جانب سے منہ موڑ گئیں۔ دفعتاً حماد کی بھی اسی وقت کمرے میں آمد ہوئی۔ وہ برگر اور سینڈوچ کے باکس اٹھائے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے موجود ماریانہ اور گرینی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ماریانہ نے آگے بڑھ کر اسے گرینی سے متعارف کروایا۔

''حماد بیٹا...... میں تم دونوں کو اپنے گھر لے جانے آئی ہوں۔'' گرینی نے چھوٹتے ہی کہا۔

''گرینی میں کیسے جاسکتا ہوں بھیا کو چھوڑ کر۔ وہ بھی اس حال میں۔'' حماد جز بز ہوا۔

''بیٹا جانا تو پڑے گا کیونکہ ماریانہ کو تم لوگوں سے کچھ نہایت ضروری باتیں کرنی ہیں ارسل کے حوالے سے۔'' گرینی نے رازداری سے کہا تو حماد کے ساتھ ساتھ شبنم بھی چونک اٹھی۔

''کیا مطلب...... !ارسل بھیا کے حوالے سے کچھ خاص بات؟'' حماد نے سوالیہ نگاہوں سے گرینی اور ماریانہ کو دیکھا۔

''حماد...... میں جانتی ہوں کہ ارسل کس صدمے کا شکار ہے مگر جاننے کے باوجود میں کسی سے بھی یہ بات کہہ نہیں سکتی۔ ہاں تمہاری بات الگ ہے تم اس کے بھائی ہو۔ تمہیں اس حقیقت کے حوالے سے علم ہونا چاہیے مگر میں یہاں یہ بات نہیں کرنا چاہتی۔ تمہیں اس کے لیے ہمارے گھر چلنا ہوگا۔'' ماریانہ نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ حماد سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ایک نظر جز بز سی شبنم کو دیکھا۔ شبنم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں مگر ارسل بھائی کی تب تک دیکھ بھال کون کرے گا؟'' اسے ارسل کی فکر لاحق ہوئی۔

''پریشان نہ ہو ارسل کا خیال رکھنے کے لیے یہاں کا اسٹاف موجود ہے۔'' ماریانہ نے اس کی فکر دور کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔'' حماد نے ایک گہری نظر ارسل کے ساکت وجود پہ ڈالی اور ماریانہ سے چلنے کا کہا۔

......

اس نے گاڑی پورچ میں داخل کرنے کے بعد حماد کو کال ملائی مگر شبنم نے کال وصول کی۔ فاریہ کو یہ بات بالکل نہیں بھائی تھی مگر پھر بھی اس نے ضبط کرتے ہوئے بات کی مگر شبنم کا سرد و دوٹوک انداز اسے بری طرح تپا گیا تھا۔ ستم ظریفی یہ کہ اس نے حماد کی مصروفیت والی بات اس کے منہ پر مار کر کال بھی فوراً منقطع کردی تھی۔ فاریہ شدید غصے کا شکار ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کال پھر سے ملائی مگر ایک بار پھر کال منقطع کردی گئی۔

''یہ شبنم آخر چاہتی کیا ہے۔ کیوں اس قدر جاہلانہ حرکت کررہی ہے؟ ایک بار حماد سے بات ہوجائے دماغ ٹھیک کرواتی ہوں اس لڑکی کا۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہے یہ لڑکی۔'' وہ طیش کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے گاڑی سے باہر آئی۔ سب سے پہلے وہ بڑی بیگم کے کمرے میں گئی مگر انہیں گہری نیند میں سوتا پا کر وہ سیدھے بند کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازے پر دھیمی سی دستک دی۔ اگلے ہی پل دروازہ ذرا سا کھلا۔ فاریہ فوراً ہی اندر داخل ہوگئی۔

''کون سا راز آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے قمر؟'' فاریہ تھکے ہوئے سے انداز میں اپنی سینڈل اتار کر وہیں زمین پر بیٹھتے ہوئے قمر جہاں سے مخاطب ہوئی۔

''اف...... یہ کمرہ تو مجھے اب رازوں کا قبرستان معلوم ہونے لگا ہے فاریہ...... پورے کمرے میں کونے کدھرے میں بخت محل کے راز بکھرے پڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی پزل گیم کھیل رہے ہیں ہم۔ ایک ٹکڑا ہاتھ آتا ہے تو اگلے ٹکڑے سے بالکل مختلف ثابت ہوتا ہے۔ یوں گمان گزرتا ہے جیسے اس محل کے باسیوں پر گزرے وقتوں میں کوئی قیامت بیتی تھی۔''

''پتا نہیں...... قیامت بیتی تھی یا اب بیتنے جارہی ہے۔'' فاریہ نے پیچھے رکھے صندوق سے پشت ٹکاتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ اس کی بات پر قمر جہاں نے چونک کر اسے بغور دیکھا اور پھر پوچھا۔

"سب خیریت تو ہے؟ تم حماد کے گھر گئی تھیں۔ اس کے بھائی کی کوئی خیر خبر ملی۔"

"ہاں...... ارسل بھائی کسی شدید صدمے کا شکار ہو کر ٹراما میں چلے گئے۔ جس کی وجہ سے ان کا شعور سو گیا ہے۔ حماد اور اس کے گھر والے بے حد پریشان ہیں۔" فاریہ نے سرسری سے انداز میں بتایا۔

"اوہ...... اللہ کرم کرے۔ اس نوجوان کو جلد صحت یاب فرما دے۔" قمر جہاں نے اس کی بات سن کر دعا کی۔

"میں نے رضیہ بی بی کو اس عورت کی تصویر دکھا کر کریدا تھا۔ جانتی ہیں پھر کیا ہوا......" فاریہ نے قمر جہاں کو دیکھتے ہوئے سنسنی پھیلائی۔

"کیا ہوا پھر؟" قمر جہاں بھی متجسس ہوئیں۔

"انہوں نے مجھ سے پاپا کا نام پوچھا۔ میں نے بتایا 'دلاور بخت' اور پھر وہ بری طرح بھڑ گئیں۔ قمر جہاں ان کی کیفیت بے حد عجیب ہو گئی تھی۔ یوں جیسے بے حد خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ سخت متوحش تھیں پھر وہ وحشت سے بھرپور انداز میں چیخنے لگیں۔ کہنے لگیں 'چلی جاؤ، لوٹ جاؤ' تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔ لوٹ جاؤ ورنہ برباد ہو جاؤ گی......" فاریہ رضیہ بی بی کی ایک ایک بات دہرا رہی تھی۔ قمر جہاں کے چہرے کا تاثرات بھی بدلے۔ فاریہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی پھر کہنے لگی۔

"آج مجھے ایک خوف سا محسوس ہو رہا ہے قمر...... آخر کون ہے میرا باپ...... کیا ہے اس کا ماضی؟"

"یہ تو اب میں بھی جاننا چاہتی ہوں کہ آخر کون ہے دلاور بخت' کیا ہے اس کا ماضی؟" قمر جہاں بولیں تو ان کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔

❀......❀......❀

"حماد تم ایناپاؤل کو تو جانتے ہو گے؟" وہ لوگ لاؤنج میں آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے آتش دان سے نکلتی گرماہٹ سردی کے احساس کو رفتہ رفتہ کم کر رہی تھیں۔ ماریانہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ جس کا جواب حماد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیا۔

"ہاں وہ مشہور اداکار ہے اور اتفاقاً اس کی ڈیتھ بھی اسی دن ہوئی تھی جس دن بھیا کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ میں نے سان سیاپستان سے متعلق اس دن کی ہر خبر کنگھال لی تھی۔ اسی لیے یہ بات جانتا ہوں۔"

"حماد دراصل بات یہ ہے کہ اس حادثے کے وقت میں اور ارسل ایناپاؤل کے ساتھ تھے۔ وہ حادثہ نہیں بلکہ قاتلانہ حملہ تھا۔ ایناپاؤل کی گاڑی میں بلاسٹ ہوا تھا اور ارسل اس پل اس کی گاڑی کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ اسی لیے اس بلاسٹ کی زد میں آ گیا۔" ماریانہ نے ٹھہر ٹھہر کر اصل بات حماد اور شبنم کے سامنے گوش گزار کی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! بھیا ایناپاؤل کو جانتے تھے؟ اس کے ساتھ تھے' مجھے یقین نہیں آ رہا اس بات پر۔" حماد کے چہرے کا رنگ یک دم متغیر ہوا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی کا رنگ نمایاں تھا۔ شبنم بھی حماد کی بات پر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہنے لگی۔

"حماد بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ارسل بھیا اس طرح کے لوگوں سے میرا مطلب ہے شہرت یافتہ لوگوں سے دور بھاگتے تھے۔ انہیں ہجوم' شور شرابے بھی نہیں بھاتے تھے پھر وہ ایناپاؤل کے ساتھ کیسے ہو سکتے تھے بھلا؟" ان دونوں کو بے یقین سا پا کر ماریانہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"بات اتنی سادہ اور عام نہیں ہے جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ دیکھو میں اب جو کچھ بھی تم دونوں کو بتانے والی ہوں ضروری ہے کہ تم لوگ اس کی گہرائی کو اچھی طرح جان لو کیونکہ ارسل کے صدمے کا تعلق ایناپاؤل سے ہی ہے۔" ماریانہ کی

بات پر حماد اور شبنم چونکے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"ماریانہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ معاملہ انتہائی حساس نوعیت کا ہے۔ تم لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ۔" گرینی ماریانہ کی حمایت کرتے ہوئے بولیں۔
"میں ہر طرح کی گفتگو کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں آپ لوگ بتائیں اصل معاملہ کیا ہے؟" حماد نے کہا۔
"اینا پاؤل ارسل کی کمپنی کی برانڈ ایمبیسڈر کے طور پر منتخب ہوئی تھی۔ ارسل کی اس سے چند ایک بار آفیشل میٹنگز بھی ہوئی تھیں اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہ تھا مگر پھر ایک دن اینا نے ارسل سے ذاتی طور پر رابطہ کرکے اسے اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ اس سے قبل بھی وہ پیڈرو کے طفیل ارسل سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتی رہی تھی مگر تب ارسل نے انکار کردیا تھا مگر گھر پر دی گئی دعوت پر ارسل کو جانا پڑا تھا۔ اس دن اینا پاؤل نے ارسل سے مدد کی درخواست کی تھی۔ وہ مسلمان ہونا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں اسے ارسل کی مدد درکار تھی۔ اس نے ارسل کو مزید بتایا کہ ماضی میں اس کا تعلق دہشت گرد تنظیم سے رہ چکا ہے۔ جو دنیا بھر میں مذہبی دہشت گردی کے ساتھ ساتھ منشیات کے فروغ میں بھی ملوث رہی ہیں۔ اینا پاؤل اب اس تنظیم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ لادین تھی اور دین اسلام کی راہ اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ایجنسی کے لوگوں سے بھی تعلقات تھے اور وہ ان دہشت گرد تنظیم کے جرائم کے کئی ثبوت ایجنسی کے حوالے کرگئی تھی۔ وہ دہشت گرد اسے قتل کرنے کے درپے تھے مگر ایجنسی اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود اسے اسلام قبول نے کے لیے ارسل کا ساتھ درکار تھا اور سارے خطرات سے بہ خوبی واقف ہونے کے باوجود ارسل نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اینا پاؤل ارسل کو بے حد عزیز رکھتی تھی۔ اس لیے ارسل سے دوستی اس نے ایک راز کی مانند چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ارسل کا کولیگ اور دوست پیڈرو بھی اس حقیقت سے ناواقف تھا۔ ارسل نے یہ سب کچھ صرف مجھے بتایا تھا۔ تمہارا بھائی مجھ پر بہت اعتماد کرتا تھا۔" ماریانہ نے تمام حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے آخری جملہ مسکرا کر ادا کیا۔ جواباً حماد بھی مسکرا دیا۔
"جانتا ہوں۔ انہوں نے جب آپ سے اسکائپ پر بات کرائی تھی تب ہی ہم سب جان گئے تھے کہ آپ کوئی عام نہیں بہت خاص شخصیت ہیں بھیا کے لیے۔" حماد کی بات پر ماریانہ کا وجود اندر تک مطمئن ہوگیا۔ گزشتہ دنوں سے جو شکوک وشبہات اس کو بے چین کیے ہوئے تھے وہ گرینی کی سرزنش اور حماد کے اس بیان کے بعد مکمل طور پر دم توڑ گئے تھے۔
"اینا پاؤل عشائیہ سے قبل ہی اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئی تھی۔ نہ جانے کیسے اس کی مسجد میں موجودگی کی تصاویر اور خبریں میڈیا پر وائرل ہوگئیں۔ عشائیہ کے دن اسے صحافیوں نے اپنے تندوتیز سوالوں سے گھیر رکھا تھا مگر وہ بہت بہادر عورت تھی۔ اس لیے علی الاعلان مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ اسی دن اس نے ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں وہ اپنا حلیہ تبدیل کرکے آئی تھی۔ حتیٰ کہ گاڑی بھی کوئی اور تھی۔ وہ بالکل نہیں چاہتی تھی کہ ارسل اور مجھ سے ملاقات کا علم کسی کو ہو۔ وہ ہمیشہ سے ارسل سے ملنے میں بہت احتیاط برتی تھی۔ شاید اسے علم تھا کہ اس کی زندگی خطرات کا شکار ہے۔ اس بات کا وہ ارسل سے کئی بار تذکرہ بھی کرچکی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ملاقات کے بعد وہ واپس گھر جارہی تھی کہ اچانک اس کی گاڑی رک گئی۔ ارسل خیریت معلوم کرنے کی غرض سے اس کی گاڑی کی جانب بڑھا تھا کہ اینا کی گاڑی ایک شدید دھماکے سے دوچار ہوئی۔ ارسل اسی دھماکے کی زد میں آکر شدید زخمی ہوا تھا۔" ماریانہ نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ حماد اور شبنم دم بخود رہ گئے۔
"اوہ میرے خدایا...... میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس حادثے کے پیچھے یہ محرکات ہوں گے۔ اس کا مطلب تو یہ بھی ہوا کہ بھیا کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔" حماد سخت پریشان ہوا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ ہم اینا پاؤل کے ساتھ تھے۔ ماسوائے میرے اور اب تمہارے۔ اس بات کو جس حد تک ممکن ہو چھپا کر رکھنا ہے حماد ہم نے کسی سے بھی کچھ نہیں کہنا حتیٰ کہ پیڈرو سے بھی نہیں۔" ماریانہ نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں آپ کی بات ماریانہ اور میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ بھیا کو کس بات نے سب سے زیادہ دکھی کیا ہے۔ وہ ان لوگوں کو کھونے سے سخت خوف زدہ رہتے تھے۔ جنہیں وہ دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اینا پاؤل سے دوستی انہیں بے حد عزیز تھی۔ تب ہی انہوں نے اس کا ساتھ دیا اور جب انہیں پتا چلا ہوگا کہ اینا پاؤل اس حادثے میں جانبر نہ ہو سکی...... ایک منٹ......" حماد ارسل کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کڑی سے کڑی ملا رہا تھا کہ یک دم وہ چونکا۔ اس کے یوں کہنے پر ماریانہ نے چونک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"بھیا کو کیسے پتا چلا کہ اس حادثے میں اینا پاؤل کی وفات ہوگئی ہے؟" حماد نے سوال کیا۔

"دراصل یہ میری غلطی ہے۔ آپریشن کے بعد ارسل فوراً ٹراما میں نہیں گیا تھا۔ وہ ہوش میں آیا تھا مگر میں اس وقت اس قدر پریشان تھی کہ بوکھلاہٹ میں اینا کی موت کا تذکرہ ارسل سے کر گئی تھی۔ ارسل کی طبیعت اسی پل بگڑنے لگی تھی۔ صبح ڈاکٹرز نے بتایا کہ وہ ٹراما میں چلا گیا ہے۔" ماریانہ نے شرمندگی کے زیر اثر سر جھکائے ہوئے کہا تو حماد سر تھام کر رہ گیا۔

"آپ کو نہیں کہنا چاہیے تھا ماریانہ۔" وہ شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں جانتی ہوں حماد اور اپنی اس غلطی پر بے حد نادم بھی ہوں مگر یقین کرو میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا...... نہ جانے کیسے وہ بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔" ماریانہ سخت پشیمان تھی۔ اس کے چہرے پر ندامت کی پرچھائیں واضح نظر آ رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں آپ نے جان بوجھ کر نہیں کیا...... خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ بھیا کو ان کی لاشعوری دنیا سے واپس کیسے لانا ہے۔" حماد نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ماریانہ کی پشیمانی اسے بہ خوبی احساس دلا گئی تھی کہ اس سے جو کچھ بھی ہوا انجانے میں ہوا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ ماریانہ سے جو کچھ بھی ہوا انجانے میں ہوا۔ میں خود اس بات پر تمہارے آگے شرمندہ ہوں مگر اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ ارسل کو ہوش میں واپس کیسے لانا ہے۔ تم لوگ اس حوالے سے مشورہ کرو۔ میں جب تک تم دونوں بہن بھائی کے لیے کمرہ سیٹ کر آؤں۔" گرینی نے شرمندگی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں گرینی آپ بلاوجہ زحمت کریں گی۔ ہم نے ہوٹل بک کروایا ہوا ہے۔ رات میں ہم دونوں وہیں قیام کریں گے۔" حماد نے فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر گرینی کو روکتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں میرے بچے کہ تم نے ہوٹل بک کروایا ہوا ہے مگر جب اپنا گھر موجود ہے تو پھر کسی سرائے خانے میں ٹھہرنے کی کیا تک بھلا۔ ارسل مجھے بیٹے کی طرح عزیز ہے اور تم اس کے بھائی ہو اس ناطے تم بھی مجھے بیٹے جیسے ہی عزیز ہو۔ ایسا کرو کھانا کھا کر ہوٹل کے معاملات نمٹا کر کے اپنا سامان یہاں لے آؤ۔ اس گھر کے ہوتے ہوئے کہیں اور قیام کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔" گرینی نے شفقت سے حماد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔ حماد ہچکچایا تو ماریانہ بھی گویا ہوئی۔

"گرینی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے تم دونوں کو کہیں اور قیام کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاید تم دونوں کے علم میں نہیں کہ ارسل صرف دوست نہیں ہمارا پڑوسی بھی ہے اور گرینی سے تو ارسل کی خوب دوستی بھی ہے۔ گرینی خاص طور پر اس کے لیے پاکستانی پکوان پکایا کرتی تھیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ تم لوگ ہمارے ہوتے ہوئے کہیں اور رہو۔" ماریانہ

اور گریبی کے خلوص کے ہاتھوں ہار مانتے ہوئے حماد اور شبنم وہاں رہنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد حماد ہوٹل سے اپنا سامان لے آئے گا۔ شبنم گریبی کے ہمراہ کمرے کو ترتیب دینے میں مصروف ہو گئی تھی۔ حماد ماریانہ کے ہمراہ ارسل کے گھر کو دیکھنے آ گیا تھا۔

"ارسل عموماً اپنے گھر کی چابیاں کہیں جاتے وقت گریبی کے پاس رکھوا جاتا تھا۔ اس دن بھی عشائیہ کی تقریب میں جاتے ہوئے اس نے چابی گریبی کے پاس رکھوائی تھی۔" وہ دونوں ارسل کے گھر کے سامنے کھڑے تھے جب ماریانہ نے بروقت یاد آنے پر بتایا۔

"اور اگر ہم یہاں نہ آتے تو بھیا کی زندگی میں در آنے والی ان تبدیلیوں کے حوالے سے بے خبر رہتے۔" وہ ایک بار پھر اپنے اسپین آنے پر شکر ادا کر رہا تھا۔ ماریانہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ حماد بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ گھر بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ یوں نہ کسی شے کی کمی نگاہوں کو کھل رہی تھی۔ نہ ہی زیادتی نظروں کو گراں گزر رہی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔

"میں جانتا تھا بھیا کا گھر ایسا ہی ہوگا۔ ان کی طبیعت کی طرح نفیس اور صاف ستھرا۔" حماد نے مسکراتے ہوئے سراہا۔

"ہاں اب بس وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔ اس کی کمی بے حد کھل رہی ہے۔" ماریانہ افسردگی سے گویا ہوئی۔ اس گھر کا گوشہ گوشہ اسے ارسل کی یاد دلا رہا تھا۔ خواہ وہ کچن ہو کونے میں رکھی میز یا کرسی یا پھر اس کے کمرے کی بالکنی...... ارسل یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے ہر جگہ موجود تھا۔ بس نظر نہیں آ رہا تھا۔

"آپ کو ایک بات بتانی ہے ماریانہ۔" حماد نے اس کی حسرت میں لپٹی خواہش سن کر جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی بڑی بہن سمجھو اور جو کہنا ہے بے جھجک کہو۔" ماریانہ نے اس کی جانب متوجہ ہو کر حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بابا جانی سے جب بات ہوئی تھی تو وہ آپ کے متعلق دریافت کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ جو صرف ماریانہ کے علم میں ہے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ارسل بھیا کا یوں ٹرانس میں جانا ایسے ہی نہیں ہے کچھ تو ہوا ہے۔" حماد سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا جیسے مخمصے میں ہو کہ پوری بات بتائے یا نہیں۔

"ارسل اپنے بابا سے بے حد قریب ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے انہیں اپنے ماضی کے حوالے سے کچھ بتایا بھی ہو۔" ماریانہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"نہیں اگر کچھ بھی بتایا ہوتا تو بابا جانی مجھے ضرور بتاتے۔ وہ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتے۔ ہاں البتہ بھیا نے ان سے جلد ملاقات کا وعدہ کیا تھا بلکہ بابا جانی خود انہیں بے حد یاد کر رہے تھے اور حالیہ دنوں میں یہاں ان کے پاس آنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے اسی غرض سے انہوں نے ہم سب کے ویزے بھی لگوا رکھے تھے۔ خیر۔ کل ایک بات کہی بابا جانی نے جس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔" حماد اصل موضوع کی طرف آیا۔ وہ بات جو وہ ماریانہ کے علم میں بھی لانا چاہتا تھا کیونکہ کہیں نہ کہیں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس ایک بات سے ارسل کو واپس شعور کی دنیا میں لانے میں مدد مل سکتی ہے۔

"کون سی بات حماد۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔" ماریانہ نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ کا یقین دلایا۔

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے تب ہی تو یہ بات آپ سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ بابا جانی روانی میں کہہ گئے کہ بھیا پہلے بھی کسی صدمے کا شکار ہو کر اس کیفیت میں جا چکے ہیں مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کیونکہ میرے ذہن میں ایسی کوئی یاد نہیں، جس میں بھیا ایسی کسی حالت کا شکار ہوئے ہوں۔" حماد نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جو مسلسل اس کے ذہن کو الجھا رہی تھی۔

"اگر واقعی ماضی میں ایسا کچھ ہوا ہے تو ان وجوہات کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ارسل کو کیسے اس ٹرانس سے نکالا گیا

میں ضرور جاننا چاہوں گی کیونکہ وہی باتیں اب بھی ہماری مدد کرسکتی ہیں۔ حماد اب جب تم اپنے بابا سے بات کرو تو میری ان سے ضرور بات کرانا۔" ماریانہ کو یوں لگا جیسے ارسل تک پہنچنے کا کوئی سراغ اس کے ہاتھ لگا ہو۔ وہ بار بار حماد کو فیروز حسن سے بات کرانے کی تاکید کررہی تھی۔

"آپ بےفکر رہیں میں بات کرواؤں گا آپ کی ان سے مگر مجھے ایک اور بات کہنی تھی آپ سے؟"

"ہاں کہو... اب کیا بات ہے۔" ماریانہ نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں آپ اور گرینی ارسل بھیا کو بےحد عزیز رکھتے ہیں اسی لیے چاہتے ہیں کہ میں اور شبنم بھی آپ لوگوں کے ساتھ رہیں تاکہ ہمارا مناسب خیال بھی رکھا جاسکے مگر میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھیا کے گھر رکوں۔ اس گھر کے کونے کونے سے مجھے ان کی خوشبو محسوس ہورہی ہے' ان ساز و سامان پر ان کا لمس مجھے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہورہا ہے... میں یہاں رکنا چاہتا ہوں ماریانہ کیا آپ اس بات کے لیے گرینی کو منائیں گی۔ میں خود یہ کہہ کر ان کے جذبوں کو کسی طرح سے بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔" حماد مدطلب نگاہوں سے ماریانہ کو دیکھ رہا تھا۔ ماریانہ مسکرادی۔

"میں تمہارے احساسات سمجھ سکتی ہوں میرے بھائی تم فکر نہ کرو۔ گرینی کو میں تمہاری بات سمجھادوں گی۔ ہاں مگر صرف رہنے کی اجازت ہے' کھانے پینے کا تمام معاملہ ہمارے ساتھ ہوگا۔ بولو شرط منظور ہے۔" ماریانہ نے وعدے کی غرض سے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بالکل منظور۔" حماد نے مسکرا کر ماریانہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"کاغذ کا یہ ٹکڑا... یہ ہے نیا راز۔" قمر جہاں نے اخبار کا ایک تراشا ہوا حصہ فاریہ کی جانب بڑھایا جس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر فاریہ سخت بدمزہ ہوئی۔

"ہاں یہ ہے نیا راز کیونکہ اس ٹکڑے پر درج آرٹیکل میں مہرو عظیم کے گھر کا پتا درج ہے۔" قمر جہاں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو فاریہ اس آرٹیکل کو پڑھنے لگی۔

"اوہ... !اس کا گھر تو کافی معروف شاہراہ پر ہے۔ یہ اس کے قتل کی رپورٹ کا آرٹیکل ہے۔ مہرو عظیم کو اس کے گھر میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ بھی بہیمانہ انداز میں۔" فاریہ حیران رہ گئی۔

"جی جناب! مگر حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہم اس کی رہائش گاہ پر جا کر کچھ نہ کچھ معلومات اکٹھی کرسکتے ہیں بھلے سالہا سال گزر چکے ہوں اس واقعہ کو بیتے مگر ایسے واقعات یعنی قتل' خودکشی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں مدتوں تک زندہ رہتے ہیں۔" قمر جہاں نے پتے کی بات کہی تو فاریہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"پھر ایسا کرتے ہیں۔ کل رفیق صاحب سے ملاقات سے قبل اس جگہ پر چلتے ہیں۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو پھر ایسا ہی کرتے ہیں کل۔ ویسے بھی کل اسٹوڈیو آف ہے۔ تو میرے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔" قمر جہاں نے بھی رضامندی سے کہا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے قمر مگر میں الجھی گئی ہوں۔ بخت محل کا ایسا کون سا کنکشن ہے جو حماد کے گھر سے جڑا ہوا ہے۔" فاریہ کی سوچ پھر رضیہ بی بی پر جا الجھی۔

"ابھی تک تو یہ پینٹنگ اور شبنم کا تعلق ہی سمجھ میں آرہا ہے اور میرے خیال سے ہوگی بھی یہی بات۔" قمر جہاں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پینٹنگ کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

"فاریہ اس پینٹنگ کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کی محویت کو حیرانگی سے دیکھتے ہوئے قمر جہاں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا ڈھونڈی ہو قاریہ؟"

"اس دستخط کو ..... یہ دستخط اس آرٹسٹ کے ہیں جس نے اس عورت کی تصویر پینٹ کی ہے۔" قاریہ اتنا کہہ کر اپنے پرس سے موبائل نکالنے لگی۔ قمر جہاں بھی اس دستخط کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگی۔ دستخط بے حد باریک تھا مگر صد شکر کہ روشنائی مدہم نہیں ہوئی تھی۔ قاریہ موبائل کے کیمرے سے اس دستخط کی تصویر کھینچنے لگی۔ تصویر کھینچنے کے بعد اس نے تصویر میں فلٹر ایفیکٹ ڈال کر اس دستخط کو زوم کر کے دیکھا۔

"زبردست ..... اب سمجھ میں آ گیا یہ نام۔" قاریہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"واقعی ..... پھر بتاؤ کہ کیا ہے نام ہے اس آرٹسٹ کا؟" قمر جہاں بھی پرجوش ہوئی۔

"کے کے زیدی ..... یہ ہے نام کل پھر صبح سے نکلتے ہیں۔ اس بندے کو بھی تلاش کرتے ہیں۔" قاریہ نے نئے منصوبے بناتی ہوئے کہا۔

"نہ کوئی سر نہ پیر۔ فقط نام جان کر کیسے تلاش کریں گے میری جان۔" قمر جہاں نے سر پیٹا۔

"آدمی تلاش تو جناب گوگل صاحب فرما دیں گے۔ اب لیجیے مدد حاصل ہونے والی ہے۔" قاریہ فوراً نام سرچ پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"لو جی ..... چار ایسے کے زیڈ نکل آئے ہیں۔ اب نہ جانے ان چاروں میں کوئی ہمارا والا ہے کہ نہیں۔" قمر جہاں نے موبائل پر نتائج دیکھتے ہوئے کہا۔

"تصویر دیکھیں ..... یہ صاحب تو کافی نوجوان ہیں اور پینٹنگ پرانے زمانے کی تو یہ حضرت تو ہو ہی نہیں سکتے۔ ہاں باقی یہ تین افراد ممکنات میں شامل ہیں۔" قاریہ نے عقل لڑاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ایسا کرو ان کا کوئی نمبر اتا پتا جو بھی گوگل پر مہیا ہو وہ نوٹ کرلو صبح پھر ان ہی معلومات کی بدولت تلاش کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔" قمر جہاں بھی نیم رضامند نظر آئیں۔

"بھئی بڑا ہی گھڑاک پال رکھا ہے آپ کے میاں جی نے۔ کوئی سیدھا سادھا بندہ نہیں ملا تھا آپ کو شادی کے لیے۔" قاریہ نے ہنستے ہوئے قمر جہاں کو چھیڑا۔

"واقعی یار ..... تمہارے باپ نے تو نہ جانے کون کون سے کارنامے انجام دے رکھے ہیں اپنی زندگی میں۔ سوچتی ہوں تو دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں۔" قمر جہاں کنپٹی سہلاتے ہوئے بولیں۔

"پھر میری ہمت کو داد دیں۔ شوہر تو آپ بدل سکتی ہیں اب بھی مگر باپ جیسا بھی ہو بدلا نہیں جا سکتا۔" قاریہ کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ قمر جہاں اس کی بات پر چپ سی رہ گئی تھیں۔

ماریانہ نے نہ جانے گرینی سے کیا کہا تھا۔ جو انہوں نے خوشی خوشی حماد کو ارسل کے گھر قیام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کھانے کے بعد وہ شبنم کو لے کر ارسل کے گھر آ گیا تھا۔

"بھیا نے کتنا خوب صورت گھر سجایا ہے ناں اپنا۔" شبنم نے ستائش بھری نگاہوں سے گھر کی سجاوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ، بہت خوب صورت۔" حماد نے سنجیدگی سے ایک نظر گھر اور شبنم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شبنم اس کے لہجے کی سنجیدگی پر ٹھٹکی اور پھر خاموشی سے اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ پریشان ہیں ناں۔ آپ کو کیا لگتا ہے۔ ماریانہ نے ارسل اور اینا پاؤل کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا وہ

درست ہے؟" شبنم نے سوالیہ نگاہوں سے حماد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ظاہری سی بات ہے شبنم۔ ماریانہ نے جو بھی کہا وہ درست ہی ہوگا اور ویسے بھی اسے کیا ضرورت ہے غلط بیانی
کی؟" حماد نے شبنم کی بات پر نا سمجھی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں...... میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے بات کچھ اور ہو۔ ماریانہ ہمیں بتانا نہ چاہ رہی ہو۔" شبنم نے ہوا میں تیر
پھینکا۔
"لو ماریانہ ایسا کیوں کرے گی شبنم؟؟" حماد کے لہجے میں ناگواری جھلک رہی تھی۔
"میں تو بس یوں ہی کہہ رہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ہم ماریانہ پر اتنا اندھا اعتماد کیسے کرسکتے ہیں۔ ہم لوگ اچھی
طرح جانتے ہیں کہ ارسل بھیا ایناپاول جیسی شخصیات سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے پھر اتنی گہری دوستی کیسے ممکن
ہے کہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کا ساتھ دیتے چلے گئے۔" شبنم جس بات پر الجھن کا شکار تھی وہ حماد کے سامنے بیان
کرگئی۔
"شبنم پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم ماریانہ پر اتنا اندھا اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ ارسل بھیا نے ماریانہ کو یہ اعتماد بخشا ہے اور
گریٹی ماریانہ دونوں ہی اتنی مخلص خاتون ہیں کہ ان کی محبتوں پر رتی برابر بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں اور دوسری بات یہ
کہ ایناپاول ایک عظیم بہادر عورت تھی۔ اس نے گمراہی کے اندھیرے کو چیر کر نور میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور ارسل
بھیا نے اس کی اس کوشش میں بھرپور ساتھ دیا تھا اور شبنم یہ میں اور تم دونوں ہی بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کسی کو
سہارا دینا' مدد کرنا' مصیبت سے نکالنا ہمارا خاندانی شیوہ رہا ہے۔" حماد کو شبنم کی منفی سوچ نے دکھ پہنچایا۔ تب ہی اسے
سمجھاتے ہوئے اس نے اس کے ذہن سے منفی سوچ کو خارج کرنے کی کوشش کی۔
"سوری حماد بھائی۔ میرے ذہن میں ایک یہ بات آگئی تھی۔ اس لیے یہ سب کہہ دیا۔ ابھی احساس ہوا کہ غلط کہا۔"
شبنم نے اس کے سمجھانے پر پشیمانی کے زیر اثر کہا۔
"کوئی بات نہیں' میں جانتا ہوں تم بھی اس ساری صورت حال سے کافی پریشان ہو۔ خیر دعا کرو کہ ارسل بھیا جلد
ٹھیک ہوجائیں۔ اس سے زیادہ میرے لیے کوئی اور بات معنی نہیں رکھتی۔" حماد اس کی شرمندگی پر دھیرے سے مسکراتے
ہوئے بولا۔ شبنم خفیف سے انداز میں سر ہلا گئی۔
"تم اب آرام کرو۔ تھک گئی ہوگی۔ میں ابھی بابا جانی سے بات کروں گا۔ وہ کافی پریشان ہوں گے۔" حماد نے
نرمی سے کہا۔
"خفا ہو کر تو نہیں کہہ رہے۔" شبنم ابھی بھی فکر مند تھی۔
"بالکل بھی نہیں۔ آرام کرنا ہم دونوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ورنہ ذہنی تھکان کا شکار ہوجائیں گے۔ میں
خود بھی کچھ دیر بعد آرام کروں گا۔" حماد نے اس کی فکر مٹاتے ہوئے کہا۔
"او کے' یہ رہا آپ کا موبائل' شب خیر۔" شبنم نے اپنے کوٹ کی جیب سے حماد کا موبائل نکال کر اس کے حوالے
کرتے ہوئے کہا۔
"او ہاں...... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میرا موبائل تمہارے پاس ہے۔ ٹھیک ہے تم جاؤ آرام کرو۔ شب بخیر۔"
شبنم کے جانے کے بعد حماد نے فیروز حسن کو اسکائپ پر کال ملائی۔ فیروز حسن ارسل کو لے کر بے حد فکر مند تھے۔ حماد چاہ
کر بھی انہیں ایناپاول اور ارسل کی دوستی کے حوالے سے بتانے سے قاصر تھا...... وجوہات تھیں اس طرح کی بات موبائل
کے ذریعے کرنا مناسب نہ تھا اور دوسری وجہ فیروز حسن کا بے حد پریشان ہوجانا تھا۔ حماد نے باتوں باتوں میں انہیں

کریدنے کی کوشش کی۔ ارسل بچپن میں کب اس کیفیت کا شکار ہوا تھا اس حوالے سے جاننے کی کوشش کی مگر اس کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ فیروز حسن نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ حماد صبح ماریانہ کے ساتھ ہسپتال پہنچا تو سب سے پہلے اس نے اسکائپ آن کر کے فیروز حسن کو کال کی۔

''حماد میں اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' فیروز حسن نے بے تابی سے کہا۔ حماد نے ویڈیو کال کا رخ بیڈ پر دراز بے سدھ لیٹے ارسل کی جانب کر دیا۔

''میں ارسل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر تنہائی میں۔'' فیروز حسن نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا تو حماد نے موبائل ارسل کے روبرو سیٹ کر کے ماریانہ کو بھی باہر کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں حماد...... میں یہاں رکنا چاہتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ تمہارے بابا شاید کچھ ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جن کا جاننا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ تم باہر جاؤ۔ میں یہیں رکوں گی مگر بے فکر رہو۔ تمہارے بابا جانی کو پتا نہیں چلے گا۔'' ماریانہ نے اٹل لہجے میں کہا تو حماد اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ارسل بیٹا...... میں جانتا ہوں کہ تم ایک بار پھر زندگی سے روٹھ کر دور جا بیٹھے ہو مگر کیا ہوا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا مگر بیٹا میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ اب میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تم سے دوری برداشت کر سکوں۔ خدارا لوٹ آؤ۔ مجھے وہ وقت مت یاد دلاؤ جب تمہاری ماں کی جدائی میں میں رونے کے ساتھ ساتھ تمہیں کھونے سے خوف زدہ ہو کر بھی رویا کرتا تھا۔ اب تمہارے بابا جانی میں وہ ہمت نہیں۔'' فیروز حسن بھیگے لہجے میں التجا کر رہے تھے۔ ان کی گزارش سن کر ماریانہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

''ارسل میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اب کس خوف' کس پچھتاوے نے تمہیں اس حال تک پہنچا دیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم کچھ خاص کرنے جا رہے ہو...... پھر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ کیسے رونما ہوا وہ حادثہ...... کیا یہ حادثہ بھی اس رات جیسا ڈراؤنا تھا جو تم پر اور تمہاری ماں پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔'' فیروز حسن بس بول رہے تھے۔ یوں جیسے اپنا دل ہلکا کر رہے ہوں یا پھر احساسات سے دور ہوتے ارسل کو واپس لانے کے لیے وہ رات یاد دلا رہے ہوں۔ ان کی باتیں سن کر ماریانہ بری طرح چونکی۔

''ہاں وہ قیامت خیز رات...... جب تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری ماں کی عصمت دری کی گئی اور پھر اس کا بہیمانہ قتل کر دیا گیا تھا۔ کیا اس رات سے بھی خوف ناک کوئی رات ہو گی ارسل۔ جس کا صدمہ تم یوں جان کو لگا بیٹھے ہو۔ بولو ارسل جب میں اور تم رات کے عذاب کو اپنے دل کے نہاں خانے میں دبا کر زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں تو پھر یہ کیسا سانحہ تھا جو تمہیں ہم سب سے پھر سے دور کر گیا۔'' فیروز حسن رو پڑے تو ماریانہ کو یوں لگا جیسے اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

www.naeyufaq.com

آگاہی آبرائی صحرا

مشاعلی مسکان

صبح چھ بجے جلدی جلدی تیار ہو کر میں جیسے ہی باہر نکلا ڈھولک کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ غم و غصے کی شدید لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں دانت پیستا ہوا آگے بڑھ گیا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا ڈھولک کی آواز بلند ہوتی رہی تھی۔ اسی حساب سے میرا غصہ بھی بڑھتا رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے حسب معمول وہ منظر میرے سامنے تھا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ آٹھ نو لوگوں کے سامنے وہ چاروں ڈھولک کی تھاپ پر اپنا بے ڈول جسم ہلا ہلا کر رقص پیش کر رہے تھے۔ ان کے اردگرد موجود لوگوں کو دیکھ کر مجھے ان کی عقل پر شدید افسوس ہوا۔ نفرت بھری نگاہ ان پر ڈال کر میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے ان کے سائے سے بھی کراہیت محسوس ہوتی تھی لیکن مجبوراً مجھے اسی رستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ چہل قدمی کے لیے مجھے قریبی پارک پہنچنا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے یہ میرا معمول تھا۔ فجر کی نماز پڑھنے اور تلاوت قرآن کے بعد میں واک کے لیے پارک جاتا تھا۔ آج میں جیسے ہی پارک پہنچا۔ میرے آفس کولیگ میرے دوست اکبر نازلی نے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میرے پارک آنے کی اصل وجہ اکبر نازلی ہی تھا۔ میرا بہترین رفیق، جو میرے ہر انداز سے واقف تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ بھی پورے دل سے مسکرا دیا۔

”معتبر پریشان لگ رہے ہو کیا بات ہے؟“ پانی کی بوتل مجھ سے لیتے ہوئے وہ بولا۔

”یار کیا بتاؤں تمہیں، سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ میں نے ان کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ بالوں میں انگلیاں پھنسائے میں نے پریشانی سے کہا۔

”بے کار کی سوچیں پاگل بناتی ہیں۔“ وہ بولا۔

”میری سوچ منفی عنصر لیے ہوئے ہے، میں ان کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہوں۔ میرا دماغ سن ہو جاتا ہے مجھے کچھ یاد نہیں رہتا سوائے اتنا کہ وہ لوگ بوجھ ہیں دھرتی پر۔ ہاں فالتو چیز بوجھ ہی ہوتی ہے۔“ میں تیز لہجے میں بولا۔ مجھے پھر غصہ آنے لگا تھا۔

”یار ریلیکس ہو جاؤ اور اب بتاؤ کن کی بات کر رہے ہو؟“ وہ میرا عزیز از جان دوست تھا میری پریشانی نے اسے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

”میرے گھر کے قریب گلی کے نکڑ پر خواجہ سراؤں کا ایک ٹولہ رہتا ہے۔ بہت ہی عجیب لوگ ہیں یار ان کا ناچنا، گانا، ان کا لباس، بھیک مانگنا، بے شرمی سے ایک کو پکڑنا کبھی دوسرے کو۔ اف بے حیائی، مجھے نفرت ہوتی ہے ان سے اور...... اور آج تو حد کر دی۔ ان میں سے دو نے میرا راستہ روک کر پیسے مانگنا شروع کر دیے۔ ہاتھ اٹھ جاتا میرا ان پر اگر محلے کے وہ بزرگ نہ آ جاتے بیچ میں۔ یہ لوگ......“ میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اکبر نازلی کی طرف دیکھا وہ منہ پھیرے ایسے بیٹھا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

”اکبر......“ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہاں......“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”کیا تم نے کچھ نہیں سنا؟“ مجھے حیرت ہوئی۔

”چھوڑو جو بھی ہے۔ تمہارا کیا لیتا دیتا۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نو بجنے والے ہیں۔ آفس بھی جانا ہے۔ میں چلتا ہوں تو بھی گھر جا۔“ وہ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں ڈال کر تیزی سے ایک طرف چل دیا۔

”اسے کیا ہوا؟ ابھی تو ایک گھنٹہ باقی ہے۔“ میں حیرانی

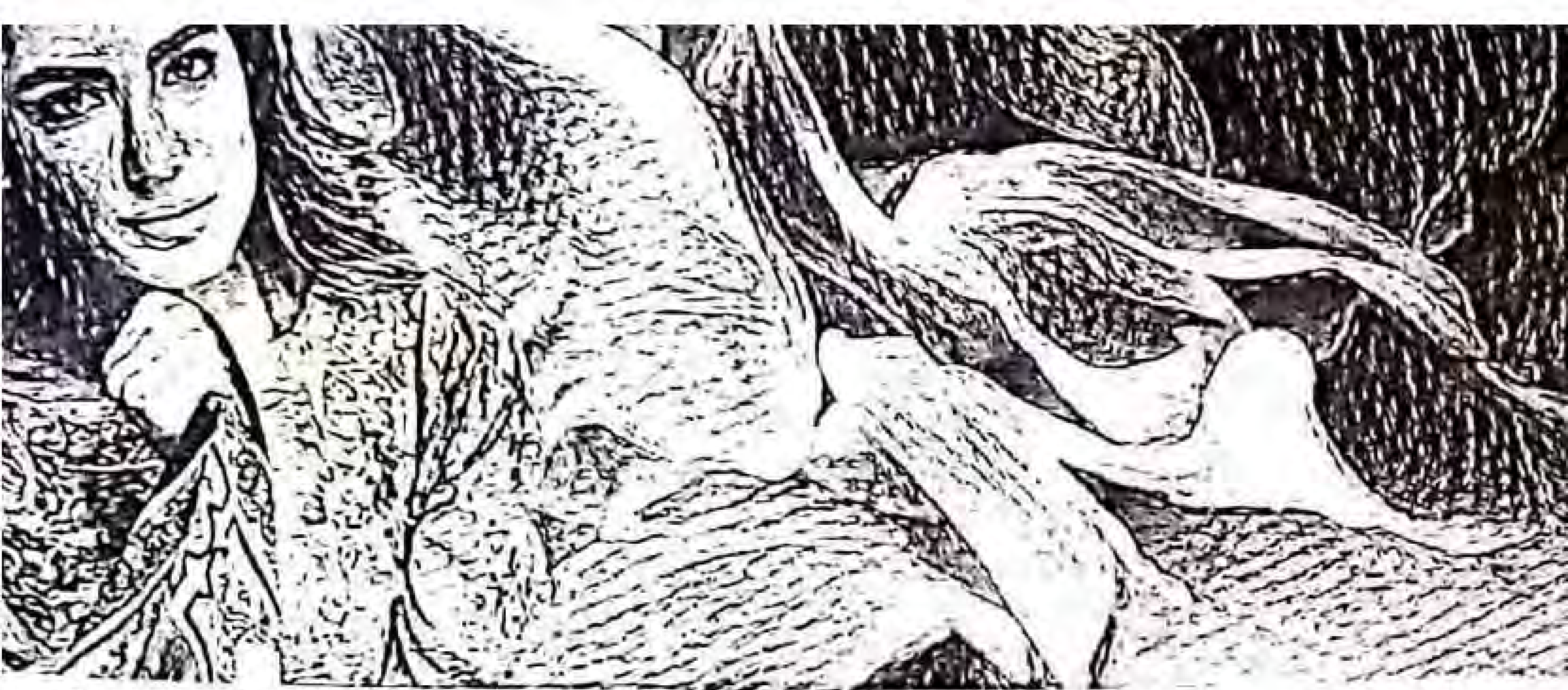

سے دوچار ہوا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ آفس آیا نہ پارک' اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ اس کے گھر کا ایڈریس مجھے معلوم نہ تھا اس نے کبھی بتایا نہیں تھا اور میں نے کبھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ایسا کوئی جاننے والا بھی نہ تھا اس کا جس سے میں اس کی بابت پوچھتا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ کسی فلیٹ میں اکیلا رہتا ہے۔ چھ دن ہوگئے تھے اب مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ رابطے کی کوئی سبیل نہ نکل رہی تھی۔ میں باقاعدگی سے پارک جاتا۔ اسے مخصوص سنگی بینچ جس پر ہم دونوں بیٹھتے تھے نا پا کر مایوس ہو جاتا۔ اس دن میں نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی۔ میرا پروگرام گھر پر آرام کرنے کا تھا باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی میں کھڑکی کے قریب کھڑا تیزی سے بارش کو دیکھ رہا تھا۔ اکبر نازلی مسلسل میری سوچ کا حصہ بنا ہوا تھا۔ اس کے یوں غائب ہونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ سوچوں نے رخ بدلا تھا۔ اتنی تیز بارش میں اس وقت مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ میں چھتری لے کر دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا سامنے اکبر نازلی تھا جو مکمل طور پر بھیگ گیا تھا۔ چھتری کی اوٹ میں، میں اسے لیے اندر چلا آیا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟ جانتے ہو کتنا پریشان تھا میں۔" چھتری ایک طرف رکھ کر میں نے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

"اچھا پہلے تم شاور لے کر میرے کپڑے پہن لو پھر تم سے حساب کتاب کرتا ہوں۔" اسے واش روم دکھا کر میں چائے بنانے لگا۔ جتنی دیر میں وہ واپس آیا میں چائے لے آیا۔

"یہ لو۔" چائے دے کر میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، اپنا کپ میز پر رکھ کر میں خود بیٹھ گیا تھا۔

"اب بتاؤ' یہ روپوشی کس لیے تھی؟"

"معتبر۔" کپ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اس نے مجھے پکارا۔

"وہ...... معتبر وہ...... معتبر میں......" وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

"وہ...... وہ...... میں...... میں سے آگے بھی کچھ بولو گے یا نہیں۔" میں چاہتا تھا وہ جلدی سے اپنی روپوشی کا سبب بتا دے۔

"معتبر میں تمہارا دوست ہوں' تمہیں مجھ سے بہت محبت ہے ناں؟" حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا نہیں ہے؟" میری خاموشی پر اس نے پوچھا۔

"یار ہے' اب آگے بھی بول ناں۔" وہ پتا نہیں کیسی تصدیق چاہتا تھا لیکن یہ سچ تھا مجھے اس سے محبت تھی۔

"اگر میں کہوں میں کسی اور جنس سے ہوں تب......"

کپ میز پر رکھ کر وہ انگلیاں مروڑنے لگا۔

"کیا مطلب کیا کہہ رہے ہو......! ہوائی مخلوق سے تو تعلق نہیں تمہارا؟" میں اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا جبکہ وہ ابھی تک اسی اضطرابی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

"معتبر میں نہیں چاہتا تمہیں کہیں اور سے پتا چلے......" کہہ کر اس نے نظریں جھکائیں۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو صاف صاف کہو۔" مجھے کوفت ہونے لگی۔

"معتبر میں تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہوں۔" جو بم میری سماعتوں پر بلاسٹ ہوا تھا اس سے میرا جسم ساکت رہ گیا تھا۔ دل بند ہونے لگا تھا۔ سانس لمحہ بھر کو آنا بھول گئی تھی۔ آنکھیں خون رنگ ہوگئیں تھیں۔

"یہ کیسا مذاق ہے؟" وہ میرے غصے سے اچھی طرح واقف تھا اس کا یہ مذاق مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"یہ مذاق نہیں ہے معتبر حقیقت ہے۔" مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ میرے نتھنے پھولنے لگے تھے۔

"اگر میرے بس میں ہوتا تو میں خود کو تمہارے لیے بدل دیتا معتبر...... میرے یار...... میں......"

"جسٹ شٹ اپ۔" میں چلایا اور وہ سہم گیا۔

"گیٹ لاسٹ دھوکے باز۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"معتبر......" وہ رونے لگا لیکن مجھے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

"نکل جاؤ' دفع ہو جاؤ گھٹیا انسان۔" جن کے سائے سے بھی میں دور بھاگتا تھا ان جیسا میرے گھر میں موجود تھا یہ خیال مجھے اذیت دے رہا تھا۔

"تم جاتے ہو کہ دھکے دے کر باہر نکالوں۔" میں نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔

"میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ باہر بارش مزید تیز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی قطرے بارش کی صورت بہہ رہے تھے مجھے ذرا بھی ہمدردی نہ ہوئی تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ شکوے سے بھرپور نگاہ مجھ پر ڈال کر وہ صحن عبور کرتا باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بنا چھتری لیے تقریباً بھاگتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔ واپس کمرے میں آ کر میں صوفے پر ڈھے گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میرا غصہ عروج پر تھا۔ ملال نے بھی آن گھیرا تھا۔

"ہم نے ڈھائی سال اکٹھے بھی تو گزارے تھے۔"

"بدتہذیب۔" ملال کو ایک طرف جھٹک کر میں نفرت سے بولا۔

عزیز از جان کے یوں جاں پرور انکشاف نے مجھے نڈھال سا کر دیا تھا۔ اب غصہ جو کہ مشکل سے ہی اترتا تھا کم ہو گیا تھا۔ غم تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مسلسل پریشانی کی وجہ سے بخار نے آن لیا تھا تین دن بخار میں گزرنے کی وجہ سے نقاہت طاری ہوگئی تھی۔ کچھ بہتر محسوس کیا تو آفس پہنچا مگر آفس اسٹاف سے جو خبر ملی اس نے مجھے صحیح معنوں میں ہلا کر رکھ دیا۔ اکبر نازلی نے خودکشی کرلی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کسی پل قرار نہ آیا آفس منیجر کو لیو دے کر گھر کے بجائے پارک چلا آیا تھا۔ بے دھیانی سے چلتے ہوئے آگے سے آتے ہوئے وجود سے ٹکرا گیا تھا۔

"تو...... تو...... اکبر کا دوست ہے ناں؟" میرے چہرے کی طرف رخ کر کے سامنے والا انسان بولا تھا اس کے کپڑے زنانہ تھے مگر چہرہ مردانہ۔

"تو ہی اس کے ساتھ کام کرتا تھا ناں؟" میں حیران نہ ہوا تھا جس وضع قطع کا وہ انسان تھا وہ اکبر نازلی سے واقف ہو سکتا تھا۔

"تو جانتا ہے وہ کیوں مرا؟" آنکھیں سکیڑ کر وہ بولا۔

میں خاموش رہا۔

"وہ تیری وجہ سے مرا ہے ہاں تو نے مارا ہے اسے۔"

کہہ کر اس نے لب بھینچے۔ میری آنکھیں پوری طرح وا ہوگئی تھیں۔ میں جانتا تھا اسے میرے سلوک سے دکھ ہوا تھا مگر کوئی مجھے یوں اس کا قائل بنادے گا میں نے تصور بھی نہ کیا تھا اتنا کہہ کر میرے گرد چکر لگا کر اس نے مجھے دیکھا اور پھر منہ میں انگلی ڈال کر ایسا پوز بنایا جیسے وہ میری شخصیت سے ذرا متاثر نہ ہوا ہو۔

"تو خود کو عمدہ اور مکمل انسان سمجھتا ہے؟" اس نے سوال کیا میں خاموش رہا۔

"کیا یہ دنیا مکمل ہے؟" اس نے پھر سوال کیا۔ میں نے پھر جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ مجھے لگا میں کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گا۔

"جب یہ دنیا مکمل نہیں تو پھر انسان کس طرح مکمل ہوسکتا ہے مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے وہ ہی اپنی ذات میں معتبر ہے۔ وہ تخلیق کار ہے جیسے چاہے تخلیق کرے جب انسان ایک مکھی نہیں بناسکتا تو یہ مکمل اور نامکمل ہونے کا جھگڑا کیسا؟ اپنی ذات اور وجود کو لے کر کیسا تکبر؟ اس کی کاجل بھری آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ میری سوچ غلط تھی میں خود بھی آب دیدہ ہو رہا تھا۔

"تیری صرف سوچ غلط نہیں ہے۔ تیری نیت تیرا عمل بھی غلط ہے۔" میں لب کاٹتا پاس پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔

"تجھے ایک واقعہ سناؤں۔" وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا اگر حالات پہلے جیسے ہوتے تو اپنے ساتھ بیٹھنے پر میں اس کا منہ توڑ دیتا مگر اب حالات میں تغیر آ رہا تھا۔

"حسن بصریؒ نے ایک ہیجڑے کی طرف دیکھ کر کراہیت کا اظہار کیا۔ تو اس نے کہا میرا ظاہری حال سب پر روشن ہے مگر میرے دل کا حال سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں اور آخرت میں میرا اور تیرا کیا حال ہوگا کوئی نہیں جانتا۔ البتہ یہ سب جانتے ہیں کہ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے تو بھی کوئی اعلیٰ ارفع انسان نہیں ہے کہ مجھ سے یا مجھ جیسے لوگوں سے کراہیت محسوس کرے ہمارا ظاہری حال بھی تو اس ہی کی طرح ہے آخرت میں تیرے ساتھ کیا ہوگا میں نہیں جانتا۔ کیا تو جانتا ہے میرے ساتھ کیا ہوگا۔ اگر ہاں تو بتا کیا ہوگا؟ اگر نہیں تو کیونکر کراہیت محسوس کرتا ہے؟ میرے عمل کو تو جانتا ہوگا نیت کو نہیں۔ اکبر بدتملی کا عمل سب کے سامنے تھا وہ وہ اچھا تھا۔ کاش تو نے اس کی نیت کو اس کے عمل سے جانچا ہوتا وہ تو مخلص تھا سب کے ساتھ بے ضرر۔" وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگا۔

میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

"غلطی.... غلطی معاف نہیں ہوسکتی؟" میں نم لہجے میں بولا۔

"صرف کامل ذات ہی تجھے معاف کرسکتی ہے۔"

"کون؟" میں آہستہ سے بولا۔

"اللہ رب العزت۔" دھیمے لہجے میں کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے انسانوں میں بھی فرق ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ کچھ لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ میری خاموشی کو جواب سمجھ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ایک طرف چل دیا۔ وہ کون تھا میں نہیں جانتا تھا۔ وہ جو بھی تھا اسے اللہ نے میری رہنمائی کے لیے بھیجا تھا جس نے میری سوچ کو نیا رخ دیا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر میں نے آسمان کی طرف دیکھا پھر آنکھیں میچ کر میں شدت سے رو دیا تھا۔

www.naeyufaq.com

میری بن کے آؤ

یسما بنت عاصم

حمیدہ کے لیے آفس میں کام کرنے کا تجربہ نیا تھا اور اس سے بھی دشوار آمد و رفت کا سلسلہ' شہر کے وسط میں لمبی لمبی شفاف سڑکوں پر ٹریفک کا اژدھام اور مخصوص شور اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان سڑکیں پار کرتے اس کا نازک وجود بار بار حوصلہ کھو دیتا' رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتی گئی۔ کمسنی کی جان تو زمحنت کی عادی تھیں تو دفتر کی نوکری قدرے سہل معلوم ہوئی' خلاصی بھی جلد ہی ہو جایا کرتی تھی۔

اس روز وہ دفتر کی عمارت سے نیچے آئیں تو خلاف معمول سناٹا تھا۔ دفتر سے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ کچھ قدم کا تھا وہ شیڈ تلے آ کر کھڑی ہوگئی' حمیدہ کے سامنے سے جب کوئی جوڑا' بائیک یا کار پر گزرتا' اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی بھلا کیا کمی تھی اس میں' شاید وہ کسی کی شریک سفر بننے کی اہل ہی نہ تھی' لوگ اسٹینس دیکھتے ہیں' شکل و صورت' سیرت و کردار' مہر و وفا کون پرکھتا ہے' جبکہ سیرت و کردار کا انحصار ساری زندگی پر ہوتا ہے۔ اپنی ساتھیوں کی کمر میں بانہوں کا حلقہ ڈالے خوش باش گزرتی موٹر سائیکل سوار عورتوں کو رشک سے دیکھتی حمیدہ کا دکھ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید وہ کسی کی رفاقت کی قیمت ادا نہیں کر سکتی یا شاید اہل ہی نہ تھی۔

"لوگوں نے اپنا معیار گوری رنگت کو بنا لیا ہے' جہاں جیون ساتھی کی پرکھ صرف گوری رنگت ہے...... سیرت و کردار کو کون پوچھتا ہے؟" حمیدہ سوچتی رہی' کیا قسمت بھی گوری چمڑی سے مشروط ہوتی ہے؟ اور جو ذرا دبتی ہوئی ہوتی ہیں' انہیں مائے' چاچے' پھوپیاں سمیٹ لیتی ہیں...... وہ اپنے آس پاس دیکھتی تو سناٹا...... ہی سناٹا تھا' رشتوں کا فقدان اور جو تھے' وہ بھی کھرے نہ تھے

کاش ان کا بھی کوئی اپنا ہوتا جو رشتے کی دشواریوں کو سمیٹ لیتا' کوئی ماہوار تنخواہ کا ملازم' کار کا مالک نہ سہی' اسکوٹر سواری سہی' اس نے بھی مستقبل کے حوالے سے اونچے خواب نہ دیکھے تھے۔ عمر گزری تھی' چکی کی مشقت میں پستے ہوئے' اب خود کے لیے بے حد حساس ہوگئی تھی' خواب دیکھتی ضرور تھی مگر تعبیر پر گرفت بھلا کون رکھ سکا ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا' اس وقت بسیں کھچا کھچ بھری گزرتی تھیں مگر آج دور دور تک سناٹا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں' تب معلوم ہوا کہ ایندھن کی تعطل کے باعث ٹرانسپورٹ کم ہے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ سو پچاس کی قربانی دے ہی دیتی...... رکشہ یہاں سے صدر کے سو روپے لیتا تھا صدر سے گھر کے لیے جانے والی بس با آسانی مل جایا کرتی تھی' اس نے سامنے سے گزرتے رکشہ کو ہاتھ دیا جو انتہا کی بے رخی کا مظاہرہ کرتا گزر گیا کچھ دیر گزری سامنے سے گزرتی ایک سفید ٹویوٹا کی رفتار سست ہوئی پھر وہ بیک ہوتی نظر آئی۔

"مس حمیدہ......؟" ڈرائیونگ سیٹ پر سعد بن مصطفیٰ ہمدانی تھے۔ وہ کچھ آگے بڑھی تو انہوں نے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

"آ جایئے پلیز۔" سفید براق کلف دار لباس میں دوپٹا سر پر جمائے وہ انہیں خاصی مقدس مگر متذبذب سی لگی۔ "آ جایئے ناں' تکلف میں تکلیف ہے...... آج ٹرانسپورٹ کا ملنا بہت مشکل ہے۔" ناچار حمیدہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور سعد بن مصطفیٰ کو لگا' ان کے آس پاس کا ماحول مہکنے لگا ہو۔

"آپ کو میرا نام یاد ہے...... شاید ہماری صرف ایک ملاقات اور ایک دو بار فون پر بات ہوئی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے' اچھے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں یاد رکھنا نہیں پڑتا' وہ خود بخود یاد رہ جاتے ہیں۔" انہوں نے اپنے مخصوص شائستہ لہجے میں کہتے ہوئے موڑ کاٹا۔

’’میں...... میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔‘‘

’’تو میں کہاں کا خاص الخاص ہوں‘ عام سے لوگوں کو ہی تو عام سے لوگ یاد رہتے ہیں۔‘‘ حمیدہ کو یک دم ان کا اس روز والا جملہ یاد گیا۔ ’’آپ کی شخصیت ہی ایسی دل کو چھو جانے والی ہے......‘‘ وہ بے اختیار رخ موڑ کر بغور انہیں دیکھنے لگی۔ آف وہائٹ ٹو پیس سوٹ میں مناسب قدو قامت‘ کنپٹی پر گرے بال‘ دلکش خدو خال‘ ان کے خوب صورت دودھیا اسٹیئرنگ پر جمے ہاتھ پر بیش قیمت گھڑی۔ کتنا ٹھہراؤ تھا ان کی شخصیت میں اور ایسے لوگوں کے لیے اس نے سنا تھا کہ زخم خوردہ ہوتے ہیں۔ اس بلا کے وجیہہ اور دلکش شخص کو آخر کیا دکھ ہوسکتا ہے؟ بے اختیار وہ سوچنے لگی۔

’’ہائی دے وے‘ آپ کو جانا کہاں ہے؟‘‘ سعد بن مصطفیٰ کے پوچھنے پر وہ چونکی۔

’’آپ آؤٹ آف روٹ ہوجائیں گے۔‘‘ وہ اپنے علاقہ کا نام بتا کر بولی۔ ’’بہتر ہے مجھے کسی ایسی جگہ اتار دیں جہاں سے مجھے اپنے علاقے کے لیے ٹرانسپورٹ مل جائے۔‘‘

’’مسئلہ تو یہی ہے کہ ٹرانسپورٹ آپ کو کہیں نہیں ملے گی‘ ہر ہفتہ کو سی این جی بند ہونے کے باعث ٹرانسپورٹ انتہائی کم ہوتی ہے اور ممکن ہے آپ کے گھر جانے والا رستہ میری منزل سے ہوکر گزرتا ہو۔‘‘ حمیدہ کو ان کے جملے کی گہرائی سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور جب حمیدہ نے کچھ کہنا چاہا تو سعد بن کا موبائل بج اٹھا...... وہ ایکسکیوز کر کے کال سننے لگے اور جلد ہی ڈراپ کردی۔

’’میری بیٹی کی کال تھی‘ اسے کچھ بکس چاہییں۔‘‘

’’بیٹی......؟‘‘ نہ جانے کیوں‘ حمیدہ کے دل کو ٹھیس سی لگی اگرچہ ان کی عمر اسی امر کی غماز تھی مگر انداز...... وہ کوئی سڑک چھاپ دل پھینک ٹائپ تو ہرگز نظر نہ آتے تھے اور حمیدہ خود بھی کہاں اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتی

تھیں مگر ان کے شائستگی میں لیے انداز' لب ولہجہ' پسندیدگی کی غماز تھے' پھر وہ بھی تو نرم ونازک اور حساس سا دل رکھنے والی لڑکی ہی تھی' جو خود کو اہمیت دیے جانے پر نازاں ہو تو اس پر ہوتی چلی جاتی ہے...... شاید وہ بھی کسی گمان کا سرا تھام کر خوابوں کا سفر کرنے کو تھی۔ سعد حمیدہ سے اس کی جاب کے متعلق پوچھنے لگے تو وہ سہولت سے آمدورفت میں درپیش مشکلات کہہ گئی۔

''میرا رستہ اسی طرف سے جاتا ہے...... میں بخوشی آپ کو روز پک اینڈ ڈراپ کرسکتا ہوں' آئی تھنک' آفس ٹائمنگز بھی سیم ہیں۔'' حمیدہ سہولت سے ٹال گئی...... کبھی کبھی دوسروں کی زبانوں کو خنجر ہم خود فراہم کرتے ہیں اور حمیدہ ان ہی زبانوں سے ڈرتی تھی...... سعد بن جانچ گئے۔

''چلیے...... ایسے ہی ہنگامی حالات میں سہی...... پلیز مجھے کال ضرور کیجیے گا میرا آفس قریب ہی ہے' آپ کو یاد تو ہوگا ناں؟'' حمیدہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے سر......''

''میرا نام سعد بن مصطفیٰ ہے' آپ نام سے پکاریں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔'' بھلا کسے برا لگتا ہے' تو جدیے جانا' چاہنا یا سراہے جانا پھر وہ تو حمیدہ تھی' جسے کبھی التفات کا ایک پھول بھی نصیب نہ ہوسکا تھا' سو دھیرے سے ایک دریچہ وا ہوتا چلا گیا تھا۔

......❁......❁......

فاصلے بہت تیزی سے سمٹ رہے تھے۔ اجنبیت کی دیوار بہت آہستہ آہستہ گر رہی تھی مگر انتہائی غیر متوقع...... حمیدہ کی زندگی میں محبت کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ مگر ان کے بس میں ہوتا تب ناں۔ سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کی شخصیت تو آسمان کی وسعتوں کی مانند تھی۔ حمیدہ میں نہ سر کرنے کا حوصلہ تھا نہ بساط مگر کبھی کبھی کچھ فیصلے خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں سو یہ سب بھی بس خود بخود ہوتا چلا گیا تھا بالکل اچانک اور غیر متوقع۔

انہیں وقتاً فوقتاً کالز کرنا حمیدہ کو اچھا لگنے لگا تھا اور پھر ان کا ہر بار پوچھنا۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا......؟'' اور اسے لگتا...... وہ ہر بار کھل اٹھتے ہیں اور آخر کار ایک روز کہہ ہی دیا۔

''آپ کی کال سے میں کبھی ڈسٹرب نہیں ہوتا...... ہو ہی نہیں سکتا اور ایک بات بتاؤں میں آپ کو......''

''جی......؟''

''مجھے ہر بار ہی نہایت خوشی ہوتی ہے۔'' حمیدہ کو لگا اس کے آس پاس کوئی ٹھنڈا میٹھا جھرنا پھوٹ پڑا ہو۔

''تھینک یو سو مچ...... مجھے بھی آپ سے بات کرکے بہت خوشی ہوتی ہے۔'' وہ کہتے کہتے جھجکی مگر سعد بن مصطفیٰ کو جیسے پسندیدگی و اپنائیت کا ننھا سا پھول نصیب ہوگیا۔

''نا...... نا...... اچھے ریلیشنز میں فارمیلیٹیز نہیں ہوتیں۔ نو تھینکس...... سوری...... اینڈ پلیز آپ سو بار ڈسٹرب کرسکتی ہیں' نو پرابلم۔''

''مگر آپ کا نمبر کسی منسٹر کے نمبر سے کم نہیں' اکثر تو آپ کا موبائل مصروف رہتا ہے یا پھر کال ہی ریسیو نہیں ہوتی۔''

''مجھے گھر اور آفس کے معاملات ایک ساتھ جو نمٹانے ہوتے ہیں' بچوں کو اسکول' کالج سے پک اینڈ ڈراپ...... پیرنٹس ڈے کے علاوہ ہزار ذمہ داریاں...... کچن' گروسری یہ وہ......'' پھر ان کا لہجہ بدلا۔

''ورنہ کوئی لڑکی مجھے فون کرے اور میں اس کا جواب نہ دوں کیا میں آپ کو ایسا لگتا ہوں؟'' حمیدہ دھیرے سے ہنس دی۔

''واہ کتنی خوب صورت ہنسی ہے......'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔ ''جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔'' اور حمیدہ کا وہی ایک جملہ۔

''ارے نہیں میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔'' اور ان کا کھنکتا سرشار سا جواب۔

"عام سے لوگوں کو ہی تو عام سے لوگ یاد رہتے ہیں...... جو سچ پوچھیں تو آپ کی کالز سے میں فریش سا ہو جاتا ہوں۔ دل کو ایک احساس گھیر لیتا ہے ہاں کوئی تو ہے جو یاد کرتا ہے۔" ان کے لہجے میں یاسیت سی گھل گئی تھی۔ حمیدہ کو عجیب سا لگا' انسانی زندگی میں اگر سو مسائل ہیں تو ننانوے پیسے کی کمی کی بدولت...... اس بظاہر خوش حال وآسودہ نظر آتے شخص کی زندگی میں بھلا کیا کمی ہو سکتی ہے؟

دنوں وہ اسی سوال کا جواب کھوجتی رہی مگر سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کی شخصیت جیسے کوئی بند قلعہ تھی' جس کے اندر کیا کچھ تھا یہ سب وہ خود ہی جانتے تھے مگر حمیدہ کو لگتا کچھ ہے جو بس ان کے اندر ہے مگر یہ ان کے لہجے کی یاسیت اور لفظوں کا کمال اور اکیلا پن ہی تھا جس نے حمیدہ کے نازک دل کو موم کر کے چپکے سے کوئی در وا کر دیا تھا اور پھر ہر روز ایک فارمل سا ایس ایم ایس حمیدہ کی عادت بنتا چلا گیا تھا۔

"دنیا سب سے بڑی کتاب ہے...... جو پڑھی نہیں جا سکتی اور زمانہ سب سے بڑا استاد ہے جو سب کچھ سکھا دیتا ہے یا پھر...... نفرت اور نظر انداز کرنا وہ عمل ہیں جنہیں ایک لمحے میں محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ محبت اور وفاداری کرنا وہ عمل ہیں جنہیں ثابت کرنے میں پوری زندگی بیت جاتی ہے۔" وہ کبھی جواب نہیں دیتے' وہ میسجز کے عادی ہی نہ تھے مگر جانے کیوں حمیدہ انہیں سکھ کا ایک لمحہ دیتے رہنا چاہتی تھی' جیسے آزردگی' و یاسیت کے بھڑکتے الاؤ میں خوشی کا ایک ادنیٰ سا قطرہ۔ ڈیلیوری رپورٹ آتی تو وہ جان جاتی کہ میسج ان تک پہنچ گیا' جواباً ان کا ہنستا مسکراتا سا تھینکس اور اکثر تو وہ بھی نہیں اور پروردگار کو جب دو انسانوں کی راہ ایک کرنا ہوتی ہے تو شاید یونہی کوئی معمولی سی چیز محرک یا جواز بن جاتی ہے۔ حمیدہ کے فارمل ہنستے مسکراتے یا صبح بخیر کے پیغام بھی ایک جواز بن گئے تھے۔

جیسے...... رشتہ جتایا نہیں جاتا نبھایا جاتا ہے پھر چاہے دور ہو یا پاس اور

"لائف از ریئلی ناتھنگ وِد ڈیپ لوگف لوٹو اویری بٹ ڈونٹ ایکسپیکٹ سیم فارم ادور بیکوز اٹس ناٹ فیلوئے۔"

اور ایک بار پھر ان کا دل کو چھیدتا جملہ...... کوئی تو ہے جو یاد کرتا ہے اور ان ہی میسجز کے تبادلے میں ایک بار حمیدہ سے غلطی ہو گئی۔

"آئی ایم اے پولیس آفیسر...... اینڈ یو آر انڈر اریسٹ...... کیونکہ جتنے پیارے آپ ہو اتنے پیارے ہونا قانوناً جرم ہے اس لیے آپ کو دل میں عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔" حمیدہ نے ایس ایم ایس کیا تھا ثمینہ کو اور چلا گیا سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کے نمبر پر کہ فون بک پر دونوں نمبر آگے پیچھے تھے۔ ڈیلیوری رپورٹ آئی تو حمیدہ نے سر پیٹ لیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا...... سعد بن مصطفیٰ کی کال اسی وقت آ گئی۔

"زہے نصیب...... میں ہوں جان و دل سے حاضر۔" خوشی سے کھنکتا سرشار لہجہ۔

"ارے نہیں...... بس یونہی' ایک شرارت تھی۔" بات سنبھالنی ہی تھی۔

"اچھا...... تب ہی میرا دل...... زور زور سے دھڑک رہا تھا۔" ان کے لہجے میں اتنی سرشاری واپنائیت تھی کہ معذرت و وضاحت کے تمام لفظ دھرے کے دھرے رہ گئے۔

"آپ کے ان ہی میسجز سے مجھے ایک نیا تجربہ ہوا کہ جب کوئی لڑکی بلکہ اچھی لڑکی مستقل میسجز کرتی ہے تو وہ یاد آنے لگتی ہے۔"

"ارے نہیں...... میں اچھی لڑکی کہاں' میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔"

"ہائے...... کوئی میرے دل سے پوچھے......" وہ دھیرے سے گنگنائے۔ "ایک عام سی لڑکی بھی خاص الخاص بن جاتی ہے جب بار بار دل پر دستک دیتی رہے اور آپ کو پتا ہے ناں کسی کا مستقل یاد آنا' دستک دیتے

رہتا کس جذبے کی ابتدا ہوتا ہے؟'' حمیدہ کا دل دھک دھک کرنے لگا تو کیا وہ کسی نئے جذبے کی اسیر ہونے چلی تھی۔ سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کی شخصیت اتنی مکمل اور بھرپور تھی کہ اسے اپنا وجود پانی ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

''یقین مانو جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس لڑکی سے کبھی اتنی فرصت میں بیٹھ کر بات کروں گا۔''

''اور میں نے تو شاید پہلی بار میں ہی خود پر سے اختیار کھو دیا تھا۔'' بے اختیار وہ کہہ گئی اور سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کو اقرار کے سارے رنگ مل گئے تھے۔ وہ نازک کامنی سی لڑکی سچ سچ ان کے وردل پر دستک دیتی محسوس ہوتی مگر وہ اس سے کیسے کہتے کہ ان کا وجود ان دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے...... ان کی زندگی میں محبت جیسے جذبے کی گنجائش ہوتی تو وہ بڑھ کر اس لڑکی کو سمیٹ لیتے مگر عرصہ ہوا انہوں نے خود پر سے اختیار کھو دیا تھا اور یہ شاید زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ خود کو ہارتا ہوا محسوس کررہے تھے اور شاید اس جیسی کسی محبت کرنے والی لڑکی کے وجود سے ہی ان کے اندر کا خلا بھرنے لگا تھا۔ اب وہ اکثر کہہ جاتے گفتگو لطیف پیرائے میں ڈھل گئی۔

''ایک تو تم اچھی بہت ہو......''

''وہ تو میں ہوں......''

''اتنی اچھی ہو کہ دل چاہتا ہے......'' حمیدہ نے ان کا جملہ کاٹا۔

''کہ دو ہوتیں......'' حمیدہ کے برجستہ جملہ پر سعد بن مصطفیٰ کا قہقہہ خاصا جاندار تھا۔

''سچ بتاؤں تو تم سے بات کرکے کچھ پل کے لیے میں خود کو بھول جاتا ہوں۔ تم جیسی لڑکیاں ہی کسی ادھورے انسان کو مکمل کیا کرتی ہیں۔'' حمیدہ چپ سی ہوکر رہ گئی' بھلا ان کے وجود کی کیا کمی تھی؟ عزت نفس عزیز نہ ہوتی تو اتنا ضرور کہتی...... ان کے طبقے میں تیس سال سے اوپر ہوجانا' دنیا کو سنگ فراہم کردیتا ہے اور یہ کہ دیکھوں میں کنڈیکٹر اور کالج کی لڑکیاں اب انہیں آنٹی کہہ کر پکارنے لگی ہیں اور تو اور ان کی اپنی اماں انہیں یوں عمر گزر جانے کے طعنے دیتی ہیں جیسے اپنے بن بیاہے رہ جانے کی وہ خود قصوروار ہوں مگر ہائے ری مجبوری...... لب ہلے اور شکایات نے دم توڑ دیا۔ حمیدہ نے بات کا رخ موڑ دیا تھا پھر ان ہی باتوں میں جانے کتنا وقت بیت گیا۔

آفس کی بتیاں گل ہونے لگیں اور پیون ان کے سر پرآ کھڑا ہوا تو انہیں وقت گزرنے کا احساس ہوا اور وہ بے ساختہ مسکرا اٹھے تھے۔ وہ دلکش چہرے اور شفاف کردار والی معصوم سی لڑکی کچھ ہی دنوں میں ان کو اپنا عادی کرگئی تھی۔ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تلخی حیات کے سبب دنوں اس کی خبر نہ لے پاتے اور وہ جیسے ہر پل انہیں یاد رکھتی۔ گاہے بگاہے ایس ایم ایس یا پھر کال۔ سچ تو یہ تھا کہ انہیں لگتا ان کے اندر کا خلا بھرنے والا ہے۔ ان کے اطراف میں کسی ان کہے جذبے کی خوشبو مہکنے لگی ہے۔ انہیں لگتا' حمیدہ ان کی ذات کی اسیر ہورہی ہے پھر کہاں ممکن تھا کہ وہ اپنا دامن بچا پاتے' ان کی زندگی میں ایک محبت کی ہی تو کمی تھی۔

آج پورا سوا گھنٹہ اوپر ہوگیا تھا انہوں نے سب سے پہلے حمیدہ کو کی گئی کال ڈیلیٹ کیں پھر گھر کا قصد کیا...... نرگس ان کے تمام سامان' خصوصاً موبائل کو بھرپور چیک کرتی اب بھی گھر بھر میں چکرا رہی تھیں۔

''آگئے تم...... آ گئی گھر کی یاد...... آج اتنی تاخیر؟''

''وہ آفس ہے...... کوئی سنیما کا شو نہیں کہ وقت پر ختم ہوگا...... دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔'' وہ اطمینان سے کہہ کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگے مگر نرگس بے قابو ہورہی تھیں۔

''پورا گھنٹہ تمہارا موبائل بزی جاتا رہا' کس سے باتیں کررہے تھے؟''

''نرگس...... اللہ کے واسطے انسان بن جاؤ...... میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔''

''بکواس مت کرو اور مجھے موبائل دکھاؤ۔'' وہ چیل

کی طرح چھپٹی مگر سعد بن مصطفیٰ بگڑ اٹھے۔

''بی ہیو یور سیلف...... اسٹوپڈ عورت...... زندگی اجیرن کرکے رکھ دی ہے' تمہارے اس دن رات کے شک نے......'' وہ جانے کیسے کہہ گئے۔

''کیا......! میں نے تمہاری زندگی اجیرن کی ہے؟ تم دغاباز' جھوٹے آدمی...... زندگی تو تم نے میری برباد کی ہے' تم جیسے دو ٹکے کے آدمی سے شادی کرکے میں تباہ ہوگئی ہوں۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح ذرا سی بات پر طوفان کھڑا کردیا' اگلے ہی پل چیخ چیخ کر اپنے جوان جہان بیٹے کو آوازیں دینے لگی۔

''نبیل...... نبیل...... کہاں ہو تم... یہاں دیکھو ذرا اپنے باپ کے کرتوت...... یہ گھر سے باہر گلچھرے اڑاتا پھرے اور میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتی۔'' اگلے ہی پل نرگس کی ڈھال اس کا جوان جہان بیٹا کڑے تیور لیے کھڑا تھا۔

''میں نے آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ ماما کو ٹینشن مت دیا کریں مگر شاید آپ چاہتے یہی ہیں کہ وہ ذہنی اذیت کا شکار ہوکر مرجائیں۔''

''نبیل......'' وہ بے بسی سے دو قدم آگے بڑھے' نرگس نے اپنی ان ہی شاطرانہ چالوں سے اولاد کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔

''نام مت لیں میرا...... باپ کہلانے کے قابل نہیں ہیں آپ...... اپنی عیاشیوں پر بڑی بڑی رقمیں اڑا دیتے ہیں اور اس دن میں نے بیس ہزار مانگ لیے تو......'' نرگس چیخ چیخ کر اپنے بال نوچ رہی تھی' احتجاج کا مقام ہی نہ تھا وہ کیسے کہتے کہ ان کی تمام تر آمدنی نرگس کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے کہ وہ خود تو جیسے اپنے آپ کو بیچ چکے تھے اور نبیل کو بیس ہزار دینے کا مطلب اسے مزید چھوٹ دینا تھا...... وہ آوارہ مزاج اور بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ سعد بن مصطفیٰ کو اس کی تمام حرکات کی خبر رہتی مگر وہ اب ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

اب بھی نبیل کا موبائل بجنے لگا شاید مس بیل تھی...... وہ یک دم چوکنا ہوکر گھر سے نکلتا چلا گیا۔

جہاں بنگلے کے باہر آہنی صدر دروازے کے اس پار' دو مسلح لڑکے اس کے منتظر تھے۔ اسی کے ہم مزاج اور اس کے ساتھی...... ''تھرل'' کے نام پر وارداتیں کرنا جن کا مشغلہ تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اسکوٹر پُرشور آواز کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔ ادھر نرگس چیختے چیختے بے دم ہوکر ہوش وحواس کھو بیٹھی تھیں۔ سعد بن مصطفیٰ کو اپنے فیملی ڈاکٹر کو کال کرنی پڑی۔ اس نے تمام طبی امداد دے کر مایوسی سے سر ہلایا۔

''انہیں پھر ہاسپٹل ایڈمٹ کرنا پڑے گا...... اٹیک شدید ہے۔ سعد بن مصطفیٰ کسی بھی قسم کا اسٹریس' اٹیک کا باعث بن سکتا ہے...... یہ بات میں تمہیں کئی بار بتائی ہے۔'' ڈاکٹر بھی انہیں ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سعد بن مصطفیٰ ایک سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

بہت گہرے خیالوں میں
محبت کے حوالوں میں
تمہارا نام آجانا!
مجھے اچھا سا لگتا ہے......!!

اس روز بالکل اچانک اور غیر متوقع سعد بن مصطفیٰ کی کار ٹکرا گئی' ان کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا تھا' کئی جگہ زخم کسک دینے لگے تو قریبی کلینک کا رخ کرنا پڑا۔ معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ چند خراشیں مگر پرائیویٹ کلینک کی روایت کے عین مطابق' گھنٹوں کے حساب سے بل بنانے کے لیے فوراً ڈرپ لگادی گئی تھی۔ اب اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ فارغ ہی فارغ تھے۔ انہوں نے پلنگ کی پشت سے سر ٹکایا تو بے ساختہ تصور میں وہ دلکش سی لڑکی گھوم گئی۔ بے ساختہ خدا نہ کرے' کہا تھا۔ وہ مسکرا دیے اور شرارتاً ایک ایس ایم ایس کردیا...... جانتے تھے کہ حادثے کی بابت جان کر وہ تڑپ اٹھے گی اور یہی ہوا' اگلے ہی پل ان کے موبائل اسکرین پر حمیدہ کا نام جگمگا رہا تھا مگر بیل بجتی رہی در وہ

آنکھیں موندے مسکراتے رہے۔ آج دل اس معصوم سی بے لوث لڑکی کے جذبوں کی شدت جانچنے کا طلب گار تھا اور اگلے لمحے سے پہلے حمیدہ..... افتاں و خیزاں ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے دلچسپی سے فیروزی و سیاہ کنٹراس کے فینسی ڈریس میں ملبوس گھبرائی سی حمیدہ کو دیکھا جو گھبراہٹ اور بے دھیانی میں ان کے بے حد نزدیک بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ہوا..... کیسے ہوا ایکسیڈنٹ..... زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟''

''کچھ نہیں..... بس چند خراشیں' دو چار چوٹیں' بس تمہیں دیکھنے اور ستانے کو دل چاہا تھا۔'' وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''آں.....!'' وہ منہ پھلا کے رخ موڑ گئی۔ ''اتنا سیریس مذاق' میری تو سانس ہی اٹک گئی تھی۔''

''اچھا.....'' وہ دلچسپی سے مسکرائے۔

''مجھے بھی کب اچھا لگتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں میں انہیں پریشان کروں۔'' حمیدہ دھک سے رہ گئی اور سعد بن مصطفیٰ کی نظریں' حمیدہ کی گھبراہٹ' اٹھتی گرتی پلکوں کی چلمن سے عیاں الجھن پر ٹھہر گئیں۔ ان نظروں میں شرارت' لبوں پر دھیمی مسکان تھی۔ حمیدہ نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

''شکر ہے آپ کو اتنا تو پتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کو یاد کرتے ہیں۔''

''کتنی عجیب بات ہے ناں' ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن کہتے نہیں..... ہاں مگر محسوس ضرور کرتے ہیں۔'' حمیدہ کو لگا کائنات ایک پل کو ٹھہر سی گئی ہو۔ دل کی دھڑکن اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہونے لگی' سعد بن مصطفیٰ کو کہنا پڑا۔

''جب محبت کرتی ہو تو کہتی کیوں نہیں؟'' حمیدہ نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلائی۔

''میری زندگی میں جو کچھ ہے..... اس میں سب سے عزیز مجھے آپ ہو اور یہ آپ بھی جانتے ہیں۔''

''اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔'' اس کی گھنیری پلکیں لرزیں اور پھر جھکتی چلی گئیں۔ صدیوں کے فاصلے جیسے لمحوں میں سمٹ گئے اور سعد بن مصطفیٰ کو اقرار کے تمام رنگ میسر آگئے تھے۔ وہ سرشار سے ہوگئے۔

''سب کچھ یہاں.....'' سعد بن مصطفیٰ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''دل سے ہوتا ہے اور دل کا رشتہ دنیا کے ہر رشتے سے معتبر ہوتا ہے..... دنیا کی ہر چیز ہم تھوڑی بہت کوشش سے حاصل کرسکتے ہیں لیکن محبت..... صرف اور صرف قسمت سے ملتی ہے۔''

''ہاں مگر یہ بات تب پتا چلتی ہے جب وہ محبت کہیں کھو جاتی ہے۔ پتا ہے آپ نے مجھ سے ایک جملہ کہا تھا..... وہ جملہ اگر آپ نہ کہتے تو میں کبھی آپ کو ایس ایم ایس نہ کرتی.....''

''اچھا.....! کون سا؟''

''کوئی تو ہے جو یاد کرتا ہے۔'' حمیدہ سوچ کر مسکرائی۔ مگر راکھ کرید کر چنگاری برآمد کرنا تو کوئی سعد بن مصطفیٰ سے سیکھے۔

''تو پھر آج جان جائیے کہ کوئی ہے جو نا صرف آپ کو شدت سے یاد کرتا ہے بلکہ چاہتا بھی ہے۔'' حمیدہ کو لگا یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ پلٹ کر آنے والا نہیں۔

''تو پھر میں بھی اقرار کر ہی دوں کہ مجھے تم سے محبت ہے..... یقین کرنا.....'' اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر انہوں نے سینے پر رکھا اور انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے یقین ہے مگر نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ یہ محبت بس مجھ تک ہے اور مجھ ہی پر ختم ہوجائے گی۔''

''میں نے تم سے ایک جملہ کہا تھا وہ جملہ تم شاید بھول گئیں کہ تم جیسی لڑکیاں ہی کسی ادھورے ٹوٹے ہوئے انسان کو مکمل کیا کرتی ہیں۔'' حمیدہ کو لگا جیسے پل بھر کو کائنات ٹھہر سی گئی ہو' جانے وہ کب تک ان لمحات کی گرفت میں رہتی کہ نرس آگئی۔ ڈرپ ہٹائی تو وہ جھٹ

سے اٹھ بیٹھے اور جوتے پہننے لگے۔
"کیسے آئی ہو؟"
"آپ نے ایسا خطرناک ایس ایم ایس کیا کہ میں رکشہ والے کو ہسپتال کا نام بتا کر بیٹھ گئی...... اب یہاں سے کون سا روٹ جائے گا یہ بھی نہیں معلوم۔"
"چلو تمہیں چھوڑ دوں......" وہ حمیدہ کی ہتھیلی کو ہولے سے لبوں سے چھو کر کھڑے ہوگئے۔
"پک کرتے ہی ڈراپ کرنے کے ارادے......؟" حمیدہ کے لہجے میں مبہم سی شرارت اُمڈ آئی۔
"جی نہیں جناب...... پک کرتے ہی اڑا لینے کے ارادے۔" سعد بن مصطفیٰ نے برجستہ کہا اور حمیدہ دھیرے سے ہنس دی۔

○......○......○

ثمینہ سن کر بہت ہنس دی۔
"اوہ...... اور وہ تمہارے دعویٰ کیا ہوئے؟"
"محبت ہوگی تو بس ایک بار...... جو جائز ہوگی۔" اس نے حمیدہ کی نقل اتاری۔
"اب تم جیسی لڑکی کو یہ بات بتانے کی تو نہیں کہ انسانی زندگی میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو کیا نہیں جاتا بس ہو جاتا ہے۔"
"ہاں...... جیسے محبت......" وہ ہنسی۔ "اور وہ جو تمہارے ارادے تھے...... مال دار آدمی سے شادی کرکے اپنی فیملی کو سپورٹ دینے کے مسائل تو مجھے سکون سے مرنے بھی نہیں دیں گے مجھے معلوم ہے میں سدھار جاؤں تو گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا نہ صرف مالی بلکہ گھریلو مسائل بھی جنم لیں گے۔"
"انسان اپنی ذمے داریاں بھول جائے تو بگاڑ ہی پیدا ہوگا ناں۔"
"دیکھا جائے تو یہ فکرات تمہارے لیے نہیں ہیں۔"
"یہ ساری بھاگ دوڑ...... پیسے کے پیچھے ہے...... یہ نہ ہو تو کوئی مجبوری نہ ہو...... میں آزادی سے گھر میں بیٹھی روٹیاں پکاتی نظر آؤں...... مجھے گھر میں رہنا اچھا لگتا ہے سکھ ملتا ہے۔" اس نے سکھ سے آنکھیں موند لیں۔
"ایک خواب اور خواہش ہے کہ اپنا گھر ہو...... ایک جیون ساتھی کبھی کبھی دل بہت چاہتا ہے سکون کی نیند سوؤں کسی کا پیار اور انتظار۔" وہ آنکھیں موندے ایک جذب سے کہتی چلی گئی تو ثمینہ نے ٹوک دیا۔
"اے کہاں گم ہوگئی لگتا ہے پیا جی کے سنگ خوابوں کے سفر پر نکل گئی ہو۔"
"اُفوہ...... تم بھی تاں بس......" وہ جھینپ کر رہ گئی۔
"ایک دم آسمان سے زمین پر لاکر پٹخ دیتی ہو۔"
"جناب...... محبت کا خواب بڑا دلکش...... بہت مسرور کن ہوتا ہے۔ یوں ہی آسمانوں کی سیر کراتا ہے۔"
"زندگی میں پہلی بار لگا ہے کہ کچھ اپنا ہے اور وہ ہے میرا دل اس کے احساسات ورنہ وجود تو بس دوسروں کی خدمت کے لیے ہے...... زندگی چکی کی مشقت میں پس کر رہ گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی گہرا دکھ ہے اس شخص کے اندر...... اندر ہی اندر پلتا پنپتا کوئی ناسور...... احساسِ تنہائی کا مارا لگتا ہے مجھے۔ سچ جیسا اس نے کہا کسی نے تو یاد کیا...... بڑا دکھ ہوا مجھے...... آسودہ حال...... فیملی والا بندہ...... ایسی بات کہے تو عجیب سا لگتا ہے۔"
"جانے بھی دو...... سب ڈھکوسلے ہیں مرد ذات کے لڑکیوں کی توجہ حاصل کرنے کے ہتھکنڈے۔"
"وہ ایڈورٹائزنگ کی فیلڈ میں ہیں...... مجھ سے ہزار گنا بہترین لڑکیوں سے دن رات واسطہ رہتا ہوگا...... اسے ضرورت بھی کیا ہے مجھ جیسی عام مڈل کلاس لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ڈھکوسلے کرنے کی...... وہ خود اتنا مکمل ڈیشنگ اور چھا جانے والی شخصیت رکھتا ہے۔ سچ لگتا ہی نہیں کہ جوان بچوں کا

باپ ہے۔‘‘
’’شاید اپنی اسی خوبی کا ہر جگہ فائدہ اٹھاتا ہو۔‘‘
’’تم سچ مچ بہت بدظن ہو مرد ذات سے‘ میری طرف غور سے دیکھو میں اگر اتنی آسانی سے بے وقوف بننے والی ہوتی تو اب تک ہزار بار بن گئی ہوتی۔‘‘
’’تم اگر مرد ذات کے پینتروں سے واقف ہوتیں تو شاید کوئی دعویٰ ہی نہ کرتیں۔‘‘
’’ثمینہ ڈیئر مردوں کے بارے میں اتنی بری رائے رکھنے سے پہلے اتنا ہی سوچ لو کہ ہمارے باپ بھائی بھی تو آخر مرد ہی ہیں۔‘‘
’’تو کون سا تعریفی میڈل پہنا رکھا ہے تمہیں...... ساری گھر کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا کر جان مارتی ہو تو کیا صلہ مل جاتا ہے؟ ناقدر شناسوں کے لیے اپنی عمر گنوا رہی ہو‘ چار حروف بھیجو سب پر اور شادی کرلو۔‘‘
’’اچھا...... کس کس سے کرلوں...... مدت ہوئی کوئی اچھا رشتہ آئے ہوئے اور محترمہ ابھی تو مردوں کے خلاف گولہ باری کی جارہی تھی اور اب مجھے شادی کا مشورہ دیا جارہا ہے...... چہ خوب۔‘‘ وہ پل بھر کو لاجواب نظر آئی پھر استفسار کیا۔
’’پھر بات کہاں تک پہنچی...... پک اینڈ ڈراپ کے سلسلے کے علاوہ......؟‘‘
’’لگتا ہے کوئی گہرا دکھ ہے اس شخص کے اندر اور سنا ہے‘ جو لوگ خاموشی سے ہر بات سہہ جاتے ہیں‘ ان کے بارے میں طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہی ہوتا ہے۔‘‘
’’تم نے بتایا وہ مڈل ایج ہیں...... میرڈ‘ جوان بچے...... تمہاری اور ان کی عمروں میں کافی فاصلہ نہیں ہوگیا؟‘‘
’’اماں ٹھیک کہتی ہیں...... دو چار سال اور گزر گئے تو کوئی نہیں پوچھے گا مجھے‘ آدھے بال پک پک کر سفید ہوگئے ہیں...... بھلے وقتوں میں بیاہی جاتی تو خود جوان بچوں کی ماں ہوتی...... میری شخصیت ٹھہر ہی کہاں پائی ہے ان کے سامنے‘ سنجیدگی‘ متانت‘ ٹھہراؤ شاید میں آئیڈیل تراشتی تو وہ ایسا ہی ہوتا...... بہت خوش قسمت ہے وہ عورت جس نے اس کا ساتھ بنا کسی دشواری اور شاید خواہش کے پایا ہے۔‘‘
’’یہ جو محبت ہوتی ہے ناں یہ کسی بخار کی سی شدت سے انسان کو جکڑتی ہے اور جب اس کا زور ٹوٹتا ہے تو یقین کرو بہت کچھ بکھرتا ہے۔‘‘
’’اف ثمینہ اللہ کے واسطے یہ خوفناک باتیں پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو ابھی تو بس دل کو اس عشق کی سرمستیوں میں ڈوب کر ابھرنے اور پھر ڈوبنے دو۔‘‘ اس نے ایک جذب سے کہتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں موند لی تھیں۔
’’پاگل ہو...... سچ مچ پاگل ہو۔‘‘ ثمینہ ہنس دی تھی۔

’’اللہ بچائے ان آئے روز کی ہڑتالوں سے ٹرانسپورٹ کی بندش اور ناسازگار حالات کے سبب پھیلتی افراتفری سے‘ آج کے اخبارات میں پھر خبریں بھری پڑی تھیں سنا تھا آج پھر ہنگامی حالات سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ اب روز روز تو چھٹی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ نئی نئی تو نوکری تھی حمیدہ کو اس پل سعد بن مصطفیٰ کی بات یاد آئی تھی...... سو کچھ سوچ کر انہیں فون ملایا مگر بیل جاتی رہی اور کال تب ریسیو کی گئی جب وہ مایوس ہوکر ڈراپ کردینے کو تھی۔
’’اتنی دیر......‘‘ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ ’’میں کب سے ٹرائی کررہی تھی۔‘‘
’’سوری کچن میں تھا...... بچوں کے لیے ناشتہ بنا رہا تھا۔‘‘ وہ بے اختیار کہہ گئے۔
’’جی......! ناشتہ بنا رہے تھے...... آپ......؟‘‘ حمیدہ کو بے حد حیرت ہوئی۔
اور اسی پل سعد بن مصطفیٰ کو اپنی خطا کا احساس ہوا...... مگر اب جب بات کھل ہی گئی تھی تو کچھ اور کہا انہوں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا نرگس اس

وقت دواؤں کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی۔
"تو اور کیا...... میں کچن کے معاملات بہت اچھی طرح ہینڈل کرلیتا ہوں...... نا صرف بچوں کے لنچ باکسز تیار کر کے انہیں ناشتا بنا کر دیتا ہوں بلکہ ہر طرح کے کھانے پکانے میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔" ایک پل حمیدہ کو یقین ہی نہ آیا' ان جیسی سنجیدہ متین' رکھ رکھاؤ والی سوبر شخصیت سے اس طرح کی گھریلو کاموں کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔
"واہ...... کیا کہنے۔" حمیدہ کو اچھا نہ لگا کہ اس بابت وہ کوئی ذاتی سوال کرلی اور سعد بن مصطفیٰ خود بھی کہاں اپنی ذات کے پرت کھول کر رکھ دینے کے قائل تھے وہ کچھ کہتے مگر اسی پل نرگس سوتی جاگی سی کیفیت میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئیں تو وہ محتاط سے نظر آنے لگے۔
"پھر تو آپ سے...... آپ ہی کے ہاتھ کا لنچ لینا چاہیے۔" حمیدہ نے مزاقاً کہا مگر سعد بن مصطفیٰ کا لہجہ بدل گیا۔
"کام کی بات کریں......" یک دم ان کا لہجہ خشک وسرد سا ہوگیا تو حمیدہ دنگ رہ گئی۔
"کام کی بات......" وہ ہڑبڑائی' سعد بن مصطفیٰ کے لہجے کے بدلاؤ سے اس کے دل پر ایک بوجھ سا آپڑا تھا۔ کتنا اجنبی و بے گانہ سا انداز تھا۔
"سوری آپ کا وقت لیا اور ڈسٹرب کیا۔" حمیدہ نے شکستہ لہجے میں کہتے کال ڈراپ کردی' ایک سبکی کا احساس اس کے آس پاس سسکنے لگا تھا۔ کتنا ارزاں اور بے مول کردیتی ہے یہ محبت انسان کو کبھی کبھار۔ وہ جواز ہی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے کہ حقائق قابل بیاں جو نہیں ہوتے' وہ بھی ایسے ہی گومگو کی کیفیت میں گھر گئی تھی۔
"کس سے باتیں کررہے تھے؟" سعد بن مصطفیٰ مڑے تو نرگس سامنے تھی۔
"ایک دوست کا فون تھا۔" وہ نظریں چرا کر آگے بڑھنے لگے تو نرگس خطرناک تیور لیے جھپٹ پڑی۔

"نظریں کیوں چرائیں تم نے...... ادھر دکھاؤ موبائل۔"
"اوہ...... اف...... یہ کیا جنگلی پن ہے۔" ایک اذیت سے وہ چلا اٹھے۔ ان کے ہاتھوں پر نرگس کے رنگے ہوئے ناخن خراشیں ڈال گئے تھے جبکہ وہ ایک وحشیانہ کیفیت میں کھٹا کھٹ ساری ریسیو کی گئی کالز چیک کررہی تھیں...... ان کی فیلڈ ہی ایسی تھی کہ نرگس ان کی بابت چوکنی رہتی...... ان پر بھرپور نظر رکھتی...... اگرچہ وہ نرگس کی اس شکی طبیعت کی بدولت ہمیشہ محتاط رہے تھے مگر شادی کے بعد ان کی زندگی سکھ کا مفہوم ہی بھول گئی تھی۔ سعد بن مصطفیٰ کی وجیہہ' چھا جانے والی شخصیت کے سامنے وہ دب کر رہ جاتی تھی۔ بڑی عمر کی عام شکل وصورت کی متمول عورت' ان کی ذات ہمیشہ اس عورت کی ستم ظریفیوں کا شکار رہی کہ اپنی شخصیت کی تمام تر خامیاں خود نرگس پر بھی عیاں تھیں۔ احساس کمتری نے اسے ذہنی مریضہ بنادیا تھا۔ ان کا فون تادیر انگیج جائے یا گھر تاخیر سے لوٹتے تو ایک عذاب ان کا منتظر ہوتا۔ وہ یوں ہی بات بات پر طوفان کھڑا کردیا کرتی...... سو انہیں محتاط رہنے میں ہی عافیت نظر آتی تھی۔ نرگس کی ذہنی بیماری کے سبب ان کی زندگی کسی اجاڑ ٹوٹے کھنڈر کی مانند منتشر ہوکر رہ گئی تھی اور یہ وہ دکھ تھا' جواب ناسور بن گیا تھا۔

......✿......✿......

وہی ہوا جس کا ڈر تھا' بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے حمیدہ کی ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں' شام ڈھلے تک شہر کی تمام ٹرانسپورٹ بند ہوگئی تھی۔ ویگنیں برائے نام آرہی تھیں جو آرہی تھیں' ان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی' نہ جانے کتنا وقت بیت گیا اور بالآخر ایک ایک کرکے بس اسٹاپ پر کھڑے افراد کم ہونے لگے۔ کسی کو متبادل روٹ مل گیا' کسی نے رکشہ ٹیکسی پکڑلی گویا سب کو ایک ایک کرکے منزل کا نشان مل گیا اور وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہی' ایسے ہی لحات میں حمیدہ کی آزردگی بڑھ

جاتی تھی‘ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے‘ ایک معقول آمدنی کے باوجود اس کی جیب بھی رکشہ ٹیکسی کی اجازت نہ دیتی تھی۔ گھر کے اخراجات ہی اتنے تھے‘ اس پر شاہ خرچیاں‘ بے نیازیاں۔ صبح کی بدمزگی کے سبب انہیں رتی بھر امید نہ تھی مگر سعد بن مصطفیٰ کی مرسڈیز بروقت ان کے سامنے آ رکی تھی۔

”زہے نصیب......“ سعد بن مصطفیٰ نے گندمی رنگت پر خوب اٹھتے سیاہ ملبوس کو دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی پر کلف دار سرخ دوپٹا سر پر جمائے حمیدہ بڑی مقدس و باوقار لگ رہی تھی۔ حمیدہ نے ادھر ادھر کے لوگوں کی سعد بن مصطفیٰ پر نظر پڑتے ہی کھسر پھسر سے آنکھیں چرائی تھیں‘ کبھی کبھی دل تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دینے کا متقاضی ہوتا ہے۔

”جی نہیں‘ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔“ حمیدہ نے کھلے ہوئے فرنٹ ڈور کو نظر انداز کردیا کہ دل ابھی صبح کی کلفت کو بھول نہ پایا تھا۔ ”آپ بڑے لوگ ہیں۔“

”کبھی کبھی انسان مجبور بھی ہوتا ہے۔“ ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ بنا کچھ کہے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”کچھ مجبوریاں لائق بیان بھی نہیں ہوتیں اور ہاں چھوٹا یا بڑا انسان صرف اپنے کردار سے ہوتا ہے۔“ وہ مسکرا اٹھے۔

”جانے دیجیے...... یہ باتیں اب صرف کتابی باتیں بن کر رہ گئی ہیں۔ لوگ سیرت و کردار کے معنی بھول گئے ہیں۔“

”مگر جو لوگ سیرت یا کردار کی خامیاں بھگتتے ہیں‘ ان پر ان چیزوں کی اہمیت و معانی خوب آشکار ہوتے ہیں۔“ ایک ان کہا سا دکھ ان کے لہجے میں بول اٹھا۔ انہوں نے حمیدہ تو کیا‘ کبھی کسی پر اپنی تلخ و کربیہ زندگی کے آزار نہ کھولے تھے مگر ان کے اندر جو خلا تھا‘ وہ اس لڑکی سے مل کر سوا ہوگیا تھا۔

”ایک بات کہوں‘ وہ شخص بہت لکی ہوگا جو تم جیسی لڑکی کا ساتھ پائے گا۔“

”ہاہ......“ حمیدہ استہزائیہ ہنسی۔ ”اتنا آسان ہوتا تو اب تک مل نہ چکا ہوتا بھلا کون آتا ہے ٹوٹے گھر کی دیواریں ناپنے۔“ وہ ہنس کر بات اڑا گئی۔ سعد بن مصطفیٰ بھی طرح دے گئے۔

”تو پھر چلیں......؟“

”جی بالکل۔“

”لیکن کہاں؟“

”گھر اور کہاں......“

”تم نے لنچ کیا؟“ حمیدہ کی گردن خود بخود نفی میں ہل گئی۔

لنچ کے نام پر وہ کچھ ہلکا پھلکا کھالیا کرتی۔ بازاری لنچ کے ریٹ کچھ کم نہ تھے اور صبح میں اس کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا کہ وہ لنچ کے لیے کچھ تیار کرتی۔

”تو پھر پہلے کسی اچھی سی جگہ پر کچھ کھالیتے ہیں...... تمہارا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے تم کہوگی تو گھر تک چھوڑ دوں گا۔“

”میرا گھر......“ وہ مخمصے میں پڑگئی‘ وہ محلہ ان کے شایان شان کہاں تھا‘ ابا تو باحیثیت لوگوں سے بڑھ چڑھ کے ملتے تھے لیکن اماں کے ہاتھ ایک نیا شوشا آجاتا۔ وہ جانچ گئے تھے۔ سو سہولت سے بات بدل کر اس کی جاب کے متعلق پوچھنے لگے۔

”جاب تو بہت اچھی ہے مگر میرے مسائل کے سامنے تنخواہ کم ہے...... خود میری اپنی تو باری ہی نہیں آتی‘ کیسا المیہ ہے ناں۔ انسان محنت کرکے بھی اپنی اجرت پر دسترس نہ رکھتا ہو۔“ اور اتنا تو وہ بھی جان گئے تھے کہ حمیدہ اپنے گھر کو سپورٹ کرتی ہے مگر کیوں اس طرح کے سوال عزت نفس پر حملہ کرتے تھے اور جہاں انا دامن گیر ہو وہاں پردہ پوشی کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ بلاشبہ اس جیسی قربانی دینے والی لڑکیاں عظیم ہوتی ہیں۔

”اچھا...... اگر تمہاری ساری کی ساری تنخواہ صرف تمہاری ہو تو‘ تم کیا کیا کروگی؟“ انہوں نے محض اس کا موڈ بدلنے کو پوچھا تو حمیدہ سوچ میں پڑگئی پھر پُرجوش

نظر آنے لگی۔

''میں ایک کار خریدوں گی تاکہ روز روز یہ بسوں کے دھکے نہ کھانے پڑیں۔''

''اچھا......اور......؟''

''اور ایک چھوٹا مگر خوب صورت' تمام سہولیات سے آراستہ فلیٹ میرا خواب ہے۔'' سعد بن مصطفیٰ بے اختیار ہنس دیے۔

''لڑکیاں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔ معصوم اور خواہشوں کی اسیر۔'' ان کا بس چلتا تو اس معصوم وشفاف لڑکی کا ہر آزار اپنی مٹھی میں مقید کر لیتے۔ اس کی تمام خواہشات کو پلک جھپکتے میں پورا کر دیتے اور نہایت خاموشی سے اسے اپنے نام کر کے اپنی ذات کا حصہ بنا لیتے مگر ان کی مقید زندگی کے آزار انہیں کب اجازت دیتے تھے۔ وہ بے نام سے رنج کی کیفیت میں ڈوبنے لگے۔ تب حمیدہ نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا وہ جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھے تھے۔ مرسڈیز دھیمی رفتار سے چلتی ایک اوسط درجے کے ریسٹورینٹ کے سامنے رک گئی تھی۔

''میں خود...... لنچ سے پرہیز کرتا ہوں' بازاری چیزیں مجھے پسند ہی نہیں ہیں۔''

''جب انسان کے ہاتھ میں سارے گھر کی باگ ڈور ہو تو وہ اپنے آپ تک کو ہر چیز سے پرہیزی کر لیتا ہے۔''

''جو لوگ دوسروں کے لیے اپنا آپ گم کر دیتے ہیں بے شک عظیم و باحوصلہ ہوتے ہیں مگر اندر سے کتنے تنہا ہوتے ہیں' یہ مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔'' وہ نہ نہ کرتے بھی کچھ کہہ جاتے تو حمیدہ الجھ کر رہ جاتی۔

''اس بظاہر پرسکون بندے کے اندر...... اتنا سناٹا وتنہائی آخر کیوں ہے؟'' ایک سوالیہ نشان اس کا منہ چڑاتا رہ جاتا تھا۔

...... ✿ ...... ✿ ......

کبھی کبھی ہمیں وہ مل جاتا ہے
جو ہم سے نہیں ملتا......
وہ جو ہمارا ہوتا ہے......
ہمارے لیے نہیں ہوتا......
گھر میں ہوتا ہے......
دل میں نہیں ہوتا......
آدمی دن گنتا ہے......
دھڑکنیں نہیں گنتا......
گھر سے باہر نکلتا ہے...... تو آنکھیں بند کر لیتا ہے
گھر میں آتا ہے
تو دل بند کر لیتا ہے

کبھی کبھی انسان کسی مقصد کو لے کر سفر کرتا ہے اور بعض اوقات بہت کچھ خود بخود ہو جاتا ہے کچھ ایسا جو وہ کرتا نہیں' بس ہو جاتا ہے...... کچھ لوگوں سے تعلق بڑا بے نام سا ہوتا ہے' آہستہ آہستہ انسان کے اندر پلتا ہے' ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے مگر رہتا نادیدہ ہے جو بس محسوس ہوتا ہے' نظر نہیں آتا' حمیدہ سے تعلق بھی ایسا ہی ایک بے نام سا جذبہ تھا جو کیا نہیں گیا تھا بس ہو گیا تھا...... ان کی اجاڑ' ویران زندگی میں محبت کا روزن حمیدہ کے وجود سے کھلا تھا تو اب جبکہ وہ محبت کے معنی بھی بھولنے لگے تھے...... خود کو از خود ہر سکھ کے احساس سے دستبردار کر لیا تھا' حمیدہ ان کی زندگی میں کسی خوشگوار جھونکے کی طرح آئی تھی۔ شاید وہ کبھی بھی اس بابت نہ سوچتے۔

اگر وہ دل میں اتر جانے والی' معصوم ودلکش لڑکی کی' سچی کھری اور بے لوث محبت کے اسیر نہ ہو جاتے' اس معصوم سی لڑکی کی بے ریا محبت' ہر پل انہیں اپنے ساتھ سفر کرتی محسوس ہونے لگی تھی اور وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو بالکل ایسا ہی سعد بن مصطفیٰ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس روز نبیل نے ان کے ساتھ حمیدہ کو دیکھ لیا تھا اور گھر پہنچ کر وہ غصے میں بل کھاتا ہوا ٹہلتا رہا۔ ایک دو بار سعد بن مصطفیٰ کے موبائل پر کال کی تو وہ انگیج تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ ان دنوں شازمہ آئی ہوئی تھی۔ نبیل اس پر چڑھ دوڑا۔

''تم جو پاپا کی حمایت وفکر میں ہلکان رہتی ہو کبھی آنکھیں کھول کر ان کے کرتوت دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کیا گل کھلاتے پھرتے ہیں۔''

''شٹ اپ زبان پر قابو رکھو...... باپ ہیں وہ ہمارے۔'' شازمہ بھڑک اٹھی۔

''تم اس عیاش' بے کردار انسان کو باپ سمجھتی ہو؟ جسے اپنی جوان اولاد کا ذرا خیال نہیں۔ ماما ٹھیک کہتی ہیں وہ کردار کے کچے اور فراڈ ہیں۔ میں نے خود آج ایک لڑکی کے ساتھ انہیں دیکھا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ وہ کوئی کلائنٹ یا ماڈل بھی ہوسکتی ہے' ان کی فیلڈ ہی ایسی ہے' نہ بھولو کہ ماما کی بیماری اور نااہلی کے سبب سارے گھر کا بار اور بچوں کی پرورش کا ذمہ انہوں نے تنہا اٹھا رکھا ہے۔''

''اور ماما کی اسی نااہلی کی کمی وہ دوسری عورتوں سے پوری کرتے ہیں' تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے' وہ ماما کا ہے۔''

''ان پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو' تم نے جو راہ اختیار کر رکھی ہیں کیا وہ ٹھیک ہیں؟ اب تک تمہیں ان کا بازو بن جانا چاہیے تھا' اکلوتے بیٹے ہو تم......''

''میرے معاملات میں دخل اندازی مت کرو۔'' وہ تلملایا۔

''چہ خوب اور تم جو مرضی آئے کہتے اور کرتے پھرو؟'' شازمہ اور نبیل کی اس ہی بحث کے دوران سعد بن مصطفیٰ لوٹ آئے تب نبیل نے طنز و تمسخر کے ہمراہ کہا۔

''لو آ گئے...... اب پوچھو ان سے یہ کہاں سے آرہے ہیں؟'' سعد بن مصطفیٰ ٹھٹکے۔

''شاید تمہیں تو یہ بتا ہی دیں گے کہ وہ لڑکی کون تھی جس کے ہمراہ یہ گل چھرے اڑا رہے تھے۔'' شازمہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا مگر وہ تلخی سے نبیل سے مخاطب ہوئے۔

''اپنی حد دو مت بھولا کرو' میں تمہارا جواب دہ نہیں ہوں سمجھے۔''

''اوہ...... تو کس کو جواب دہ ہیں آپ' ماما کو؟ میں سارا معاملہ انہیں بتا دیتا ہوں۔'' نرگس نے اپنے دماغ کے تمام شکوک وشبہات نبیل کے اندر انڈیل دیے تھے۔ نرگس بھی شور سن کر کمرے سے نکل آئی تھیں۔

''بلاوجہ بات کو طول مت دو۔''

''آج ماما کی جو حالت ہے' اس کے ذمہ دار آپ ہیں' آپ نے ساری زندگی انہیں ٹارچر دے دے کر ذہنی مریضہ بنادیا اور اب جوان بچوں کا لحاظ بھی نہیں رہا۔ کھلے عام گل چھرے اڑائے جارہے ہیں۔''

''نبیل...... خاموش رہو اور دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' اور یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ اسی وقت ان کا موبائل بج اٹھا۔ حمیدہ اپنے خیریت سے گھر پہنچ جانے کی اطلاع انہیں دے رہی تھی' انہوں نے مختصراً بات کر کے آف کردیا مگر نرگس آپے سے باہر ہوگئیں۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی تھی۔

''تم نمک حرام ہو' دھوکے باز ہو...... بیوی بیمار ہے تو تم دوسری عورتوں سے مراسم رکھتے ہو۔'' شازمہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے نظریں چرانے لگے۔

''بیٹا...... شی از جسٹ اے کلائنٹ۔'' ان کا لہجہ کمزور تھا۔

''بکواس کرتے ہو' جھوٹ بولتے ہو تم...... تمہاری زندگی ان ہی رنگینیوں میں گزری ہے' میری آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو تم......'' نرگس کی دیوانگی اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ شازمہ نے بے چارگی سے کہا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو پلیز پروف اٹ۔''

''یس' ابھی ہمارے سامنے بات کریں اور ثابت کریں کہ شی از جسٹ اے کلائنٹ۔'' نبیل آگے بڑھا۔

''یہ دھوکے باز...... فریبی...... ٹھگ...... دو ٹکے کی

اوقات تھی اس کی.... میری.... میری وجہ سے آج یہ ایک اچھے عہدے پر بیٹھا ہے اور اس کی نمک حرامی دیکھو یہ مجھ سے دغا کرتا ہے۔'' نرگس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اس نے لاؤنج کی ہر چیز تہس نہس کردی تھی۔ اس کی کیفیت ایک بار پھر ہذیانی ہوگئی تھی اور اس طرح کے دورے اکثر خطرناک بھی ثابت ہوجاتے تھے وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوکر آئی سی یو تک پہنچ جاتی تھی۔

''پاپا.... پلیز....'' شازمہ نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔ سعد بن مصطفیٰ نے موبائل نکال کر ایک سرد آہ بھری اور حمیدہ کا نمبر پش کردیا۔ بیل جارہی تھی۔

⁂

حمیدہ دفتر سے لوٹ کر سب سے پہلے مغرب کی ادائیگی کیا کرتی تھی۔ آج کچھ تاخیر ہوگئی تھی سعد بن مصطفیٰ نے انہیں گھر سے کچھ دور ڈراپ کیا تھا انہیں رکشہ کرنا پڑا تھا مگر ان ہی کی تاکید پر انہوں نے بخیریت گھر پہنچنے کی اطلاع دی تھی مگر یہ حمیدہ بھی نہ جانتی تھی کہ مصیبت کبھی کہہ کر نہیں آتی۔ اس نے اسکرین پر نام دیکھا تو بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ در آئی دوسری جانب سعد بن مصطفیٰ تھے۔

''زہے نصیب۔'' انہوں نے شوخی سے کہا مگر دوسری جانب سے ایک سرد آواز نے ان کی سماعت کو متاثر کیا۔

''میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ آفیشل بات صرف آفس آورز میں ہی کیا کریں۔''

''جی....! آفیشل بات....؟'' حمیدہ دوسری جانب کے حالات سے قطعی لاعلم تھیں اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سعد بن مصطفیٰ کا لہجہ بڑا اجنبی سا تھا۔

''آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آٹھ بجے کے بعد میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوتا ہوں تب مجھے ڈسٹرب کرنے سے گریز کیا کریں۔''

''اوہ....'' کچھ سمجھ کر منوں وزنی بوجھ حمیدہ کے دل پر آپڑا ان کی فیملی ان کی زندگی کا حصہ تھی جس میں اس کی گنجائش شاید اتنی ہی تھی کہ وہ اس کی حیثیت ثابت کرنے کے لیے ان سے لاتعلقی پر اتر آتے۔

''سچ کہا آپ نے.... بڑے لوگوں سے تو پہلے وقت لینا چاہیے۔'' حمیدہ کے لہجے میں طنز وملامت کی آمیزش تھی سعد بن مصطفیٰ کے دل کو کچھ ہوا مگر خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''محترمہ.... میرا وقت بھی قیمتی ہوتا ہے آئندہ احتیاط کریں۔'' حمیدہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں وہ شخص جو نظر کے سامنے ہوتا تو جیسے ساری دنیا اس کے لہجے میں سما جاتی تھی اور جب دور ہوتا تو لگتا کہ اسے چھو لینے کی خواہش میں وہ اپنا آپ گم کردیں گی۔ آج اس کا یہ اجنبی روپ انہیں بہت کچھ سمجھا رہا تھا سچ ہے کسی کو اپنا سمجھ لینے سے کوئی اپنا ہو نہیں جاتا کیا ہوتی ہے بھلا اس جیسی عام سی لڑکیوں کی حیثیت اور اوقات محبت کا منتر پھونک کر کچھ وقت اچھا گزار لیا جائے اور بات ہو دوسروں سے متعارف کروانے کی تو سہل طریقے سے جھٹلا دیا جائے۔ اماں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں مجھ میں خوبی ہی کیا ہے آخر...... انہوں نے کال ڈراپ کردی تھی۔ شازمہ نے ایک ملامت بھری نظر نبیل پر ڈالی وہ لب بھینچ کر گھر سے نکل گیا۔

سعد بن مصطفیٰ نے سیل آف کرکے جیب میں رکھا اور بنا کچھ کہے گھر سے نکل آئے اور بلاوجہ سڑکیں ناپنے لگے تھے۔ ان کے دل پر ایک قیامت سی گزر رہی تھی۔ کتنا ٹوٹا ہوا لہجہ تھا حمیدہ کا کہ ان کا دل کسی دکھ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ وہ دلکش اور شفاف سی لڑکی انہیں دل سے عزیز تھی۔ کبھی کبھی ان کا دل چاہتا اس سادہ لوح لڑکی کا ہاتھ تھام کر اسے کہیں دور لے جائیں۔ بلاشبہ اس جیسی لڑکیاں انمول ہوتی ہیں۔ سچی کھری اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی۔ اس لڑکی کی محبت نے انہیں بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ احساس محرومی کئی گنا بڑھ کر کسک دینے لگا تھا۔ جانے کیوں ماضی بار بار ان کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ وہ جتنا دھیان بٹاتے وہ اتنا ہی

زود آور ہوتا اور آج ایک بار پھر ان کے زخم جاگ اٹھے تھے۔ کچھ کھو جانے کا احساس سو گنا بڑھ کر ان کے اندر کو روندے چلا جارہا تھا۔ وہ سیاہ کولتار کی سڑک پر چلتے دور اور دور نکلتے چلے گئے تھے۔

٭٭٭

یہ ان دنوں کی بات تھی' جب سعد بن مصطفیٰ کی آنکھوں میں مستقبل کے ڈھیروں ڈھیر خواب اور ہاتھ میں ہزار جدوجہد کے بعد حاصل کی گئی ایم بی اے کی ڈگری تھی۔ ماں انہیں افسر بنانے کے خواب دیکھتی تھیں' سعد بن مصطفیٰ اچھی طرح جانتے تھے کہ مناسب نوکری کا حصول مشکل ہے' اس کے باوجود لوگ تعلیم سے انحراف نہیں کررہے تھے۔ وہ گاؤں سے شہر آئے تو آنکھوں میں ہزاروں خواب تھے' آسمان کی بلندیوں کو چھو لینے کے خواب مگر کچھ خوابوں کی قیمت بہت بھاری چکانی پڑتی ہے یہ ایک طویل جدوجہد سے بھرپور عمر گزار کر ہی انہیں معلوم ہوا تھا۔

بہت سے لوگ زندگی گزارتے ہیں اور کچھ لوگوں کو زندگی برتی ہے' ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب' تقدیر نے ان سے لیا تھا' مانو زندگی نے انہیں نچوڑ لیا تھا کہ اب وہ ہار کر تھکنے لگے تھے۔ انہوں نے بھی کئی امیدوں سے یہاں وہاں کئی جگہ نوکری کی درخواست دی تھی مگر ناکامی ان کا نصیب بنی رہی اور پھر کے کے انٹر پرائزز تک ان کی قسمت ہی انہیں لے کر گئی تھی۔

کے کے انٹر پرائزز کے مالک خالد خٹک سے سرِراہ ملاقات ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ سڑک کے درمیان ان کی گاڑی سے ٹکر پر وہ انہیں ہسپتال لے گئے تھے۔ یہ ان کی عنایت تھی وگرنہ لوگ بے حسی سے گزر جاتے ہیں اور خالد خٹک وہ ایک نظر میں جانچ گئے کہ لڑکا شریف مگر ضرورت مند ہے سو ڈھیروں تسلیوں' امیدوں کے ساتھ اپنا کارڈ دے گئے تھے۔ اس وقت سعد بن مصطفیٰ کے ارادے بلند' عزم جواں اور دل میں وہ سب کچھ پالینے کی خواہش تھی جو آج انہیں میسر تھا' ان کی بے روزگاری پر خالد خٹک نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔

''تمہیں مراعات ساری کمپنی کی ملیں گی مگر ڈیوٹی ڈرائیور کی دینی ہوگی.....'' یہ ایک ادنیٰ سا امتحان تھا اور ان دنوں سعد بن مصطفیٰ کے لیے ڈرائیوری بھی غنیمت تھی۔ ایک وقت گزر چکا تھا بے روزگاری کے عذاب سہتے ہوئے۔ خالد خٹک کے بنگلے پر ان کی اکلوتی بیٹی کے ڈرائیوری بہت جلد انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ نرگس بگڑی ہوئی' ضدی اور خودسر ہی نہیں' ذہنی ونفسیاتی الجھاؤ کا شکار لڑکی ہے' کبھی بلاوجہ رونے لگتی' کبھی ہنستی تو ہنستی ہی رہتی' خالد خٹک صاحب کہتے کہ ماں کی کمی کے سبب احساس محرومی کا شکار ہے مگر کچھ عرصہ بعد انہیں معلوم ہوا کہ معاملہ اس سے سوا ہے' نرگس ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہوجاتی' توڑ پھوڑ کرتی' کبھی غش کھا جاتی کہ وہ تنہا ہوتے تو اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا مگر کچھ عرصہ میں خالد خٹک کا اعتماد تو جیت ہی چکے تھے۔ انہوں نے بہت جلد انہیں کمپنی میں اچھے عہدے پر تقرری دے دی تو مانو سعد بن مصطفیٰ کے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی مگر خالد خٹک کی سوچ کسی اور نہج پر سفر کررہی تھی۔ وہ بھول گئے کہ بنا منافع انویسٹ کون کرتا ہے۔ خالد خٹک بھی ایک کاروباری آدمی تھے اپنا خام مال چلانے کو انہیں ترقی پر ترقی دیتے لے گئے' ان کی چمکتی دمکتی دولت مگر وہ طمع پرست نہیں مجبور تھے۔ ان کی زندگی بے بھروسا تھی' دنیا کی نظریں ان کی بے بہا دولت پر تھیں' اسی کی بدولت نرگس کو کوئی بھی اپنانے کو تیار تھا مگر وہ جانتے تھے کہ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی' نرگس کا ٹھکانہ پاگل خانہ اور ان کی بے انتہا دولت پر قابض ہونے کے لیے سارے رشتہ دار منتظر تھے۔

سعد بن مصطفیٰ سچا' کھرا اور مخلص انسان تھے۔ اپنی مجبوریوں کے طفیل نرگس کو جھیل جاتے سو خالد خٹک ایک روز ان کے قدموں میں گر پڑے' نرگس سے نکاح کے عوض وہ تمام جائیداد واملاک میں برابری کی بنیاد پر

تمام حقوق دینے کو تیار تھے مگر ہر معاملہ میں نرگس کا شیئر تھا۔ شاید وہ یہ سودا کبھی نہ کرتے مگر خالد خٹک کی مجبوری، ان کی مجبوری سے سوا تھی۔ وہ سعد بن مصطفیٰ کے محسن تھے وہ ان کی بات رد نہ کر سکے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت بدلتا ہے تو انسانی خواہشات و ترجیحات بھی بدل جاتی ہیں۔ انہوں نے خود اپنے آپ کو اپنی ذات سے حذف کرکے ایک عمر گزاری تھی، اپنی زندگی، اپنی خواہشات، اپنے خواب سب وار کردیے تھے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا نرگس نے اولاد کے ذریعے انہیں باندھ لیا تھا۔ وہ اور مجبور ہوتے چلے گئے تھے۔ آج انہیں سب کچھ میسر تھا مگر ان کے اندر جو خلا باقی تھا وہ اب پھیلتا ہی چلا گیا تھا۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی۔۔۔!
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا۔۔۔!
گفتگو ان سے روز ہوتی ہے۔۔۔!
مدتوں سامنا نہیں ہوتا۔۔۔!
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں!
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا!
رات کا انتظار کون کرے!
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا!

حمیدہ کا سارا اتوار گھر کے بکھیڑے سمیٹنے کی نذر ہوجاتا تھا۔ اب بھی ایک ساتھ کئی کام نمٹاتے وہ ہلکان تھی۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کے ساتھ، صحن میں رکھی مشین میں کپڑے گھوم رہے تھے۔ کچن سے ہانڈی پکنے کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا اضطراب بڑھ رہا تھا، دل کو ایک عجیب سی یاسیت نے گھیر رکھا تھا۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو، ایک بے نام سا تعلق جو پھیل کر ساری زندگی پر قابض ہوگیا تھا۔ ایک ہیولہ جو آس پاس منڈلاتا رہتا، سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کا جیتا جاگتا تصور، وہ اس تصور کو جھٹکنے کی کوشش کرتی، وہ مجسم ہوکر سامنے آن کھڑا ہوتا، محبت کا ایک لو دیتا سا احساس، جس نے وجود میں ایک نئی روح پھونک دی تھی، محض کچھ دنوں پر مختص اس مہکتے لمحے احساس نے اسیر کرلیا تھا۔ وہ اس احساس کو پرے جھٹکنے کی کوشش کرتی، وہ اور شدت سے ان کے دل و روح کو جکڑ جاتا، سب کچھ بھلا کر ان چند دنوں کو کتاب زیست کے صفحے سے مٹا دینے پر آمادہ ہوتیں تو جیسے دل کی نازک رگیں انہیں کھینچتی ہوئی سی محسوس ہوتیں۔ کیا اتنا ہی آسان ہوتا ہے محبت کے دل خوش کن احساس سے دامن چھڑا لینا؟ سعد بن مصطفیٰ ہمدانی ہر بار اپنی ان کی مجبوریوں کا حوالہ دیتے، وہ مجبوریاں جو کبھی تھیں، حمیدہ کے لیے ان کا یہ گریز کچھ کم اذیت ناک نہ تھا، ایک بار دو بار۔۔۔ کئی بار انہوں نے اسی سرد مہری سے کام لیتے ہوئے اس کی عزت نفس کو روندا تھا اور اب اس روز کا ان کا وہ سرد مہر و لاتعلق انداز، بے گانگی میں بجھے لفظ جیسے حمیدہ سے ان کی رتی بھر بھی شناسائی نہ ہو۔۔۔ نجانے وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہے تھے، ہاں مگر اس کے نازک احساسات کو ٹھیس لگی تھی، وہ بکھر کر رہ گئی تھی اور حمیدہ نے ٹھان لی تھی کہ اب گریز کی راہ اپنانی ہے مگر ان کے اندر سسکتا، محبت کا ایک خوب صورت سا احساس جانے کس لیے منتظر سا تھا، وہ ہر آہٹ پر چونکتی، ہر کال، ہر ایس ایم ایس پر دل دھڑک اٹھتا، یوں جیسے وہ از خود بڑھ کر ان دنوں کے کرب کو سمیٹ لیں، معذرت، تلافی، وضاحت مگر ایک انتظار سا انتظار تھا۔

اب بھی دھلے کپڑے صحن میں پھیلاتے ہوئے سعد بن مصطفیٰ کے نام مختص کی گئی ایس ایم ایس ٹیون بج اٹھی، تو جیسے اس کے اندر زندگی سی دوڑ گئی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حمیدہ تیزی سے لپک کر گئی اور سیل اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک عام سا مبنی میسج تھا۔ بیٹی کی امتحان میں شاندار کامیابی، جانے کتنے دن بعد ایک ہلکا سا زندگی کی نوید دیتا اشارہ، اس کے دل پر یک دم ڈھیروں ڈھیر بوجھ آن پڑا تھا۔

”ایک دن۔۔۔ نہ دو دن۔۔۔ پورے اٹھارہ دن

ہوگئے۔'' حمیدہ نے کرب واذیت سے آنکھیں موند لیں اوران اٹھارہ دنوں کا ایک ایک پل جیسے پل صراط تھا' نہ کوئی کال' نہ ایس ایم ایس' نہ جانے میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ تم کہاں کہاں بٹے ہوئے ہو۔

انہیں اپنی یاسیت سوا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

نہ جانے دل کی بستی میں
بسے ہیں لوگ کیوں ایسے
جو چپ رہ کر بھی
ہمارا سکوں...... برباد کرتے ہیں!!

''پاگل ہو تم؟'' ثمینہ سن کر ہنسی۔ ''اتنی معمولی سی بات کو ایشو بنا کر تم اتنے دن سے رابطہ منقطع کیے ہوئے ہو؟''

''یہ معمولی بات ہے...... کاش تم سنتیں کہ اس وقت ان کے لہجے' انداز اور لفظوں میں کتنی بے اعتنائی' و بے گانگی تھی' یوں جیسے میرے اوران کے درمیان کبھی ایک پل کی بھی شناسائی نہ رہی ہو' محبت تو دور کی بات۔''

''مائی ڈیئر...... شادی شدہ آدمی گھر میں بندھا ہوا ہوتا ہے' اب وہ فیملی کے سامنے تو تم سے عشق نہیں بگھار سکتا' یار ہر شریف آدمی بیوی سے ڈرتا ہے۔'' وہ کچھ کچھ قائل اور لاجواب سی نظر آنے لگی۔

ایک لڑکی روز ایس ایم ایس کرنے والی' اتنے دن سے غائب ہے اور انہوں نے پلٹ کر اتنا بھی نہ پوچھا کہ وہ ہے یا گزر گئی؟

''اسی لیے کہتے ہیں دکھ انسان نہیں دیتے' دکھ تو انسان سے وابستہ توقعات دیا کرتی ہیں۔ تم نے ایسی امید ہی کیوں رکھی؟''

''کہاں تک اس سسکتی مصلحتوں میں جکڑی محبت کا بوجھ اٹھاؤں مگر ان سے دوری کا سوچوں تو لگتا ہے دل کی رگیں کھنچ رہی ہیں۔''

''ہوتا ہے کبھی کبھی زندگی میں کچھ ایسا مل جاتا ہے' جسے نہ ہم چھوڑ سکتے ہیں' نہ اپنا سکتے ہیں۔''

''محبت میرے نصیب میں نہیں یا شاید میں محبت کے قابل ہی نہیں' سچ کہوں تو میں نے خود انہیں بھلانے کی کوشش کی ہے مگر ہو نہیں پایا' لگتا ہے جیسے خود کو اذیت دی ہو۔''

''کیوں خود کو اذیت دیتی ہو جب جانتی ہو ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں' سنو دوست کو کبھی آزمانا نہیں چاہیے' ان کے لیے نہیں تو خود کے لیے' ارے اتنا تو تمہارا حق بنتا ہے' کال کرو انہیں۔''

''کال کروں تو ریسیو نہیں ہوتی...... ایس ایم ایس کا ریپلائی نہیں آتا۔ آج فلاں بیٹی کے اسکول میں پیرنٹس ڈے' آج بیٹے کو ہسپتال لے کے جانا ہے۔ مصروفیت...... مصروفیت...... مصروفیت بھی کیا خوب بہانہ ہے۔''

''جانے بھی دو وہ شادی شدہ مرد ہے' اس کی اپنی ایک لائف ہوگی' شادی شدہ مرد کئی جگہ بٹا ہوا ہوتا ہے اولاد جوان ہوجائے تو اور کمزور ہوجاتا ہے۔'' حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔

خود حمیدہ کو بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا' وہ سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کو اکثر نہایت کمزور' بے بس و مجبور پاتی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی اکثر بہت کچھ کہہ جاتے مگر ان کی شخصیت ایک بند کتاب جیسی تھی۔ انہوں نے بھی کوئی کلیہ' کوئی اشارہ دیا ہوتا تو شاید وہ اس کے اندر درج مضمون جانچ پاتیں مگر انا اور ان کا گریز انہیں حمیدہ سے کہیں دور لے جا کھڑا کردیا کرتا تھا۔

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں
پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا......!
کون سے دھاگے کو
جدا کس سے کریں؟

چلو اب مل کے ہجر و حبس کا موسم بدلتے ہیں
ذرا سا تم بدل جاؤ...... ذرا سا ہم بدلتے ہیں

بس اتنا یاد رکھ لینا کہ ویسے کم بدلتے ہیں
مگر جب ہم بدلتے ہیں تو پھر ہم بدلتے ہیں
اگر تم یہ سمجھتے ہو' تمہارا غم زیادہ ہے......!
تو اب کی بار آپس میں ہم اپنے غم بدلتے ہیں!!

اور یہ ثمینہ کی باتوں کا کمال تھا کہ اتنے روز سے حمیدہ کے ذہن ودل پر چھایا غبار چھٹنے لگا تھا اور وہ جو کہتے ہیں دل کو دل سے راہ تو وہ سعد بن' مصطفیٰ سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس شام خود ان کا فون آ گیا۔

''زہے نصیب آخر کار بڑے لوگوں کو غریبوں کی یاد آ ہی گئی۔'' وہ طنز کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''میں اپنے آپ کو تو بھول سکتا ہوں مگر آپ کو نہیں۔'' ان کا ایسا ہی کبھی کبھی کا سرسراتا مگر دل کو چھوتا سا اقرار اسے جیسے اٹھا کر کھڑا کر دیا کرتا تھا۔ ''تم خفا تھیں اور تمہیں منانا ضروری تھا۔''

''اچھا...... چلیں...... آپ کو اتنا تو احساس ہے کہ میں خفا ہوں۔''

''اتنے دنوں سے نہ ایس ایم ایس نہ کال سچ عادی سا ہو گیا ہوں تمہارے پیغامات کا۔''

''کال کس وقت کروں...... آفس میں آپ بزی ہوتے ہیں' اور گھر میں پابند...... جب فون آپ کی میز پر ہے اور آپ نہیں کر سکتے تو میں تو پھر بھی ملازم بندی ہوں۔''

''اگر میں کہوں کہ میری ان کہی مجبوریوں کے طفیل مجھے معاف کر دو تو......!''

''سچ بتاؤں...... تو اس بار آپ کو بھولنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب ہو نہیں پائی...... دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے' آپ سے دوری کا سوچوں تو جیسے دل کو کوئی مٹھی میں لے کر جکڑ لیتا ہے۔'' حمیدہ ہار سی گئی تھی۔

''گریز کی راہ اتنی آسان بھی نہیں ہوتی' مجھے اندازہ ہے۔''

''ہاں...... یہ عرصہ میں نے جیسے کانٹوں پر گزارا ہے۔ یوں جیسے اپنے آپ پر ظلم کیا ہو۔''

''مجھے معلوم ہے...... معذرت انسلٹ کا مداوا ہو ہی نہیں سکتا...... یوں سمجھ لو میری کچھ مجبوریاں مجھے خود سے بھی دور کر دیتی ہیں پھر تم تو تم ہو۔''

''مگر یہ میرے لیے انسلٹنگ ہے' اپنی انہی بے اعتنائیوں کے سبب ایک روز سچ مچ آپ مجھے کھو دیں گے۔''

''یوں نہ کہو...... تمہاری محبت سے تو میری زندگی میں اجالا ہے...... تمہیں کھو دیا تو پھر میرے پاس کیا بچے گا۔''

''جانے بھی دیجیے...... کسی کو اپنا سمجھ لینے سے کوئی اپنا ہو نہیں جاتا' بات تو تب ہے جب معاملہ دو طرفہ ہو۔''

''اور اگر میں کہوں کہ زندگی میں کبھی کچھ ایسا بھی مل جاتا ہے' جسے ہم چھوڑ سکتے ہیں نہ اپنا سکتے ہیں۔ میں تم سے رابطے میں نہ رہوں' بات چیت نہ ہو مگر تم میرے اندر سے نکل جاؤ یہ نہیں ہو سکتا۔''

''اچھی بات ہے...... ذرا آپ کو بھی تو پتا لگے کہ انتظار کیسا ہوتا ہے؟'' حمیدہ کو ثمینہ کی بات یاد آئی' شادی شدہ مرد کئی جگہ بٹا ہوا ہوتا ہے' اولاد منہ کو آ جائے تو مرد کمزور ہو جاتا ہے' اگلے ہی پل اس کے دل نے سعد بن مصطفیٰ ہمدانی کو باعزت بری کر دیا تھا۔

''او کے پھر ملتے ہیں بریک کے بعد......''

''ضرور اتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھا نہیں...... میں انتظار کروں گا۔''

نبیل آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوا تھا اور رائمہ کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

''وہ لڑکا کون تھا جس کے ساتھ تم گل چھرے اڑا رہی تھیں۔''

''تمیز سے بات کرو...... آواز نیچی کرو اپنی۔''

''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟'' وہ پھر دھاڑا۔

لاؤنج میں اخبار پڑھتے ہوئے سعد بن مصطفیٰ نے

اخبار کو ہٹا کر متحیر نظروں سے دونوں کو دیکھا جبکہ رائمہ لاپروائی سے ناخن فائل کرتی رہی۔

''تم جانتے تو ہو اسے۔ وہ نجمی تھا' ہم اپنی اسٹڈی ڈسکس کررہے تھے۔''

''اسٹڈی ہوٹلوں یا پارکوں میں نہیں کی جاتی...... میں نے کئی بار تمہیں اس لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے' تم کیا سمجھتی ہو تم جوگل کھلاتی پھرتی ہو مجھے نہیں معلوم؟''

''تو کیا کرلو گے تم؟'' وہ دیدہ دلیری سے بولی۔

''کبھی اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھا ہے؟ تمہارا گینگ کتنے اسٹریٹ کرائمز میں انوالو ہے اور وہ عینی کتنے فخر سے کہتی پھرتی ہے کہ تم اس سے کورٹ میرج کرنے والے ہو۔'' سعد بن مصطفیٰ دم بخود رہ گئے' ان دونوں کی عمریں ہی کیا تھیں سولہ اور اٹھارہ برس اور وہ کس طرح ان کے ہاتھوں سے نکل رہے تھے۔

''شٹ اپ' تمہیں میرے معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے بھی تمہارے معاملوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' تم کالج کے بہانے آوارہ گردیاں کرو' لوگوں کو لوٹتے پھرو' پھر بھی تمہیں موٹی موٹی رقموں کی ضرورت رہتی ہے' ماما کے سیف سے پچاس ہزار تم نے اڑائے تھے اور وہ سعدیہ......''

''شٹ اپ' آئی سے شٹ اپ' اسی سعدیہ نے مجھے تمہارے نجمی سے تعلقات کے بارے میں بتایا تھا اور سن لو کہ میں خون پی جاؤں گا تم دونوں کا اگر اب وہ تمہارے ساتھ نظر آیا...... سمجھیں؟''

''ہونہہ......'' رائمہ نخوت سے سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔

سعد بن مصطفیٰ اولاد سے غافل نہیں رہے تھے مگر نرگس نے ان کی بے جا خواہشات پوری کرکے اور باپ کے خلاف کان بھر کے نا صرف انہیں بگاڑا بلکہ ان کا اولاد پر رعب بھی ختم کرکے رکھ دیا تھا۔ سعد بن مصطفیٰ کی حیثیت اس گھر میں صفر تھی۔ نرگس کو گھر کے معاملات سے لگاؤ نہ تھا سو اولاد کو بے لگام تو ہونا ہی تھا۔ جب تک شازمہ رہی گھر کا نظام کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا مگر اب تو شیرازہ ہی بکھر کررہ گیا تھا۔ سعد بن مصطفیٰ جو کچھ پل گھر میں گزارتے تھے' وہ قیامت بن جاتے۔ نرگس کی بدسلوکی و مشکوک رویے کے سبب یا پھر بگڑی ہوئی اولاد کی روش و سرکشی کی بدولت۔ نبیل کی روش اب ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ متعدد بار اپنے اثر و رسوخ کام میں لاکر اسے قانون کے شکنجے سے چھڑایا تھا وہ کئی جرائم میں ملوث تھا۔ اس کی غیر قانونی سرگرمیوں کے طفیل وہ بارہا ذلیل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی خاطر اپنی زندگی تج دی' نرگس جیسا کڑوا گھونٹ پے رکھا' نرگس کی نااہلی کی بدولت دہری ذمہ داری کا بار اٹھائے رکھا' اپنا دکھ سکون سب کچھ بھلائے رکھا۔ مانو اپنی زندگی وار دی تھی مگر اولاد کا قرب حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کی زندگی کا اپنا ایک ڈھب' ایک چلن تھا۔ نرگس دو جمع دو کی عادی' پائی پائی کا حساب لیتی ان کی خاموشی مصلحتوں' مجبوری کو سمجھتی۔ اس پر بھی وہ اپنی بیمار ذہنیت کے سبب اولاد کے کانوں میں ان کے لیے جو زہر انڈیلتی رہی تھی وہ پک کر اب جان لیوا بن گیا تھا۔ ان کی اولاد کی سرکشی ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی' وہ اپنی زندگیوں میں خود مختار تھے' ماں اگر ان پر توجہ نہیں دیتی تھی تو باپ بھی کسی گنتی میں نہ تھا۔ ایسے ہی لمحات میں انہیں اپنا وجود تنہا و بے مصرف محسوس ہوتا تھا جیسے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تہی داماں ہیں' اب بھی وہ پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

اک محبت ایسی بھی ہے
جہاں ملنا ناممکن ہے
مگر......!
بچھڑنا کوئی نہیں چاہتا ہے!

''زہے نصیب......'' ثمینہ حمیدہ کو دیکھ کر مسکرائی۔
''یہ آج چاند کہاں سے نکلا؟''

"جاب سے اتنا اعتماد تو آ گیا ہے کہ تنہا سفر کرنا سیکھ لیا ہے۔"

"واہ جناب...... اور شخصیت میں نکھار بھی آ گیا ہے۔"

"جی ہاں...... جب شخصیت کو محبت اور سراہنے کا اعتماد ملا تو......"

"تم نے ایک بار کہا تھا ناں جب کسی کی یاد تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلا دے اور اس کو کھو دینے کا احساس تمہیں تکلیف دے تو جان لو کہ تمہیں اس سے محبت ہے...... ان سے پہلی ملاقات اب بھی میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔"

"اور اس محبت کا انجام...... کبھی اس کے بارے میں بھی سوچا ہے؟ شادی شدہ آدمی سے محبت کسی اندھی مسافت سے کم نہیں ہوتی۔"

"مجھ پر اس محبت کے تمام تاریک پہلو روشن ہیں مگر کنارہ کشی...... یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے...... شاید اس محبت کا کوئی خوب صورت اختتام کہیں درج ہو۔"

"اف حمیدہ...... تم بہت خوش فہم ہو اس بے نام محبت کے لیے اتنی پرامید کیوں ہو؟"

"جس طرح انسان ایک بار جیتا...... ایک بار مرتا ہے' اسی طرح محبت بھی ایک بار کرتا ہے جو میں کر چکی ہوں' اس محبت کے حصول کا فیصلہ میں نے رب پر چھوڑ دیا ہے...... رب کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"ہاں...... مگر رب کے فیصلے ہم کیا جانیں...... محبت تو بس ایک دل کش خواب ہوتی ہے۔"

"محبت کے لیے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا' میری زندگی کی یہ پلاننگ ہی نہ تھی' اس نے مجھے ایسے انسان سے نوازا' جس کی میں اہل بھی نہ تھی' جب اس نے ان سے ملاقات کی راہ دکھائی...... محبت دل میں ڈالی ہے تو سنجوگ کی کوئی سبیل بھی ضرور رکھی ہوگی...... وہ جس طرح پتھر تلے کیڑے کو رزق فراہم کرتا ہے اسی طرح دو انسانوں کے ملن کی تدبیر بھی بنا سکتا ہے۔ یہ محبت رب کی عطا کردہ ہے' سو میں نے اس کا اختتام بھی اسی پر چھوڑ دیا ہے...... ممکن ناممکن انسان قرار دیتا ہے رب کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں...... جب اس کا کام نوازنا ہے تو میں نوازے جانے کی امید کیوں نہ رکھوں؟" ثمینہ لاجواب ہو کر چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی اور حمیدہ نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور اس کی سوچ پھر اسی نہج پر بھٹکنے لگی۔

"اسے بار بار میری جانب لوٹا کر...... وہ میرے یقین پر اپنی رضا کی مہر لگاتا رہا ہے۔ اگر وہ میرے نصیب میں ہے تو ہزار راستوں سے مجھ تک آئے گا اور اگر نہیں تو کوئی بھی وجہ سامنے آن کھڑی ہوگی...... تب میں جان جاؤں گی کہ یہی رب کی مرضی تھی۔" وہ یوں ہی وقت گزاری کو قریب پڑی سبز ڈائری اٹھا کر ٹٹولنے لگی تھی۔

"محبت سراب ہے......" ڈائری کا پہلا ورق پڑھ کر لب بھینچے اور ڈائری بند کر دی۔ چائے کے کپ سجائے آتی ثمینہ حمیدہ کی یہ حرکت دیکھ چکی تھی۔

"پڑھنا چاہتی ہو تو پڑھ لو۔" اگرچہ اسے کوئی چاہ نہ تھی مگر اس ایک جملے کی گہرائی میں اترنے کو جی چاہا تو ڈائری اپنے پرس میں رکھ لی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ شمارے میں)

www.naeyufaq.com

تمہیں چاہتے ہیں

شہناز صدیقی

"میں آپ سے نفرت کرتی ہوں...... شدید نفرت سنا آپ نے۔" وہ زور سے چلائی۔ "اور میرے خیال میں شادی سے انکار کے لیے یہ جواز کافی ہے۔" اپنی طرف سے اس نے سارا معاملہ ہی ختم کردیا تھا۔ بظاہر نفرت کی کوئی وجہ نہ تھی مگر اس کے باوجود بھی اس نے کہہ دیا اور اپنی بات پر بضد بھی رہی۔

"میں بھی تم سے شادی کے لیے مرا نہیں جارہا اور محبت تو مجھے بھی تم سے نہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ شادی ہوگی کیونکہ میں اپنی مما سے بہت محبت کرتا ہوں اور آج تک میں نے ان کی ہر خواہش کا احترام کیا ہے' یہ میری بدقسمتی ہے کہ تم میری مما کی خواہش ہو۔ آئندہ میرے ساتھ بحث کرنے سے پرہیز کرنا' مجھے عورتوں کا مردوں کے مقابل کھڑے ہوکر دوبدو جواب دینا قطعی پسند نہیں۔" اسے بھی یکلخت غصہ آ گیا۔ نئی کونپل کی طرح دل کے اندر پنپتے لطیف جذبات اس وقت کہیں دور جا سوئے پھر کس بناء پر وہ اس کی بدتمیزی برداشت کرتا' نرمی سے بات کرتا۔

"پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں' میرے ساتھ شادی کرکے آپ کبھی خوش نہیں رہ پائیں گے۔ پھپھو سے میں خود بات کروں گی۔" اس وقت وہ بے بسی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کو کوئی سمجھ نہیں پارہا تھا۔

"خبردار...... جو تم نے مما سے کسی قسم کی بھی کوئی بات کی تو......" شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے تنبیہ کرتے جیسے اسے روکنا چاہا۔

"میری مما اس شادی سے بہت خوش ہیں اور میں کسی صورت تمہیں ان کی خوشی میں خلل ڈالنے نہیں دوں گا۔ میرے پاکستان آنے سے پہلے تم کیا سوئی ہوئی تھیں؟ تب انکار کردیتیں۔ اب جب شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے تو میں تمہارے انکار کی وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔" وہ اچھا خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ الجھن ایسی تھی جو اس سے کسی صورت سلجھ نہیں پارہی تھی۔ وہ نڈھال سی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ یہی تو مشکل تھی کہ وہ اسے مر کر بھی وجہ نہیں بتاسکتی تھی۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

آمن ضیاء نے اس کے مضمحل و پژمردہ وجود کو پُرسوچ نظروں سے دیکھا اور پھر گہرا سانس ہوا کے سپرد کرتے اس کے مقابل گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔

"عنادل...... پلیز مجھے وہ وجہ بتاؤ جس کے لیے تم انکار کررہی ہو۔" عنادل کے آنسوؤں نے اس کے لب و لہجے کو خود بخود نرم بنادیا تھا۔

وہ جو سر جھکائے آنسو بہارہی تھی آہستہ سے سر اٹھا کے اس کے پریشان متفکر چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دیکھنے کا انداز انتہائی معصوم تھا آمن ضیاء نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

"آمن...... میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی...... پلیز کچھ بھی کرکے یہ شادی رکوا دیجیے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے حقیقتاً اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تو آمن کی آنکھوں سے تاسف جھلکنے لگا۔

"جب تک تم مجھے اصل وجہ نہیں بتاؤ گی میں کچھ نہیں کرسکتا' اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔" اس کے حواس چٹخنے لگے۔

"کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں' شدید نفرت؟" وہ پُرزور انداز میں ایک دفعہ پھر سے چلائی تو اس کے بے وجہ چلانے پر آمن کا غصہ ساتویں

آسمان کو چھونے لگا اور وہ جو اس کے رونے کی وجہ سے نرم ہوگیا تھا اپنے ذہن میں پنپتی مثبت سوچوں کو جھٹک کر اشتعال سے پھنکارا۔

"شادی تو تمہاری مجھ سے ہی ہوگی اب چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہے ناں شدید نفرت..... تو اب تمہاری یہی سزا ہے کہ تم اسی نام نہاد نفرت کے ساتھ مجھ سے شادی کرو اور یہ میرا چیلنج ہے کہ میں شادی کے بعد اس نفرت کو محبت میں بدل دوں گا اور یہ بھول جاؤ کہ تم کسی صورت شادی رکوا سکتی ہو تمجھیں....." وہ مشتعل سا اس کے دونوں کندھے جھنجوڑتا مستحکم انداز میں بولا۔

اپنے وجود کی نفی شاید اسی طرح انسان کو پاگل کردیتی ہے۔ اس کے جارحانہ انداز پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو وہ جھٹکے سے اس کے کندھے چھوڑتا اس کے منتشر و مرتعش وجود پر آخری گہری اور سنجیدہ نظر ڈالتا اٹھا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرا چھوڑ گیا۔ عنادل نے روتے ہوئے گھٹنوں میں سر رکھ دیا تھا۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی اس کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ کتنی دیر وہ مشتعل سا کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کمرے میں ٹہلتا رہا۔

"اوشٹ....." کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اس کا غصہ کم نہ ہوا تو سامنے موجود ٹیبل کو اس نے ایک زوردار ٹھوکر ماری پھر آہستہ آہستہ اس کے غصے پر بے سکونی چھانے لگی اور اس کی الجھی سوچیں کئی پہلوؤں پر مشتمل ہوتی اسے ہر ہر زاویے سے غور کرنے پر مجبور کرنے لگیں۔ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ عنادل کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گیا اور مضطرب سے انداز میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

اسے یاد آیا جب مما نے فون پر اسے بتایا کہ انہوں نے اس کا رشتہ بڑے ماموں کی بیٹی عنادل سے طے کردیا ہے تو وہ بہت حیران ہوا تھا۔ اس کی حیرانی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ اسے اس رشتے سے انکار تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ یہ سب اس کی توقع سے بھی جلدی ہوا تھا۔ پاکستان آتے ہوئے مما نے اسے بتایا تھا کہ وہ وہاں اس کے لیے لڑکی پسند کرنے جارہی ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے لڑکی پسند کرلی وہ فون پر اسے انفارم کردیں گی اور وہ سدا سے مما کا چہیتا لاڈلا اور فرماں بردار بیٹا اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس کا مزاج کافی ٹھنڈا تھا۔ سنجیدگی اور کم گوئی بھی اس کے مزاج کا ہی ایک حصہ سمجھی جاتی۔ شروع سے اس کے زیادہ تر فیصلے مما نے ہی کیے تھے اور آج تک اسے ان کے کسی فیصلے سے بھی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ امریکہ جیسے آزاد ماحول میں رہنے کے باوجود اس کی پسند ایک سیدھی سادی مشرقی لڑکی تھی اور مما اس کی پسند سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ اسی لیے بیٹے کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے عنادل کو پسند کیا جو ان کے بیٹے کے لیے ہر لحاظ سے بہتر تھی۔

آمن ضیاء بھی اپنا بزنس سمیٹ کر مستقل پاکستان آنے کی کوشش میں تھا۔ وہ اپنی اولاد کو کسی صورت اس آزاد ماحول کا حصہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ مما کے ساتھ امریکہ آیا تھا۔ بزنس کی وجہ سے پاپا کا قیام زیادہ تر امریکہ میں ہی رہتا۔ وہ یہاں رہنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر پاپا کے انتقال کے بعد مجبوراً اسے وہاں رہنا پڑا۔ یہاں آکر اسے پتا چلا کہ پاپا نے یہاں بھی کسی انگریز خاتون سے شادی کر رکھی تھی۔ اس کی مما کے لیے یہ خبر بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ انہیں شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹرز کی سر توڑ کوششوں کی وجہ سے ان کی جان تو بچ گئی مگر پہلے جیسی زندہ دلی ان میں مفقود ہوکر رہ گئی تھی۔ اکثر سینے کے بائیں طرف ہلکا ہلکا درد رہنے لگا تھا۔ چھوٹی

چھوٹی باتوں پر وہ گھبرانے لگیں اور بے وجہ کے اندیشے وخدشے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑنے لگے۔ ڈاکٹر جوزف سے ان کا علاج کافی سال چلتا رہا۔ وہ اپنی مما سے بہت پیار کرتا تھا۔ سو ان کے فیصلے پر سر جھکا کے اس نے انہیں مطمئن کردیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ بہت جلد کاروبار سمیٹ کر مستقل پاکستان آرہا ہے۔ اس کے اس فیصلے پر فرحت بیگم بہت خوش ہوئیں کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہ رہی تھیں۔ اس کے مطمئن کرنے پر وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگئیں۔ وہ شادی سے دس دن پہلے پاکستان آگیا تھا۔ سولہ سال بعد اس نے پاکستان کی سرزمین پر دوبارہ قدم رکھا تھا۔ وہ اپنوں میں آکر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ رات کھانے کی ٹیبل پر اس کی ملاقات عنادل سے ہوئی تھی۔ وہ گھبرائی، شرمائی موہنی صورت والی کومل لڑکی اسے پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کرگئی تھی۔ اس کی صاف شفاف گندم کی بالیوں سی رنگت پر اسے کوئی بھی دھبا نظر نہ آیا۔ اس کی اٹھتی گرتی مرتعش پلکیں اتنی دراز تھیں کہ مصنوعی ہونے کا گمان گزرتا۔ آمن کی نظروں کی حدت وتپش اس کا معصوم پاکیزہ چہرہ کسی صورت برداشت نہیں کر پارہا تھا۔ اس شرم وحیا کے پیکر کو گہری نظروں سے دیکھتے اسے اپنی مما پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بے شک ایسی ہی لڑکی اس کا آئیڈیل تھی۔ شرمین اور نرمین چھوٹے ماموں کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان دونوں پر اس نے سرسری سی نظر ڈالی اور اس سرسری سی نظر میں بھی وہ اچھی طرح جان گیا کہ ان کی طبیعت میں بے باکی اور بے پروائی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ وہ دونوں بے انتہا خوب صورت اور بری طرح فیشن کی ماری ہوئی لگ رہی تھیں۔ ان کی بے باکی اور اپنے وجود سے بے پروائی نے آمن ضیاء کو الجھن اور کوفت میں مبتلا کردیا تھا مگر اس کے باوجود بھی وہ ان سے خوش اخلاقی سے پیش آیا کہ اسے چھوٹے ماموں کا خیال تھا' اس کے آنے کے بعد اوپر والا پورشن ان دونوں بھائیوں نے ان کے حوالے کردیا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنا گھر لینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

''ایک گلاس پانی ملے گا؟'' وہ کچن میں کھڑی کباب تل رہی تھی جب آمن ضیاء نے اس کی کمر پر جھولتی لمبے بالوں کی موٹی چوٹی کو سراہتی نظروں سے دیکھتے پانی مانگا۔

آمن کی آواز پر وہ اچھلتے ہوئے پلٹی اور اس کو دیکھتے ہی اچھی خاصی بوکھلا گئی۔ اس کی گھبراہٹ وبوکھلاہٹ کو آمن ضیاء نے کافی حیران اور محظوظ نظروں سے دیکھا۔

''کیا آپ ڈر گئیں؟'' اس کی نظروں کی حدت وتپش کو اپنے چہرے پر گہرا ہوتے پاکر وہ بغیر جواب دیے سرعت سے فریج کی طرف بڑھی اور پھر بوتل نکال کر شیلف سے گلاس نکال کر اس میں پانی انڈیلنے لگی۔

''یہ لیں۔'' آمن ضیاء کی نظریں اس کی صاف شفاف مانگ پر پھسل رہی تھیں جب دوسرے ہاتھ سے دوپٹہ کھینچ کر ماتھے تک لاتے ہوئے اس نے پانی سے بھرا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس کی یہ حرکت آمن ضیاء کو اتنی دلکش اور پیاری لگی کہ وہ اس پل اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس کرنے لگا۔

''آپ مجھے دیکھ کر اتنا گھبرا کیوں جاتی ہیں عنادل؟'' گلاس اس کے کپکپاتے ہاتھ سے تھامتے وہ پُرشوق نظروں سے اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھتے بولا۔ ''کیا آپ کو مجھ سے ڈر لگتا ہے؟'' دل اس کی آواز سننے کو مچلنے لگا۔

''نہ.....نہیں تو.....'' تھوک نگلتے وہ بمشکل بولی۔ اس کی گھبراہٹ سے سفید پڑتی رنگت آمن ضیاء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

''آپ کا گھبرانا' ڈرنا میرے لیے بہت اٹریکٹو ہے۔ یہ کمپلکس صرف شادی سے پہلے تک کے ہیں۔ شادی کے بعد مجھے ان سے اختلاف ہوسکتا ہے۔'' اتنی واضح بات پر عنادل کی تو جان ہی نکلی جارہی تھی۔ ہتھیلیاں علیحدہ نم

ہونے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر نمودار ہوتے پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطروں کو دیکھ کر وہ بالکل نہیں چونکا بلکہ ہاتھ سے انہیں چھونے لگا۔ جب کرنٹ کھا کر وہ بے ساختہ پیچھے ہوئی اور متوحش نظروں سے اس کے اٹھے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔

"اف..... اتنی پاگل وہ مدہوش کردینے والی آنکھیں۔" آمن ضیاء پر بے خودی چھانے لگی۔ حیرت خوف وہراس نے مل کر ان آنکھوں کو مزید قاتل بنا دیا تھا۔

عنادل کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اب گری کہ تب..... اس کی حالت کو دیکھتے آمن ضیاء نے پل میں اٹھا ہاتھ اپنے پہلو میں گرالیا۔ اس طلسم زدہ ماحول اور خود میں جکڑنے والے بے خود و مبہوت کردینے والے پرفسوں لمحوں سے بمشکل خود کو باہر نکالا اور پھر ایک بھرپور نظر اس کے ہولے ہولے لرزتے وجود پر ڈال کر باہر نکل گیا تھا۔

اور آج وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس سے نفرت ہے شدید نفرت۔ وہ پاگل نہ ہوتا تو اور کیا کرتا' اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا ہو۔ اس کی آنکھیں شدت ضبط کی وجہ سے سرخ انگارہ ہو چکی تھیں۔ اس کے پورے چہرے سے اتنی تپش نکل رہی تھی کہ اسے اپنا آپ اس میں جھلستا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"نہیں عنادل زبیر..... میں تمہیں اپنے ساتھ ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں میری زندگی سے کوئی نہیں نکال سکتا..... تم خود بھی نہیں۔" وہ فضا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا مستحکم لہجے میں بڑبڑایا۔

.....✿.....✿.....

وہ افراتفری میں سیڑھیاں اترتے پورچ کی طرف بڑھ رہا تھا جب اسے لان میں کوئی ہیولا سا ٹہلتا نظر آیا۔

"رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟" وہ بڑبڑاتا ہوا لان کی طرف بڑھا اور پھر اس کے قدم جیسے ایک جگہ پر جم سے گئے۔

"عنادل..... تم اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو؟" گہرا سانس ہوا کے سپرد کرتے وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا' پھر جیسے ہی اس کی نظر اس کی آنکھوں پر پڑی تو اس نے بے ساختہ اپنے لبوں کو بھینچ لیا۔

"رات کے اس پہر یہاں میں تمہارے رونے کی وجہ جان سکتا ہوں؟" سپاٹ چہرے اور خشک و سرد لہجے میں استفسار کیا۔

اس کے یوں انجان بننے پر عنادل نے جیسے ہی اپنی سرخ و قاتل آنکھیں اٹھا کر شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھا تو آمن ضیاء کو اپنا دل ان میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے کو زیادہ سخت نہ رکھ سکا۔

"ادھر آؤ..... ادھر بیٹھو۔" اس کا بازو تھام کر اسے سنگی بینچ پر بٹھانے کے بعد وہ خود بھی ذرا فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ اس دفعہ عنادل نے کوئی مزاحمت نہ کی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟ تمہیں ذرا بھی ماموں کی عزت کا خیال نہیں' اب جبکہ کل مہندی کا فنکشن ہے اور پرسوں ہماری شادی ہے پھر کیوں اپنے ایسے رویے سے مجھے بار بار پریشان کر رہی ہو۔ کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" آخری حربے کے طور پر اس نے وہ بات بھی کہہ دی جس کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی بات پر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو آمن ضیاء نے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"عنادل پلیز..... میری بات کا جواب دو۔" یکلخت اسے ڈھیروں وسوسوں نے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ وہ اس کی بات کا کوئی بھی جواب دیئے بغیر اٹھ کر جانے لگی تو تیزی سے اس نے عنادل کی کلائی تھامی۔

"تمہیں میری اس بات کا ہر صورت جواب دینا ہوگا

عنادل..... کیونکہ یہ میرے لیے چھوٹی بات نہیں ہے۔"
وہ اس وقت سنجیدگی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔
"میں اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے لگی جو اس قدر سخت تھی کہ لگا اس کی کلائی ٹوٹ ہی جائے گی۔ ضبط گریہ سے نڈھال ہوتے وہ ایک بار پھر سے رو دی۔
"پلیز میری کلائی چھوڑیے مجھے درد ہو رہا ہے۔" شدید تکلیف کے اثرات اس کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ اس کی تکلیف محسوس کرنے کے باوجود بھی آمن کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔
"جب تک تم میری بات کا سچ سچ جواب نہیں دو گی یہ کلائی ٹوٹ تو سکتی ہے مگر چھوٹ نہیں سکتی۔" وہ غصے اور سنجیدگی کی ملی جلی کیفیت میں غرایا۔
عنادل اس کے لہجے کی کرختگی کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اور اس کی حالت دیکھتے خوف سے نیلی پڑنے لگی جو مرنے مارنے پر تلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑی۔ کلائی کی تکلیف کی وجہ سے حالت الگ خراب ہو رہی تھی۔ ایک نظر اس نے آمن ضیاء کے سپاٹ و خطرناک حد تک سنجیدہ اور مشتعل چہرے پر ڈال کر آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔ بہت تیزی سے آمن ضیاء نے اس کی کلائی چھوڑی تھی۔ جس پر سخت انگلیوں کے واضح نشان ابھر آئے تھے۔ اپنی گرفت کی سختی کو وہ بھی محسوس کر رہا تھا مگر اس ایک پل نجانے کیا ہوا تھا کہ اس کی کیفیت مرنے مارنے والی ہو گئی تھی۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔
"ایم سوری عنا....." مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی ہچکیوں پر قابو پاتی اندر کی طرف دوڑی اور وہ مضمحل سا وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اس کے لیے اتنا پوزیسو کیوں ہو رہا تھا وہ خود نہیں جانتا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر عنادل نے ہاں کہہ دی تو اس کی سانسیں رک جائیں گی یا پھر وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ تو شروع سے ہی نرم طبیعت کا مالک رہا تھا پھر عنادل کے معاملے میں اتنی شدت پسندی کب اور کہاں سے اس کے اندر آن سمائی کہ وہ حواس کھونے لگا۔ وہ اپنی کچھ دیر پہلے والی کیفیت پر ابھی تک حیران تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ عنادل کے نفی میں سر ہلاتے ہی اس کے اندر عجیب سی طمانیت اور آسودگی چھانے لگی۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، شدید نفرت، وہ یہ سچ تو قبول کر چکا تھا مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے یہ سچ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر پاتا۔

***

وہ اسے رخصت کروا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا، اس لیے گھر بنانے کی بجائے بنا بنایا گھر خرید کر جب مہندی کی صبح مما کو سامان پیک کرنے کا کہا تو سب حیران رہ گئے۔
"آمن بیٹا تمہیں یہاں کوئی پرابلم ہے کیا؟" زبیر ماموں نے کچھ فکرمندی سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔
"نہیں ماموں...... مگر یہ میری خواہش ہے کہ عنادل رخصت ہو کر اپنے گھر جائے۔ کیوں ماموں آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟" اس نے ساتھ ہی ان کی رائے بھی لینا چاہی۔
"نہیں بیٹا بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن بیٹا جی یہ بھی تو آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔" وہ تھوڑا ہچکچائے۔
"جی ماموں آپ نے درست فرمایا، یہ بھی میرا اپنا گھر ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھیں ناں اب ہمارے دو دو گھر ہو گئے۔" اس نے شرارت سے مما کی طرف دیکھتے جیسے بات کو مذاق کا رنگ دینا چاہا اور اس کا اٹل فیصلہ دیکھتے وہ مزید کچھ نہ بولے جبکہ آسیہ مامی کچھ متفکر سی نظر آنے لگیں۔ ان کے لیے اس سے بڑی خوشی کی اور بات کیا ہو سکتی تھی کہ ان کی اکلوتی نازوں پلی لاڈلی بیٹی ان کی

نظروں کے سامنے رہتی مگر آمن ضیاء کے فیصلے کو ماننے سے بھی وہ انکار نہیں کرسکتی تھیں سو خاموش ہی رہیں۔

رخصتی کے وقت شہزادوں سی آن بان رکھنے والا آمن ضیاء اور افسردہ عنادل سب کی نظروں کا مرکز رہے۔ وہ جو ضبط کے مرحلے سے بمشکل گزر رہی تھی۔ ماں کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ زبیر ماموں اور آسیہ مامی اس کے تڑپ تڑپ کر رونے کو خود سے جدائی پر محمول کر رہے تھے جبکہ آمن ضیاء اس کی کیفیت بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''میری بچی کو خوش رکھنا آمن' یہ بہت معصوم ہے' اس کی خطاؤں کو در گزر کرنا۔'' زبیر ماموں سے ملنے کے بعد وہ جیسے ہی آسیہ مامی کی طرف جھکا اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے انہوں نے نم لہجے میں کہا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مامی...... ان شاء اللہ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے انہیں مطمئن کرنا چاہا جب زبیر ماموں اسے ایک بار پھر سے گلے لگاتے مستحکم انداز میں بولے۔

''مجھے تم پر پورا یقین ہے بیٹے۔'' مختلف رسموں کے بعد اسے کمرے میں پہنچایا گیا۔

''عنادل بیٹا کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتادو۔'' فرحت بیگم نے اس کے تھکے ہوئے پُرکشش و معصوم چہرے کو محبت سے دیکھتے پوچھا تو نا چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینا پڑا۔

''نہیں پھپو...... کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''تمہارے کمرے میں ہر چیز موجود ہے۔ تمہارے کپڑے وارڈ روب میں' میں نے سیٹ کردیئے ہیں اگر پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔ ہچکچانا نہیں' اب یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔'' انہوں نے اس کے ماتھے پر محبت بھرا بوسہ دیا تو ان کی محبت پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ابھی لیٹ نہ جانا' میں آمن کو بھیجتی ہوں۔'' اسے ریلیکس انداز میں بیڈ کراؤن کے ساتھ کمر ٹکاتے دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائیں اور ان کی شرارت پر اس کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

''اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔ کبھی کوئی دکھ تمہارے نزدیک سے بھی نہ گزرے۔'' اس کی جھکی پلکوں کو محبت سے دیکھتے انہوں نے صدق دل سے دعا دی اور باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے باہر جاتے ہی وہ جو اپنے آنسو بمشکل روک رہی تھی' ایک دم سسک پڑی۔

آمن ضیاء جب دروازہ کھولتے اندر داخل ہوا تو اسے آنسو بہاتے دیکھ کر وہیں دروازے کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور پھر کتنی دیر سنجیدگی سے اسے سکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ آج سارا دن اس کے معصوم سوگوار حسن سے نظریں چراتا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے مگر وہ اس کا استقبال آنسوؤں سے کرے گی' یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا کہ اس کی سنجیدگی پر آہستہ آہستہ غصہ غالب آنے لگا اور پھر اس کی طرف بڑھتے اس نے اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی ہلکی سی بھی کوشش نہ کی۔ بہت جارحانہ انداز میں اسے بازو سے دبوچے اس نے اپنے مقابل کھڑا کیا تھا۔

''آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو اس طرح سے آنسو بہا کر۔ بہت ظلم ہوا ہے تم پر؟'' اس کے ہاتھ کی انگلیاں عنادل کے بازو میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ تکلیف کی شدت کو بمشکل برداشت کرتے اس نے اس کی سخت گرفت سے اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر پھر ناکام ہو کر کراہ کر اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کر بھیگی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس لمحے آمن ضیاء کو لگا وہ ان آنکھوں کے سحر سے کبھی آزاد نہ ہو پائے گا۔ بازو پر سخت گرفت خود بخود

ڈھیلی ہوتی گئی۔ وارفتگی و فریفتگی کی نجانے کتنی حدیں تھیں جو وہ لمحوں میں پار کر آیا تھا۔ وہ جو کب سے دانستہ اس کے معصوم اور سوگوار حسن سے نظریں چراتا رہا تھا اس پل مبہوت اور بے بس ہو کر رہ گیا۔ وہ تو سادگی میں لوٹ لیا کرتی تھی اور اس وقت تمام ہتھیاروں سے لیس یقیناً اس کے ضبط و برداشت کا امتحان بنی کھڑی تھی۔ پل میں اس کی نظروں کا انداز بدلا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے از خود فتگی کے عالم میں اس کی بندیا سیدھی کرنا چاہی۔ تو اس کی نظروں میں اترتا استحقاق دیکھ کر عنادل پل میں حواس باختہ ہوتی سراسیمہ سی اس کی کمزور گرفت سے بازو چھڑاتے دو قدم پیچھے ہوئی۔ آمن ضیاء نے اس کے گریز کو بغور دیکھا۔

''تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو' کیا کمی ہے مجھ میں' کیوں اپنے ایسے رویے سے مجھے تکلیف دیتی ہو؟''

''پلیز آمن......'' بمشکل وہ ہلکی سی آواز میں منمنائی۔ ''پلیز مجھے جانے دیں۔ مجھے نیند آرہی ہے' میں سونا چاہتی ہوں۔''

''میری نیند اڑا کر خود سونا چاہتی ہو...... کیوں ڈرتی ہو مجھ سے اتنا؟'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں تو تمہارا اپنا ہوں۔ لگتا ہے کہ مجھے دیوانہ کر کے ہی چھوڑو گی۔'' یکلخت وہ ہنسا' بڑی بے بس سی ہنسی تھی۔ پھر وہ جنون کی زد میں اس کے دونوں کندھے جھنجوڑتے اور اس کا چہرہ اپنے چہرے کے بے انتہا قریب کرتے اس کے بے خود پاگل کر دینے والے معصوم و سوگوار حسن کو مکمل استحقاق سے دیکھ کر شدت ضبط سے بولا۔

''کیا چاہتی ہو مجھ سے؟ کیوں چاہتی ہو اور تمہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ کیوں میرے جذبات پر پہرے بٹھا رہی ہو۔ کس کے لیے خود کو مجھ سے بچا رہی ہو...... کون ہے آخر وہ؟ اگر کوئی نہیں ہے تو پھر...... تو پھر کیوں کر رہی ہو تم یہ سب' بولو کیوں کس لیے؟'' وہ جنون کی زد میں پاگل ہونے لگا۔

''مجھے وجہ بتاؤ عنادل' مجھے وجہ بتاؤ۔'' اس کے پاگل پن' جنون اور دیوانگی کو دیکھتے وہ بے ساختہ بولی۔

''کیونکہ مجھے آپ سے نفرت ہے...... شدید نفرت۔'' جملہ کیا تھا آگ کا گولا تھا جو سید ھا دل پر لگا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہوئی اور وہ اس کے پہلو میں آگرے۔ کتنی دیر وہ ششدر رہ کا بکا اس کے وجود کو ساکت کھڑا دیکھتا رہا اس سے پہلے بھی اس نے یہ جملہ سنا تھا مگر دل کو اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی کہ وہ اس وقت محسوس کر رہا تھا۔

''مجھ سے تو آج تک کسی نے نفرت نہیں کی پھر تمہیں مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ تمہیں مجھ سے اتنی شدید نفرت ہوگئی؟'' وہ شکست خوردہ سا بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھتے اذیت میں بڑبڑایا۔

وہ اس کی خود کلامی پر کوئی بھی جواب دیے بغیر لہنگا سنبھالتی صوفے پر جا بیٹھی اور جو روئی تو روتی گئی اور پھر یہ رات ایک فریق نے روتے اور دوسرے نے اپنے وجود کی نفی کی تکلیف و اذیت برداشت کرتے گزار دی۔ صبح دونوں کے انداز بوجھل تھے۔

⁂

ولیمے کی تقریب کے بعد زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ عنادل گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی اور آمن ضیاء اپنا بزنس سیٹ کرنے میں۔ ان کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ دعوتوں کے سلسلے بھی چلتے رہے' جن میں دونوں نارملی شرکت کرتے رہے۔ وہ دونوں مما کے سامنے بالکل نارمل رویہ رکھتے مگر اپنے کمرے میں آتے ہی اجنبی بن جاتے۔ آمن ضیاء کو اپنے وجود کی نفی کا دکھ رہ رہ کر ستاتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ غیر معمولی پرسنلیٹی کا مالک ہے۔ آج تک اس نے صنف مخالف کی نظروں کو جب جب اپنی طرف اٹھتے پایا ان میں پسندیدگی اور

ستائش واضح دکھائی دی۔ امریکہ جیسے ملک میں رہنے کے باوجود اس کا کردار آئینے کی طرح صاف و شفاف رہا تھا۔ اپنی طرف بڑھتے مخالف صنف کے وہ بہت سے ہاتھوں کو جھٹک چکا تھا۔ اس کا مزاج ٹھنڈا اور طبیعت میں ٹھہراؤ کی واضح جھلک ملتی۔ عنادل کے معاملے میں نجانے کس جذبے کے زیر اثر وہ ایک دو دفعہ شدید غصہ کر بیٹھا تھا ورنہ اسے سختی کرنے اور سرد گوئی سے نفرت تھی۔ اونچا اونچا بولنے والی عورتیں بھی اسے سخت ناپسند تھیں۔ عنادل کو پہلی بار دیکھنے کے بعد ہی اس کے اندر سے آواز آئی تھی کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ وہ ہنسی خوشی اپنی پوری زندگی گزار سکتا ہے مگر پھر عنادل کے رویے نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا اس میں جس کی وجہ سے وہ اس سے اتنی شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ اپنی من پسند ہستی کے منہ سے یہ سب سننا کتنی تکلیف پہنچاتا ہے، یہ کوئی آمن ضیاء سے پوچھتا اور جب خود سے نفرت کی وجہ بھی معلوم نہ ہو تو پھر انسان الجھ کر رہ جاتا ہے اور آمن ضیاء بھی تو الجھ کر ہی رہ گیا تھا۔

عنادل اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی اگر وہ بھوکا رہتا تو رات کو بے چین رہتی، مما کے گھر نہ ہونے کی وجہ سے وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کے کافی قریب آ رہے تھے۔ صبح آفس جاتے وقت وہ اس کی تیاری میں مدد کرتی، کبھی کبھی تو آمن ضیاء کو اس پر بے انتہا محبت کرنے والی بیوی کا گمان گزرتا اور کبھی کبھی تو وہ اتنی سرد سی محسوس ہونے لگتی کہ آمن ضیاء بے ساختہ چونکتا اور اسے پُرسوچ نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔ کوئی تو وجہ تھی جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھی تھی اور وہی وجہ جاننے کا آمن ضیاء نے خود سے عہد کر لیا تھا۔

❁......✿......✿......❁

بستر پر شاعری کی کتاب رکھی تھی، وہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ عنادل کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ اک شوخی و شرارت اس کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ بے ساختہ ہی وہ اسے اونچی آواز میں پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔

پیار جتاتی ناز اٹھاتی، گر میں اس کو اچھا لگتا
وہ مجھ کو بھی جان بلاتی گر میں اس کو اچھا لگتا

عنادل کے استری کرتے ہاتھ کچھ پل کے لیے تھمے اور اس نے بری طرح چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ......" اس نے اس کی آنکھوں کا اشارہ سمجھتے شاعری کی کتاب اس کی نظروں کے سامنے لہرائی تو وہ جزبز سی اس کی آنکھوں کی شرارت کو نظر انداز کرتے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"عنادل یار...... آگے سنو شاعر محترم کیا فرما رہے ہیں۔" اگلا شعر پڑھنے سے پہلے وہ اسے دوبارہ چھیڑنے سے باز نہ آیا۔ اسے اس طرح سے بھی زچ کرے گا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اوپر سے اس کی شریر نظروں کا حصار۔ وہ خوامخواہ جھنجلانے لگی۔ اگلے شعروں نے آمن ضیاء کے دل پر کچھ ایسا اثر چھوڑا کہ ان میں گم ہوتے اس کا گمبھیر لہجہ پُر تاثر اور سنجیدہ ہو گیا۔

مجھ کو ہی وہ سوچا کرتی، مجھ کو ہی وہ دیکھا کرتی
من مندر میں دیپ جلاتی، گر میں اس کو اچھا لگتا
جیون کے ہر موسم میں وہ کوئل جیسی باتیں کرتی
میٹھے میٹھے گیت سناتی، گر میں اس کو اچھا لگتا

اور پھر آمن ضیاء کی آنکھوں میں حسرتوں، خواہشوں کے جگنو رقصاں ہونے لگے۔

آنچل کو دن بھر انگلی پر بل دیتی یوں ہنستی رہتی
نیندوں میں بھی خواب سجاتی گر میں اس کو اچھا لگتا

نجانے کیا ہوا تھا کہ عنادل کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو چمکنے لگے۔ وہ کپڑے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ آمن ضیاء لمبا سانس ہوا کے سپرد کرتے ہوئے کتاب کے ورق الٹنے لگا اور پھر بے بس سی ہنسی

ہنس دیا۔
وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور حسب معمول عنادل تیاری میں اس کی مدد کر رہی تھی۔
"یہ آپ کا رومال۔" گھڑی باندھنے کے بعد وہ والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھا کر جیسے ہی پلٹا عنادل نے اس کی طرف براؤن کلر کا رومال بڑھایا۔
"تھینک یو۔" اس کے ہاتھ سے رومال لیتے اس نے ایک سرسری سی نظر اس کے مرجھائے ہوئے بکھرے بکھرے سادہ حلیے پر ڈالی اور پھر چونک پڑا۔
"عنادل...... آر یو اوکے؟" اس کے مضمحل و نڈھال چہرے کی طرف دیکھتے اس نے بے قراری و تشویش سے پوچھا تو وہ خاموشی سے چہرہ جھکا گئی۔
"تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس نے عنادل کی کلائی تھامی۔
"او مائی گاڈ......! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" اس کی تپتی کلائی کی گرمائش کو محسوس کرتے وہ حیرت و پریشانی سے بولا تو عنادل کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
"اگر تمہاری طبیعت خراب تھی تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" تاسف بھری نظر اس نے اس کے نم چہرے پر ڈالی۔
"عنادل...... مجھے تم سے اتنی بے پروائی کی امید نہیں تھی۔ مجھ سے شدید نفرت کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اپنی تکلیف کو مجھ سے چھپاؤ۔" وہ افسوس سے بولا تو عنادل نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ نجانے کیا ہوا تھا کہ اس کے اس جملے نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔
"چلو میرے ساتھ۔" اس کی سرخ آنکھوں کو دکھ اور شکایت سے دیکھتے وہ اس کی کلائی پر دباؤ بڑھاتے باہر کی طرف بڑھا۔
"لیکن کہاں......؟" اس نے آمن کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی ہلکی سی بھی کوشش نہ کی مگر اس کے باوجود وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اسے کہاں چلنے کو کہہ رہا ہے۔
"اغوا نہیں کر رہا تمہیں...... ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں واضح تپش تھی۔ آمن کو یقیناً اس کی اس حرکت سے تکلیف پہنچی تھی۔ اس کے تپے ہوئے انداز کو دیکھتے کوئی بھی سوال جواب کیے بغیر وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔
"کس ٹینشن میں رہتی ہو تم' کیوں میرے ساتھ ساتھ خود پر بھی ظلم کر رہی ہو' آخر تم بتاتی کیوں نہیں کہ تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" وہ اچھا خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر اس کی جھنجلاہٹ شدید غصے میں تبدیل ہونے لگی۔
"او شٹ......" بہت زور سے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارے اور عنادل ہراساں نظروں سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھتی دروازے کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ اس کا چیک اپ کروانے کے بعد وہ ابھی راستے میں ہی تھے۔ گاڑی کی رفتار انتہائی سست تھی۔ بقول ڈاکٹر کے وہ کسی ٹینشن کی وجہ سے بخار میں مبتلا ہوئی ہے۔ یہ سننے کے بعد تو آمن ضیاء کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔ بہت ریش ڈرائیونگ کرتے اس نے گاڑی کو سڑک پر روکا مگر پھر جب اس کے غصے پر بے بسی غالب آنے لگی تو گاڑی کی رفتار خود بخود سست پڑتی گئی۔
"پلیز عنادل...... مجھے مزید پریشان مت کرو اور مجھے بتاؤ کہ تم مجھ سے کیوں نفرت کرتی ہو؟ اگر تمہیں میرے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہے تو وہ بھی کہہ دو۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ امریکہ جیسے ماحول میں رہتے ہوئے میں اخلاقی گراوٹ کا شکار رہا ہوں تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہاں میرا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔ بہت پاک صاف زندگی گزاری ہے میں نے وہاں۔ اسی لیے

شریک حیات بھی اپنے جیسی ہی چاہتا تھا اور تمہیں دیکھ کر لگا جیسے تم ہی میرے وجود کا دوسرا حصہ ہو جو بالکل میرے جیسا ہے۔'' وہ ہر صورت دونوں کے درمیان اختلاف کو دور کرنا چاہ رہا تھا۔

''آمن...... وہ...... میں......''

''ہاں...... ہاں بولو عنادل میں سب سننے کے لیے تیار ہوں۔'' آنسوؤں کی وجہ سے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی جب آمن ضیاء نے اس کا حوصلہ بڑھاتے اسے مزید بولنے پر اکسایا تو وہ بے اختیار اس کے کندھے پر سر ٹکاتے سسک پڑی۔ وہ نرمی سے اس کا سر سہلانے لگا۔

''پلیز عنادل...... اپنے دل کا ہر درد کہہ دو۔'' گاڑی رک چکی تھی اور وہ اس کے بولنے کا منتظر ہمہ تن گوش تھا۔

''میں...... میں کب...... آپ سے نفرت کرتی ہوں۔'' بے اختیاری میں وہ کہہ گئی اور آمن ضیاء پہلے تو کتنی دیر اس کے سسکتے وجود کو حیرت سے دیکھتا رہا پھر ہلکا پھلکا ہوتا کھل کر مسکرا دیا۔ اس کا ہاتھ اس کے سر سے سرکتے اس کے کندھے پر آ ٹھہرا۔ وہ کافی دیر اس کے کندھے سے لگی آنسو بہاتی رہی پھر جب آمن ضیاء کے اتنا قریب ہونے کا احساس ہوا تو ایک دم اس سے جدا ہوئی اور اپنی بے اختیاری پر خجل و نادم سی گردن جھکا گئی۔

''یہ لو۔'' آمن ضیاء نے رومال اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ایک نظر آمن ضیاء کے متبسم چہرے کی طرف دیکھتے اس کے ہاتھ سے رومال لیا پھر چہرہ اور آنکھیں صاف کرنے لگی۔

''گھر چلیں؟'' اس کی محویت و بے خودی پر سٹپٹاتے گھبراتے اس نے سرخ قاتل آنکھیں اٹھائیں تو اس کی دیوانہ کردینے والی استفہامیہ آنکھوں کو دیکھتے آمن نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

ان کے گھر میں داخل ہونے کے بعد جیسے ہی ان کی نظر مما پر پڑی تو دونوں ہی حیرت زدہ ان کی طرف بڑھے۔

''مما آپ کب آئیں؟'' ان کے گلے لگتے عنادل نے محبت سے پوچھا۔

''ابھی...... اور تم دونوں کہاں غائب تھے؟'' اور پھر مما اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر کافی پریشان ہوگئیں۔ ''تم نے میری بیٹی کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا آمن...... دیکھو تو کیسی سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہورہی ہے۔'' مما نے اس کے زردی مائل مرجھائے ہوئے اداس وملول چہرے کی طرف دیکھتے آمن کی کھنچائی کرنی چاہی تو وہ مسکرا کر بولا۔

''اب ضرور خیال رکھوں گا۔'' اس کی مسکراہٹ کافی معنی خیز تھی۔ عنادل اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اس کی معنی خیز بات کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد سے وہ اس کی نظریں اپنے وجود پر محسوس کرکے جھنجلا رہی تھی۔

......✿......✿......

''آمن...... پاپا ٹھیک تو ہوجائیں گے ناں؟'' آنسو بھری آنکھیں اٹھاتے عنادل نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا گھبرایا ہوا خوف زدہ چہرہ دیکھتے اس نے نرمی سے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھاما۔

''ہاں عنادل' ماموں ضرور ٹھیک ہوجائیں گے۔ ڈونٹ وری۔'' آئی سی یو کے بند دروازے کو دیکھتے آمن ضیاء نے اس کے ساتھ ساتھ جیسے خود کو بھی حوصلہ دینا چاہا۔ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکاتی سسک پڑی۔

زبیر ماموں کو بزنس میں اچھا خاصا نقصان پہنچا تھا جس کی انہوں نے شدید ٹینشن لی اور نتیجے کے طور پر کل رات انہیں زبردست ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

''پلیز عنادل چپ ہوجاؤ۔ ان شاء اللہ ماموں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔'' اس کا سسکتا وجود آمن ضیاء کو

تکلیف سے دوچار کررہا تھا۔ وہ اس پر دکھ بھری نظر ڈال کر چھوٹے ماموں اور آسیہ مامی کی طرف بڑھ گیا جو کچھ فاصلے پر نڈھال سے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ آسیہ مامی تو آنسوؤں کے ذریعے اپنا درد بہا رہی تھیں جبکہ چھوٹے ماموں کا چہرہ شدت ضبط کی وجہ سے سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

"پلیز مامی چپ ہوجائیں اللہ پر بھروسا رکھیں ماموں کو کچھ نہیں ہوگا۔" وہ ابھی ان کے قریب آ کر کھڑا ہوا ہی تھا جب ڈاکٹر خاور آئی سی یو کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ سب کی متوحش و مضطرب نظریں ان کے چہرے پر جم گئیں۔ سانسیں ایسے تھیں جیسے گلے میں اٹک سی گئی ہوں۔

"پیشنٹ اب خطرے سے باہر ہے۔"

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" سب نے تشکر بھرے پُرسکون سانس کھینچتے نم آنکھوں سے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔" عنادل کو تیزی سے اندر کی طرف بڑھتے دیکھ کر انہوں نے نرمی سے روکا۔ "ابھی وہ ہوش میں نہیں ہیں۔" "تھوڑی دیر میں جب ہوش میں آجائیں گے تو پھر مل لیجیے گا۔" انہوں نے مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور دوبارہ اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"آمن......" زبیر ماموں سے ملنے کے بعد وہ تیزی سے کاریڈور کی طرف بڑھ رہا تھا جب عنادل کی بے تاب پکار پر بے ساختہ پلٹا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔

"ہاں...... ہاں دل کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" اسے ہچکچاہٹ و گھبراہٹ میں مبتلا دیکھ کر وہ الجھا کہ آخر ایسی کیا بات وہ کہنا چاہتی ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی کشمکش کا شکار نظر آرہی ہے۔

"میں...... وہ ایکچوئیلی...... کچھ دن پاپا کے پاس ٹھہرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو......" اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے بالآخر اس نے کہہ ہی دیا پھر گردن اٹھا کر اک موہوم سی امید سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نجانے اب کیا کہہ دے۔ وہ حقیقتاً پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"دل میں بہت برا ہوں ناں؟ دیکھو تمہیں کتنا ہراساں کردیا۔" وہ اس کی سراسیمہ سی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے بولا۔ "تمہاری محبت میں، میں شدت پسند ضرور ہوں مگر جبر بھی مجھے پسند نہیں۔ اس وقت ماموں، ممانی کو تمہاری کتنی ضرورت ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں اب میں اتنا بھی ظالم نہیں ہوں کہ صرف اپنی غرض کے لیے اس نازک وقت پر تمہیں ساتھ چلنے کو کہوں۔ تم جب تک چاہو رک سکتی ہو۔" اس نے عنادل کا ہاتھ تھام کر دبایا تو وہ ممنونیت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تھینک یو آمن......"

"موسٹ ویلکم ڈیئر...... تم اندر جاؤ میں آفس جارہا ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑے تو فون کرکے بلا لینا اوکے؟" وہ مسکرا کر آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گئی اور وہ اس کے پژمردہ سراپا پر بھرپور نظر ڈالتا مڑ گیا تھا۔

"عنادل آپی میں آجاؤں؟" وہ ابھی ابھی پاپا کو میڈیسن کھلا کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹی ہی تھی جب نرمین نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"ہاں...... ہاں نرمین جانو آؤ اور میرے کمرے میں آنے کے لیے بھلا تمہیں اجازت کب سے درکار ہوگئی؟" وہ جو ابھی لیٹی ہی تھی اس کی آمد پر خوشگوار حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی حیرت بھی بجا تھی۔ وہ بھلا کب پہلے اس کے کمرے میں خود چل کر آئی تھی۔

"تایا ابو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس کے قریب بیڈ پر بیٹھتے اس نے بات کا آغاز کرنا چاہا۔

"اللہ کا کرم ہے۔ ٹھیک ہیں اب۔ ابھی ابھی انہیں میڈیسن دے کر آ رہی ہوں۔"

"کیا ہوا زمین...... خیریت؟" اس کی عدم توجہی محسوس کرتے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہوں...... ہاں۔" وہ ایک دم چونکی پھر اس کے پُرکشش چہرے کی طرف دیکھتے گویا ہوئی۔

"عنادل آپی...... مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے مگر سمجھ نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔"

"ایسی کیا بات ہے زمین جو تمہیں اتنی تمہید باندھنے پر مجبور کر رہی ہے؟" اس کے کشمکش میں مبتلا چہرے کو عنادل نے گہری نظروں سے دیکھا۔

"آپی! ایکچوئیلی میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ آمن بھائی کا آپ کے ساتھ رویہ کیسا ہے؟" اس کا ہچکچا کر پوچھنا اسے اچھے خاصے اچنبھے میں ڈال گیا۔

"کیوں...... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وہ...... عنادل آپی......"

"بات کیا ہے زمین...... صاف صاف بتاؤ؟" اسے نجانے کیوں گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"کل رات میری دوست نینی کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے سارا انتظام ریسٹورنٹ میں کیا ہوا تھا' وہیں پر میں نے رات کے نو بجے آمن بھائی کو کسی انگریز لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ میں کبھی آپ سے اس کے متعلق بات نہ کرتی مگر آمن بھائی کا اس کے ساتھ اس طرح فرینک ہونا مجھے اچھا نہیں لگا۔ ان کے درمیان بے تکلفی صاف عیاں ہو رہی تھی۔ وہ دونوں یہ بھی نہیں دیکھ رہے تھے کہ یہ امریکہ نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ عنادل آپی میں نہیں چاہتی کہ آپ کا گھر برباد ہو۔ اس لیے سب کہہ دیا تاکہ آپ آئندہ خیال رکھیں۔ آمن بھائی سے مت پوچھیے گا' مجھے پتا ہے کہ وہ صاف مکر جائیں گے۔ کبھی چور بھی چوری کر کے بھلا مانا ہے۔" وہ اس کے یخ بستہ ہاتھ پر ہاتھ رکھتی بولی۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی عنادل کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"عنادل آپی...... میں آپ سے شرمندہ ہوں مگر سچائی بھی تو آپ سے چھپا نہیں سکتی تھی ناں۔" اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں خود کو کمپوز کیا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔" اس سے زیادہ وہ مزید کچھ نہ بول سکی اور زمین اس کے سنجیدہ چہرے پر نظر ڈالتی باہر نکل گئی۔ آمن ضیاء آخر آپ نے وہی کیا ناں' جس کا مجھے ڈر تھا۔ کیوں...... کیوں میرے ڈر کو یقین میں بدل دیا؟" اس کے جاتے ہی وہ جو بمشکل خود کو سمیٹے بیٹھی تھی بکھر سی گئی اور پھر جو روئی تو روتی چلی گئی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتی تھی اور اب......

❁......❁

وہ عام سی سوچ رکھنے والی عام سی لڑکی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کا رشتہ پھپھو کے بیٹے کے ساتھ طے ہوا ہے تو وہ کچھ نہ بولی کیونکہ وہ بہت پہلے ہی یہ حق اپنے والدین کو دے چکی تھی اور ان کے فیصلے پر مطمئن بھی تھی۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے' عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی خواب بننے لگی۔ اس کے دل میں بھی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ اس نے آمن ضیاء کو نہیں دیکھا' تصویر بھی نہیں دیکھی مگر اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ شادی سے دس دن پہلے اس نے جیسے ہی آمن ضیاء کو دیکھا حیرت سے بت بنی رہ گئی۔ وہ کبھی بھی خود کو اتنا خوش قسمت نہیں سمجھتی تھی لیکن آمن ضیاء کو دیکھنے کے بعد اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا جیون ساتھی اتنا خوبصورت' اور حسین ہوگا۔ یونانی دیوتاؤں سا' شہزادوں سی آن بان

رکھنے والا۔ آمن ضیاء پہلی نظر میں ہی گھر کے تمام افراد کو چونکا گیا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد‘ سرخ وسفید رنگت بڑی بڑی ڈارک براؤن آنکھیں‘ مغرور کھڑی ستواں ناک‘ سیاہ سلکی بال چوڑی چھاتی۔ حتیٰ کہ ایک ایک نقش کی تراش دلکش اور پرکشش تھی۔ کچھ بھی تو نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا۔ موتیوں جیسے سفید دانتوں نے کلین شیو چہرے کی تازگی و خوب صورتی کو اور بڑھا رہا تھا۔ اس کی پرسنیلٹی دیکھ کر چند لمحوں کے لیے گھر کے تمام افراد انگشت بدنداں رہ گئے۔ آسیہ مامی اور زبیر ماموں کو اپنی بیٹی کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ پرکشش اور حسین نکلا تھا۔ عنادل جو پردے کی اوٹ سے اسے دیکھ رہی تھی‘ وہیں اسی پل نم آنکھوں سے اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی اور پھر ہر نماز کے بعد وہ اپنے اچھے نصیب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا نہ بھولتی۔ اسے تھوڑی گھبراہٹ اور پریشانی تھی کہ اسے دیکھنے کے بعد آمن ضیاء کا کیا ریسپانس ہوگا کیونکہ وہ نارمل شکل وصورت کی عام سی لڑکی تھی مگر اس کی سوچ کے برعکس آمن ضیاء کا رویہ اس کے ساتھ بہت خیال کرنے اور محبت کرنے والا نکلا اور وہ جو تھوڑا بہت گھبراہٹ کا شکار تھی مطمئن ہوگئی۔ جوڑ راس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا اب وہ بھی جاتا رہا۔ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے وہ اچھی طرح سمجھ اور جان گئی تھی۔ اس کے سامنے آجانے پر وہ گھبرا اور بوکھلا جاتی‘ آمن ضیاء کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ مقابل خوامخواہ کنفیوز ہونے لگتا۔ وہ خوش تھی بلکہ بہت خوش اور انہیں مسرت بھرے دنوں میں ایک ایسا کڑا دن بیچ اس کی ساعتوں سے گزرا کہ وہ مختلف وسوسوں اور خدشوں میں گھرنے لگی۔

ایک روز وہ نرمین کو بلانے اس کے کمرے کی طرف آرہی تھی جب اندر سے آتی شرمین کی آواز پر ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

’’تم سچ کہتی ہو نرمین کہ آمن ضیاء بہت خوب صورت ہے مگر ایسے خوب صورت لوگ اندر سے کتنے بدصورت ہوتے ہیں تم نہیں سمجھ سکتی اور پھر جس ماحول سے وہ آیا ہے‘ تم کیا سمجھتی ہو بہت پاک صاف ہو کر آیا ہوگا۔‘‘ وہ اپنے دل کی جلن نکالتی استہزائیہ ہنسی۔ ’’آخر کیا ہے عنادل میں؟ کچھ بھی تو نہیں‘ کیا وہ ہم سے زیادہ خوب صورت ہے‘ نہیں ناں تو پھر آمن ضیاء اس سے کیوں شادی کررہا ہے؟ دیکھنا کتنی جلدی وہ اس سے اوب جاتا ہے۔ یار میری دوست کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ وہ عام شکل وصورت کی نارمل سی لڑکی تھی جبکہ اس کا شوہر بے انتہا ڈشنگ۔ ہوا کیا‘ شادی کے ایک سال بعد کسی دوسری خوب صورت لڑکی کی زلفوں کا اسیر ہوتے ہی اسے طلاق دے دی۔ دیکھ لینا عنادل کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔‘‘ حسد کی آگ شاید تمام انسانوں کو اسی طرح جلا کر راکھ کردیتی ہے۔ عنادل نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔ اس کی ٹانگیں یوں کانپنے لگیں جیسے ان سے جان نکل رہی ہو۔ تساہل بھرے قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آئی اور آتے ہی بیڈ پر گر گئی۔ وہ بہت معصوم سادہ اور صاف دل لڑکی تھی۔ شرمین کی چال نہ سمجھ سکی جس نے کھڑکی سے اسے دروازے پر کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شرمین کی باتیں جیسے اس کے دل میں کھب کر رہ گئی تھیں۔ اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ حواسوں پر عجیب عجیب وسوسوں اور اندیشوں کا راج رہنے لگا اور پھر بہت سوچنے کے بعد اس نے اپنے دل کے برخلاف فیصلہ کرلیا کہ وہ آمن ضیاء سے شادی نہیں کرے گی اور پھر واقعی اس نے انکار کردیا تھا۔ یہ انکار اس نے نرمین کے ذریعے آمن ضیاء تک پہنچایا تھا گھر کے بڑے سب بے خبر تھے۔ وہ آمن ضیاء کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتی تھی لیکن اس کی سوچ کے برعکس چند پلوں میں آمن ضیاء متفکر سا اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ انکار کی وجہ کیا بتائے‘ سو بنا سوچے سمجھے کہہ گئی کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ شدید نفرت۔

اسے لگا اس کے منہ سے یہ سب سن کر آمن ضیاء خود شادی سے انکار کردے گا۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا جو اس سے شدید نفرت کرتی ہو۔ اس کی بظاہر شدید نفرت کو بھی آمن ضیاء کسی خاطر میں نہ لایا اور اس سے شادی کرکے ہی چھوڑی۔ شادی کے بعد بھی وہ برے برے واہموں کا شکار رہی مگر پھر آمن ضیاء کی بے انتہا محبت، دیوانگی و شدت نے اسے جھکنے پر مجبور کردیا اور اس کے اندر روز نیا نیا چہرہ لے کر پنپتے وسوسے میٹھی نیند سو گئے اور اب وہ شادی کے چھ ماہ بعد دوہری طاقت کے ساتھ دوبارہ بیدار ہوچکے تھے جنہیں سلانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

"آمن کیوں...... کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا؟" وہ سسک پڑی۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے ناں کہ نرمین جھوٹ بول رہی ہو یا پھر اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو؟" اندر سے آتی پرزور آواز پر اس کے آنسو چند پل کے لیے تھمے مگر پھر دماغ کی آواز پر وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ "اسے کیا ضرورت ہے مجھ سے جھوٹ بولنے کی لیکن اس وقت مجھے آمن سے بات ضرور کرنی چاہیے۔" مصمم ارادہ کرتے اس کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا۔

"ہیلو......" تیسری بیل پر دلکش بوجھل سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی یقیناً وہ غنودگی میں تھا۔

"آمن...... میں عنادل۔"

"دہاٹ...... یہ...... تم ہی ہوناں دل؟" اس کی پوری کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" حیرت و انبساط سے دریافت کیا۔

"آپ خواب نہیں دیکھ رہے، یہ میں ہی ہوں۔" اس کا لہجہ بے انتہا سنجیدہ تھا مگر آمن ضیاء اس وقت اتنا خوش تھا کہ اس کے لہجے پر غور ہی نہ کرسکا۔

"مما کیسی ہیں؟" کسی طریقے سے بات بھی تو شروع کرنی ہی تھی۔

"ٹھیک ہیں، تمہیں بہت مس کررہی ہیں بلکہ اس گھر میں ایک اور بھی فرد ہے جس کا سکون و قرار آپ اپنے ساتھ لے آئی ہیں محترمہ۔" لہجہ بے انتہا دلنشین تھا مگر عنادل اپنی ہی الجھنوں میں الجھی ہوئی تھی۔

"آمن آج آپ آفس سے کب واپس آئے تھے؟" کچھ کھوجتا ہوا بڑا تفتیشی انداز تھا مگر اس دفعہ بھی وہ کچھ محسوس نہ کرسکا اور ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

"کب آنا ہے یار...... تمہارے بغیر گھر میں ذرا دل نہیں لگتا اور ویسے بھی آج میری کسی سے میٹنگ تھی سو لیٹ آیا تھا۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں جس کے ساتھ آپ کی میٹنگ تھی۔" زہریلی سوچ نے پھر سے اس کے دماغ پر قابض ہونا چاہا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" بے یقینی میں چھپتا ہوا انداز تھا۔

"آف کورس یار اور یہ تم بھی کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئیں۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں کب لینے آؤں؟"

"بات کھلنے کا ڈر جو ہے اس لیے بات کو بدلو گے ہی۔" اس نے پھر سوچا۔

"بہت امتحان لے لیا تم نے میرے صبر کا ایک ہفتہ ہوگیا ہے تمہیں گئے، میں کل آفس سے واپسی پر تمہیں لینے آؤں گا۔" اس کے خاموش رہنے پر اس نے خود ہی طے کرلیا۔

"نہیں آمن ابھی نہیں، میں کچھ دن اور رہنا چاہتی ہوں۔" بے یقینی جیت گئی تھی۔ شک کا بیج تناور درخت بننے کی طرف تیزی سے گامزن تھا۔ اسی لیے اس کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہوا۔

"دل...... ماموں کی طبیعت اب ٹھیک ہے پھر کیوں

ضد کر رہی ہو؟'' وہ نرمی سے بولا۔

''میں نے کہہ دیا کہ مجھے رہنا ہے تو بس رہنا ہے اور میں اس سلسلے میں آپ سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتی۔'' لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اپنی کڑواہٹ پر قابو نہ پاسکی۔

''دل...... یہ تم کس لہجے میں بات کررہی ہو؟'' اچنبھے سے پوچھا۔

''مجھے نیند آرہی ہے' میں سو رہی ہوں۔ آپ بھی سو جائیے۔'' ساتھ ہی اس نے کال کاٹ دی اور وہ اس کے انداز پر ہکابکا وہ کتنی دیر فون کو گھورتا رہا پھر آمن نے کتنی بار نمبر ملایا مگر اس نے نہیں اٹھایا گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

صبح اس کا سر کافی بھاری ہورہا تھا' آنکھوں میں بھی سوجن کی وجہ سے جلن ہورہی تھی۔ وہ چائے بنانے کچن میں آگئی۔ ابھی اس نے کیتلی چولہے پر رکھی ہی تھی جب آمن ضیاء کی آواز پر گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ مما کو سلام کرنے کے بعد پاپا کی طبیعت کے متعلق استفسار کررہا تھا۔ وہ یہ تو ضرور جانتی تھی کہ آج وہ ہر صورت آئے گا مگر اتنی صبح' یہ اسے اندازہ نہ تھا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے بیٹا...... اب وہ ٹھیک ہیں' تم ان کے پاس چل کر بیٹھو' میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے سر اثبات میں ہلاتے ماموں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حالانکہ وہ اس وقت صرف عنادل سے ملنے آیا تھا' جس کے فون کی وجہ سے وہ ساری رات پریشان رہا۔ اتنی روڈ تو وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

''عنادل بیٹا آمن کے لیے بھی چائے بنالو اور مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اٹھ نے کے بعد سیدھا ادھر ہی آ گیا ہے' ناشتا بھی تیار کرلینا۔ کافی رف سا حلیہ ہے اس کا۔'' اسے ناشتے کا کہنے کے بعد انہوں نے وہ بات بھی کہہ دی جو آمن ضیاء کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلے ان کے دماغ میں آئی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا خاموشی سے فریج سے دودھ نکالنے لگی کہ اسی وقت اسے شدید چکر آیا۔ اگر بروقت لپک کر آسیہ مامی اسے تھام نہ لیتیں تو یقیناً وہ زمین بوس ہوجاتی۔

''عنادل...... کیا ہوا بیٹا؟'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی کہ اسے ایک دم ابکائی آئی اور اس نے وہیں قے کردی۔ قے اس قدر شدید تھی کہ اس کا برا حال ہوگیا۔

''دل......'' اسی وقت آمن ضیاء اندر داخل ہوا اور تڑپ کر اس کی طرف لپکا۔

''مامی...... اسے کیا ہوا ہے؟'' اس کے نڈھال زرد وجود کو دیکھتے اس نے پریشانی وتشویش سے پوچھا تو آسیہ مامی اس کی متفکر صورت دیکھتے مسکرا دیں۔ وہ ایک جہاندیدہ خاتون تھیں۔ بیٹی کی حالت سے بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔

''اللہ کرے جیسا میں سوچ رہی ہوں ویسا ہی ہو۔ تم ابھی میرے ساتھ ڈاکٹر نسرین کی طرف چلو۔'' انہوں نے دوپٹے سے اس کا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مما پلیز' مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جائے گا۔'' وہ نقاہت سے بولی تو اس کی حالت کے پیش نظر وہ اسے آمن ضیاء کی مدد سے لاؤنج میں لے آئیں جو پریشان سا سب دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں انہیں یہاں بلوا لیتی ہوں۔'' چونکہ ڈاکٹر ان کی دوست تھی۔ سو انہیں تسلی تھی کہ فوراً آجائے گی اور ایسا ہوا بھی تھوڑی دیر میں وہ ان کے روبرو تھی۔

''مبارک ہو آسیہ...... تم نانی بننے والی ہو۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' وہ اپنے یقین کی تصدیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے بے ساختہ مسکرا دیں۔

''اور اب تو ماشاء اللہ دوسرا مہینہ بھی ختم ہونے والا

ہے۔ کیوں بھئی عنادل بیٹا تمہیں اپنے وجود میں ہونے والی تبدیلی کی خبر نہ ہوسکی۔" انہیں مبارک باد دینے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جو حیران پریشان سی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید ابھی تک بے یقین تھی۔

"کچھ دنوں سے میری طبیعت عجیب سی رہنے لگی تھی مگر لاکھ سوچنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں پارہی تھی کہ مجھے کیا ہورہا ہے۔" وہ نظریں جھکائے شرمندگی سے بولی تو وہ ہنس دیں۔

"پہلی بار میں ایسا ہوجاتا ہے' کوئی بات نہیں لیکن بیٹا تم کمزور بہت ہو اس لیے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کی کوشش کرو اور جو میڈیسن لکھ رہی ہوں پراپر لیتی رہنا۔" اس نے ان کی ہدایت پر آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس وقت وہ اپنے بیڈروم میں لیٹی ہوئی تھی اور آمن ضیاء پریشان سا لاؤنج میں بیٹھا ہاتھ مسل رہا تھا۔ جب اسے کسی پل سکون نہ ملا تو سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ رات بھی عنادل کا انداز اسے کچھ عجیب سا لگا تھا سو صبح اٹھتے ہی اس نے بغیر چینج اور بغیر ناشتا کیے ادھر کی راہ لی تھی۔ اپنے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس کرکے اس نے آنکھیں کھولیں۔ آسیہ ماسی مسکرا رہی تھیں۔

"مبارک ہو آمن بیٹا..... تم پاپا بننے والے ہو۔" خبر ایسی ضرور تھی کہ وہ بیٹھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"آ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں ماسی؟" انہیں دونوں کندھوں سے تھامتے دوبارہ تصدیق چاہی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اللہ سوہنے نے بہت بڑی خوش خبری دی ہے ہم سب کو' میں آج ہی بکرا منگوا کر عنادل کا صدقہ دیتی ہوں۔" نجانے کیا ہوا تھا کہ اتنی بڑی خوشی آمن ضیاء سے سنبھالی نہ گئی' بے ساختہ آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔

"آمن..... تم بھی ناں ایک دم پاگل ہو۔" انہوں نے اس کی پرنم آنکھیں دیکھتے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ گردن جھکاتے مسکرادیا۔

"تم عنادل کے پاس جاؤ' تب تک میں سب کو خوش خبری سنا کر آتی ہوں۔" کمرے میں داخل ہوتے اس کی عجیب سی حالت ہورہی تھی۔ بے انتہا خوشی و مسرت کا احساس تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے واش روم سے نکلتی عنادل کو اٹھا کے گھما ڈالا۔

"دل تم اندازہ نہیں لگاسکتیں یار کہ اس وقت میں کتنا خوش ہوں' آئی لو یو ریئلی ویری مچ۔" وہ واقعی اس وقت بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

"ہمارا بچہ دل' ہمارا خون' ہماری محبت کی نشانی۔" وہ اس قدر جذباتی ہورہا تھا کہ آواز بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ "تم نہیں جانتی دل کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔" اسے مقابل کھڑا کرتے پرنم لہجے میں تشکر سموتے اس نے اپنے کپکپاتے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔ اس کی آنکھوں کی نمی نے عنادل کی زبان پر چند پلوں کے لیے قفل ڈال دیے مگر پھر جیسے ہی زرمین کی باتیں یاد آئیں تو اس کے چہرے کے عضلات تناؤ کا شکار ہونے لگے۔

"چھوڑو مجھے۔" بھرپور مزاحمت کرتے وہ تڑپ کر اس کے حصار سے نکلی۔ آمن ضیاء نے حیرت سے اس کے خفگی لیے برہم چہرے کی طرف دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے دل؟" اس نے ناسمجھی سے دریافت کیا۔

"بہت خوب...... بہت اچھی اداکاری کرلیتے ہیں آپ' اتنی اچھی ایکٹنگ پر آپ کو داد دینی چاہیے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"میں سمجھ نہیں پارہا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" وہ الجھا۔ اس کی نظروں کی کاٹ اس سے کسی صورت برداشت نہیں

ہورہی تھی۔

"میں آپ کو سمجھانا بھی نہیں چاہتی۔ بس آپ میرے کمرے سے نکل جائیں۔ ابھی اور اسی وقت۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے اس نے دوٹوک انداز میں کہا تو آمن ضیاء کا چہرہ ایک پل میں کئی رنگ بدل کر رہ گیا۔ شدید اہانت کا احساس تھا شاید۔

"کیا تم اپنے رویے کی وجہ بتاؤ گی؟" بہت کٹیلی اور سنجیدہ نظر ڈالی تھی اس نے اس کے بدگمان چہرے پر۔

"مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا' نہ آج اور نہ کل۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔" بے لچک اور جارحانہ انداز میں کہتے اس نے اس کی طرف پیٹھ کرلی تو آمن ضیاء کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ جو اتنی دیر سے ضبط سے کام لے رہا تھا بپھرتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور پھر اسے بازو سے دبوچتے شدید غصے کے عالم میں اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ کس چیز کی سزا دے رہی ہو مجھے؟" وہ سلگتے ہوئے بولا۔

اس کے جارحانہ تیور دیکھتے وہ اندر تک سہم گئی۔ شادی سے پہلے بھی اس نے اسے غصے میں دیکھا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے کے نرم پُرکشش خدوخال شدید اشتعال کی وجہ سے خطرناک حد تک کرخت ہوچکے تھے۔

"میرا بازو چھوڑیں' مجھے درد ہورہا ہے۔" تکلیف کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے مگر آمن ضیاء کو مطلق پروانہ ہوئی اسے تو اس کے منہ سے نکلنے والے لفظوں نے پاگل کردیا تھا۔

"عنادل...... مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ اپنے رویے کی وضاحت کرو۔" اس کے رونے پر اس نے گرفت نرم کی مگر بازو ابھی بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"ایک دفعہ کا کہا آپ کی سمجھ میں نہیں آتا' مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا۔"

"چٹاخ......" مردانہ ہاتھ کا بھرپور تھپڑ تھا جو اس کے نازک گال پر پڑا۔ اس کے تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ہونٹ کے کنارے سے بھی خون نکلنے لگا۔ اس کا بازو اگر آمن ضیاء کی گرفت میں نہ ہوتا تو یقیناً وہ گرچکی ہوتی۔

"اب تو میں نے تمہاری زبان سے یہ سب سن لیا ہے مگر آئندہ اگر تم نے ایسی کوئی بات کہی تو زبان کھینچ لوں گا۔" وہ بولا نہیں بلکہ غرایا تھا۔

"آپ چاہے مجھے جان سے ماردیں مگر میں بار بار یہی کہوں گی۔" وہ اس کی گرفت سے بازو چھڑاتے دور جا کھڑی ہوئی جبکہ وہ سلگتی نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"مجھے آپ سے نفرت ہے' شدید نفرت۔ شادی سے پہلے بھی میں نے یہ آپ سے کہا تھا۔ کاش میں نے آپ سے شادی نہ کی ہوتی۔" اسے شدید غصے کے عالم میں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی اور پھر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

آمن ضیاء کے قدموں سے یک دم زمین کھسکی تھی۔ بڑھتے قدم ایک دم منجمد ہوکر رہ گئے۔ چھناکے سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ پل بھر میں مشتعل آنکھوں میں افسوس اور دکھ ہلکورے لینے لگا۔ کتنی دیر وہ تاسف سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے پاس کہنے کو ایک لفظ نہ بچا تھا۔ آنکھوں میں نمی چھانے لگی۔ وہ ٹوٹا بکھرا شکست خوردہ دکھائی دینے لگا تھا۔

"میں آج ہار گیا دل......" اس نے پُرنم آنکھیں اٹھائیں پھر آہستہ سے نفی میں گردن ہلانے لگا۔

"دل نہیں تم عنادل ہو۔ صرف عنادل' دل تو وہ لڑکی تھی جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا' دیوانگی کی ساری حدیں ختم کردیں' جو تمہاری جیسی ظالم اور سفاک نہیں تھی۔ جو میری آنکھ کا ہر اشارہ سمجھتی تھی اور جس کے لیے میری خوشی بہت اہمیت رکھتی تھی' تم میری دل نہیں ہو اور تم میری دل ہو بھی نہیں سکتیں۔" وہ افسوس و بےبسی سے بڑبڑایا اور پھر اس

کی طرف دیکھتے بولا۔ "میں یہاں سے جارہا ہوں عنادل' اب میں تمہیں کبھی واپس لے جانے کے لیے نہیں آؤں گا۔" عنادل کے قدم ایک دم لڑکھڑا سے گئے بے ساختہ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ حسب منشا جواب پر بھی وہ بہت تکلیف محسوس کررہی تھی۔

"اور تم بھی کبھی واپس نہ آنا تب تک جب تک تمہارے اندر وہ لڑکی زندہ نہ ہوجائے جسے میری خوشی عزیز تھی اور جو میری آنکھ کا ہر اشارہ سمجھتی تھی۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرا چھوڑ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

رات کے ڈھائی بجے کا وقت تھا اور آمن ضیاء دنیا ومافیہا سے بے گانہ لان میں سنگی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس نے عنادل کو ٹوٹ کر چاہا تھا' اپنی محبت میں کہیں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی اور کل عنادل کے لفظوں نے اس کی روح تک گھائل کرچھوڑی تھی۔ اس کے جگر کو چھلنی کردیا تھا۔ کل سے اس کے اندر بہت توڑ پھوڑ ہورہی تھی۔ اس نے عنادل کے بغیر رہنے کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا مگر وہ ضدی لڑکی شروع سے ہی اس سے نفرت کرتی چلی آرہی تھی اور آج اس کی آنکھوں میں نفرت کے شرارے اس نے کس طرح سہے تھے یہ صرف اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ بکھر چکا تھا۔

"پلیز دل لوٹ آؤ میرے پاس۔ میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر اک اذیت میں بولا۔

"کیوں...... آخر کیوں تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو' مجھ سے بدگمان ہو پلیز بتاؤ ناں؟" وہ نم آنکھوں میں تخیل کے پردے میں ابھرتے اس کے دلکش پیکر کو دیکھتے بولا۔

"مجھے تمہارے بغیر جینا نہیں آرہا۔ پلیز لوٹ آؤ...... لوٹ آؤ ناں۔" اس کے وجود پر سوگواریت چھانے لگی۔

"مجھے نہیں رہنا تمہارے بغیر۔ تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ آنا ہوگا۔" وہ ضدی لہجے میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا پھر بے بسی سے سر نفی میں ہلانے لگا۔ اس کے اپنے ہی الفاظ اس کے سامنے دیوار کی صورت آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار پھر سے وہیں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح تہی دامن گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں خود میرے پاس آنا ہوگا دل...... ورنہ تم اپنے آمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دو گی۔" اس کی آنکھ سے ننھا سا آنسو پھسلا اور اس کے کپڑوں میں جذب ہوگیا تھا۔

اسے کچھ دنوں سے ہلکا ہلکا سا بخار رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نسرین نے اسے ہر طرح کی میڈیسن لینے سے منع کردیا۔ عجیب بوجھل بوجھل اور افسردہ دن گزر رہے تھے۔ اس نے مما کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ وہ یہاں مزید رکنا چاہتی ہے۔ پاپا کی حالت بھی اب کافی ٹھیک ہوچکی تھی۔ انہوں نے دوبارہ آفس جانا بھی شروع کردیا تھا۔ وہ کسی صورت آمن ضیاء کو معاف کرنے کا خود میں ظرف نہیں پارہی تھی۔ اس نے بہت صاف زندگی گزاری تھی اور وہ اپنے شریک سفر سے بھی یہی توقع رکھتی تھی۔ اس سے پہلے کہ آمن ضیاء اسے چھوڑتا وہ خود اسے چھوڑ دینا چاہتی تھی مگر اس ننھی جان کا خیال اسے ہر طرح کا حتمی فیصلہ لینے سے روک رہا تھا۔ ان دنوں تو دل اتنا بوجھل رہنے لگا تھا کہ ساری ساری رات روتے اور جاگتے گزر جاتی۔ اس وقت بھی رات کے ایک بجے کا وقت تھا اور نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سر میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مما اس کی نڈھال اور پژمردہ صورت کو کوئی اور ہی رنگ دے رہی تھیں اور اس کی غذا کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھیں۔ اتنا بڑا دکھ اپنے تنہا دل پر سہنا نہایت مشکل امر

تھا۔ بہت بار وہ ٹوٹی‘ بکھری اور سسکی تھی اور یہ سب اس نے تنہا اپنے کمرے میں ہی کیا تھا۔ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو اس نے اپنی سگی ماں سے بھی چھپالیا تھا۔ سر میں درد مزید بڑھا تو وہ چائے بنانے کے ارادے سے کمرے سے باہر آئی مگر پھر جیسے ہی زرمین اور شرمین کے مشترکہ کمرے کے قریب سے گزری ٹھٹک کر رک گئی۔ قدم جیسے جم سے گئے تھے۔

”آمن ضیاء کی زندگی میں عنادل زبیر کی کوئی جگہ نہیں اور زرمین ڈیئر تھینک یو سو مچ کہ تم نے میرا اتنا ساتھ دیا۔ اب عنادل کا گھر تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ وہ زہر ملی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔

”آپی آپ یقین نہیں کریں گی کہ عنادل کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ رنگت تو لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی ہے اور اتنی کامیاب ایکٹنگ پر میں خود کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔“

”بس زرمین جانو تھوڑی سی ضرب اور لگانی پڑے گی۔ پھر عنادل‘ آمن ضیاء کی زندگی سے باہر اور میں شامل۔“ اس نے اپنی طرف سے جیسے قصہ ہی ختم کردیا تھا۔

عنادل چند پل کے لیے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔ تو یہ اصل وجہ تھی اس کا گھر تباہ کرنے کی۔ وہ اپنی آنکھوں سے خون سفید ہوتے دیکھ رہی تھی۔ رشتوں سے بھروسا اٹھتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔

”بہت چاہتی ہوں میں آمن ضیاء کو‘ اسے پہلی بار دیکھ کر تم اندازہ نہیں لگاسکتیں کہ میری کیا حالت ہوئی تھی۔ اتنی ڈشنگ پرسنیلٹی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔ اسی لیے تو شادی سے پہلے ان ڈائریکٹ اسے بدظن کرنا چاہا مگر اس بے وقوف نے اتنی باتیں سن کر بھی شادی کرلی۔ نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت ہوئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ عنادل کو گولی سے اڑادوں۔“ اتنا زہر بھرا تھا اس کے دل میں...... عنادل کی آنکھوں میں نمی چھانے لگی۔

”میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اسے میں کسی صورت آمن کی زندگی میں نہیں رہنے دوں گی۔ وہ صرف اور صرف میرا ہے‘ ایک دفعہ آمن ضیاء کو فون پر میں نے عنادل سے بدظن کرنا چاہا تھا مگر اس کا ری ایکٹ اتنا سخت تھا کہ میں دوبارہ فون کرنے کی ہمت نہ کرپائی۔ تم یقین نہیں کرسکتیں زرمین کہ اسے اس پر کتنا اعتماد ہے۔ اندھا بھروسا کرتا ہے وہ اس پر اور اندھی محبت‘ اب اس محبت کی جڑوں میں بدگمانی اور شک کا بیج کیسے بونا ہے‘ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ عنادل...... یہ تو ہے ہی بیوقوف۔ اسے ہی ٹارگٹ پر رکھنا پڑے گا اور پھر کامیابی ہمارا مقدر ہوگی۔“ عنادل کی برداشت جواب دے گئی۔ اپنی آنکھوں کی نمی پیتے اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں خود کو کمپوز کیا اور دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگئی۔ نجانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی‘ وہ دونوں اسے دیکھ کر بوکھلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں نہیں جانتی تھی کہ میری اپنی بہنیں ہی آستین کا سانپ نکلیں گیں۔“

”عنا...... دل...... آ...... پی۔“ زرمین ہکلائی۔

”چپ...... مزید ایک لفظ نہیں۔ تمہیں میں اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھی اور تم کیا نکلیں۔“ اس کی آواز میں ایک اذیت اور درد بول رہا تھا۔

”اور تم شرمین...... مجھے تمہاری سوچ پر افسوس ہورہا ہے۔ اتنا حسد‘ اتنا زہر پال رکھا ہے تم نے اپنے اندر۔ جانتی ہوں تم دماغی طور پر بیمار ہوچکی ہو کہ کچھ بھی کرسکتی ہو۔ مجھے ترس آرہا ہے تم پر‘ ایک بات یاد رکھنا تم جتنی مرضی کوشش کرلو مگر ہم میاں بیوی کو جدا نہیں کرپاؤ گی سمجھیں۔“ اس نے انگلی اٹھاتے دکھ سے دونوں کی طرف دیکھا پھر نجانے کیا ہوا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تم دونوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر مجھے ساری زندگی افسوس اور دکھ رہے گا کہ میری اپنی بہنیں میری دشمن

نکلیں۔" اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں کے سامنے رو پڑتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو پھر روتی ہی چلی گئی۔ رہ رہ کر اسے وہ جملے یاد آرہے تھے جو اس نے آمن سے بولے تھے۔ کتنی پاگل ہوگئی تھی وہ اور کتنی تلخی سے وہ اس سے پیش آئی تھی اور پھر اس کے جملوں کے بعد آمن ضیاء کا ردعمل..... وہ تڑپ تڑپ کر رودی۔

"پلیز آمن مجھے معاف کردیں میں بہت بری ہوں۔ بہت بیوقوف ہوں۔" وہ تکیے پر سر پٹخنے لگی۔

"اب..... اب میں کیا کروں گی؟" وہ اک خوف کی حراست میں آگئی۔ "کتنا غصہ ہو رہے تھے آمن' زندگی میں پہلی بار مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔" اس نے اپنا ہاتھ گال پر رکھا۔

"اف..... پلیز میری مدد کیجیے۔ اب میں ترمین اور ثرمین کو مزید کوئی موقع نہیں دینا چاہتی۔ میں ایک منٹ اب یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ مستحکم انداز میں بولی۔

"مگر..... مگر میں گھر واپس کیسے جاؤں۔ آمن کو فون کروں' نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں' کیا خود سے چلی جاؤں۔ کیا آمن مجھے معاف کردیں گے؟" وہ ہراساں سی بڑبڑائی۔

"میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا اور تم بھی واپس مت آنا تب تک جب تک تمہارے اندر وہ لڑکی زندہ نہ ہوجائے جسے میری خوشی عزیز تھی اور جو میری آنکھ کا ہر اشارہ سمجھ جاتی تھی۔"

"ہاں..... وہ مجھے ضرور معاف کردیں گے کیونکہ وہ میرے اپنے ہیں۔" اس نے ایک فیصلے کے بعد آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا جو صبح کے چار بجا رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے بیگ میں سامان رکھنے لگی پھر باہر کی طرف بڑھی۔ چوکیدار اونگھ رہا تھا۔

"نظیر بابا..... ساجد کو بلائیں؟" چوکیدار گھبرا کر کھڑا ہوتا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ جو اسے ڈرائیور کو بلانے کا کہہ رہی تھی۔

"سنا نہیں آپ نے۔" اس کے یک ٹک دیکھنے پر وہ زچ ہو کر بولی تو وہ خاموشی سے سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے گیٹ سے ہی اپنے ڈرائیور کو واپس بھیج دیا۔ چوکیدار نے بہت حیران ہو کر دروازہ کھولا تھا۔

"بیگم صاحب سب خیریت ہے ناں؟" اسے اتنی صبح سویرے دیکھ کر اس کا پریشان ہونا لازمی تھا۔

"ہاں..... ہاں سب خیریت ہے تم دروازہ بند کرلو۔" جھکے جھکے انداز میں کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھلا دیکھ کر وہ حیران ہوتی اندر بڑھی' نظر سیدھی بیڈ پر پڑی جو خالی تھا۔ بے چین نظروں نے پل میں پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر صوفے پر آتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ آنکھیں موندے صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکائے بے ترتیب سا بیٹھا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ بہت مضمحل و نڈھال دکھائی دے رہا تھا' اس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے اس کے رت جگوں کے گواہ تھے' کئی دنوں سے شاید شیو بھی نہیں کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا چہرہ کافی مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی اس کے قریب چلی آئی۔ کارپٹ پر بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر سر رکھتے سسک پڑی۔ آمن ضیاء نے بہت چونکتے آنکھیں کھولیں مگر پھر عنادل کو اپنے اتنے قریب روتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"دل.....!" بے یقینی سی بے یقینی تھی پکار میں..... عنادل پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"مجھ..... مجھے معاف کردیں آمن..... میں بہت بری ہوں' بہت بری۔" اک اذیت میں اس نے سر اٹھایا

اور آمن ضیاء تو سکتے کی سی کیفیت میں اس کے نم چہرے اور متورم و متوحش آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تم..... تم..... یہ..... دل تم ہی ہو ناں؟" اس کے معصوم چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیتے وہ حیرت و خوشی سے بولا۔ آواز کی تڑپ کو عنادل نے اپنے دل پر محسوس کیا۔

"ہاں آمن یہ میں ہی ہوں آپ کی دل..... پلیز مجھے معاف کردیجیے میں بہت بری ہوں۔" اس نے وسیع ظرف رکھنے والے اس انسان کو محبت و فخر سے دیکھتے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"یہ..... یہ تم کیا کررہی ہو دل..... پلیز اٹھو یہاں سے اور اِدھر آکر بیٹھو۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے اسے اپنے قریب صوفے پر بٹھایا اور وہ بے ساختہ اس کے سینے سے لگتی تڑپ تڑپ کر رو دی۔ یہاں تک کہ آمن ضیاء کو اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

"پلیز دل..... بس کرو۔" وہ اسے خود میں بھینچتے نم آنکھوں سے بولا۔

"میں بہت بے وقوف ہوں، بہت دکھ دیا ناں آپ کو، بہت تکلیف دی۔" نم ناک آنکھیں اٹھائیں۔

"تم واپس آگئی ہو میرے تمام دکھوں کا مداوا ہوگیا۔ پلیز اب یہ رونا بند کرو۔ تمہارے یہ آنسو مجھے بہت تکلیف دے رہے ہیں۔"

"آپ کو مجھ سے ذرا گلہ نہیں؟" اس کے سینے سے سر اٹھاتے حیرت سے پوچھا تو اس کے دلربا انداز کو دیکھتے وہ دھیرے سے مسکرا کر نفی میں گردن ہلا گیا۔

"آپ کا ظرف بہت وسیع ہے آمن مگر مجھے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لینے دیجیے۔ میں اپنے اندر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔" آمن ضیاء نے بہت سہولت اور سکون سے اسے دیکھا۔

"مجھے آپ سے کبھی بھی نفرت نہیں تھی آمن..... کبھی بھی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"آپ جانتے تھے؟" اچنبھے سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

"ہاں میں جانتا ہوں مگر میں یہ نہیں جانتا کہ نفرت نہ ہوتے ہوئے بھی تم یہ کیوں کہتی رہیں کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے..... مجھے کہیں نہ کہیں یہ خبر ہو چکی تھی کہ تم مجھے چاہتی ہو مگر تمہارے ہونٹوں سے نکلنے والا یہ جملہ کہ مجھے آپ سے شدید نفرت ہے مجھے ٹھٹکنے اور الجھنے پر مجبور کر دیتا اور میں یہ طے نہیں کر پاتا کہ تمہیں مجھ سے نفرت زیادہ ہے یا محبت۔" اس نے صاف گوئی سے دل کی بات اس پر واضح کردی۔

"مجھے آپ سے محبت ہے۔ صرف اور صرف محبت، نفرت تو میں نے آپ سے کبھی کی ہی نہیں۔" مسرت و انبساط کی اجلی کرن پھوٹی، اس وقت آمن ضیاء کے اندر مگر وہ خاموش رہا کیونکہ آج وہ اسے سننا چاہتا تھا اس کے اندر کا ورق ورق حفظ کرلینا چاہتا تھا۔

"جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھنے لگی تھی۔ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے، میں جاننے اور محسوس کرنے لگی تھی مگر پھر ایک دفعہ....." اس نے ساری سچائی آمن ضیاء کے گوش گزار کردی۔ جو حیرت سے بت بنا اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

"مجھے معاف کردیں آمن میں نے آپ پر شک کیا، آپ کو برا سمجھا۔" وہ اس کے دونوں ہاتھوں پر سر ٹکاتے سسک پڑی۔

"اگر مجھے خوب صورتی چاہیے ہوتی تو جہاں سے میں آیا ہوں وہاں جگہ جگہ حسن بکھرا پڑا ہے، مجھے تو پاکیزگی اور معصومیت چاہیے تھی اور جو تم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ میں نے امریکہ میں بہت پاک صاف زندگی گزاری ہے

دل اور اپنے جیون ساتھی کو بھی اپنے جیسا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے کردار کے حوالے سے بہت پوزیسو ہوں۔ پلیز آئندہ میرے کردار پر کبھی شک مت کرنا۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اور میں تمہیں آخری بھی بنانا چاہتا ہوں۔"

"آمن...... میں آپ پر کبھی بھی شک نہ کرتی مگر وہ نرمین، ثمرین......" وہ ایک دم خاموش ہوئی تو آمن نے اسے دیکھا۔

"آمن...... جن کے ساتھ آپ کا اتنا قریبی رشتہ ہو وہی آپ کا دل کیوں دکھانے کا سبب بنتے ہیں؟" اس نے معصومیت سے آنکھیں اٹھائیں۔ "ان دونوں کو میں نے اپنی سگی بہنوں سے زیادہ چاہا اور انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میرا ہی گھر توڑنا چاہا۔" وہ ایک اذیت میں بول رہی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ جب آمن ضیاء نے اس کے آنسو صاف کرتے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

"بس دل...... اب ہم اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کریں گے۔ ان کے عمل ان کے ساتھ ہم ان کی سوچ نہیں بدل سکتے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمارے رشتے پر آنچ نہ آنے دی۔ ایک دفعہ کسی انجان لڑکی کا میرے موبائل پر فون آیا تھا مگر میں نے سیریس نہیں لیا۔ اور میں سیریس لے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں تمہیں روح کی گہرائی تک جان چکا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میری بیوی کا دل کتنا صاف ہے اس کی سوچ کتنی شفاف ہے اور اس کا وجود کتنا پاکیزہ ہے پھر میں کسی کی بات پر کیونکر یقین کرتا؟" اتنا مان اور یقین عنادل بے خودی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ بہت اچھے ہیں آمن اور یقیناً میں نے بہت بڑی نیکی کی ہوگی کہ آپ جیسا اچھا جیون ساتھی اللہ تعالیٰ نے میری قسمت میں لکھ دیا۔ میں بہت خوش ہوں آمن بہت خوش۔" اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے وہ اک جذب سے بولی۔ جب وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔

"اب تمہاری اس خوشی میں مجھے کتنا حصہ ملے گا آفٹر آل پندرہ دنوں سے تمہاری جدائی کی آگ میں جل رہا ہوں کچھ تو اجلے پانی کی نرم نرم پھوار برسنی چاہیے۔" پہلے تو وہ خاک نہ سمجھی مگر پھر جب اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت کو دیکھا تو چھوئی موئی ہوتی پل میں اس سے دور ہوئی۔

"آپ بھی ناں بس......" اس کا چہرہ سرخ انار ہو چکا تھا۔ اس کے رنگ بدلتے چہرے کو فور محبت سے دیکھتے آمن ضیاء نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ بے انتہا قریب۔

"اوں ہوں...... اب میں ایک پل بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا اور نہ تمہیں اس کی اجازت دوں گا۔" اس کی آنکھوں میں خمار چھانے لگا تھا۔ "کل ہم دونوں اپنے بچے کے لیے شاپنگ کرنے چلیں گے۔" اس کے چہرے پر جھکتے وہ بے خودی میں بولا تو عنادل کی سانسیں رکنے لگیں۔ کوئی راہ فرار نہ پا کر اس کی شدتوں و بے اختیاریوں سے گھبراتے شرماتے اس نے اپنا سر آمن ضیاء کے سینے پر ٹکایا اور اس خوب صورت ادا پر محبت مسکرا دی۔

bazsuk@naeyufaq.com

بزم سخن

سمیہ عثمان

نازیہ بتول چوہدری...... قصور
کڑی دھوپ میں بھی سر پہ اک چادر تنی رہتی ہے
میں ثناء خوانِ محمد ﷺ ہوں میری بات بنی رہتی ہے

بشریٰ خاور...... موسیٰ خلیل
پھول تاروں سے سجا ماہِ سخا کا نقش پا
اک جہانِ نور ہے خیر الوریٰ ﷺ کا نقش پا
اِس جہاں سے اُس نگر کا راستہ ہے کہکشاں
چوم لے گر اُمتی نور الہدیٰ ﷺ کا نقش پا

انجمن ندیم...... بدر مرجان
اِک تغافل سے اِک توجہ تک
عشق آنسو بھی ہے تبسم بھی

شبنم انجم...... سرگودھا
کس کی مجال ہے کہ ہم کو خریدتا
ہم خود ہی بک گئے خریدار دیکھ کر

ہالہ سلیم...... اورنگی ٹاؤن کراچی
تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک اٹھیں میرے خال وخد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ لو میرے سارے رنگ اتار دو

قرۃ العین پارس...... کراچی
لفظوں کی جوت میں ہے طاقت بہت چمکا دو مجھے
کچھ پھول میری نذر کردو مہکا دو مجھے
سایہ ہوں بھٹکتا ہوا تنہا تاریک راتوں میں
اپنی بانہوں کی چاندنی میں پناہ دو مجھے

ماریہ انصاری...... کراچی
غریب شہر پہ تہمت تراشنے والو
امیر شہر کا بھی شجرۂ نسب دیکھو

شازیہ فریحہ شبیر...... حویلیاں
کوئی ہمدرد نہ تھا، کوئی بھی درد نہ تھا
اچانک ایک ہمدرد ملا پھر اسی سے ہر درد ملا

صدیقہ خان...... باغ آزاد کشمیر
ذرا سا ہٹ کہ چلتا ہوں زمانے کی روایت سے
کہ جن پہ بوجھ ڈالوں وہ کاندھے یاد رکھتا ہوں

طوبیٰ اسلم...... اٹک
استاد عشق سچ کہا بہت نالائق ہوں میں
مدت سے اک ہی شخص کو یاد کر رہا ہوں میں

کنزیٰ رحمان...... فتح جنگ
صحرا کے سمندر میں تُو میرے ساتھ ساتھ چل
میں تیری راہوں میں پھول بن کر بکھر جاؤں گا

فائزہ بھٹی...... پتوکی
میں اس کو چھوڑ تو سکتی ہوں مگر چھوڑ نہیں پاتی
وہ شخص میری بگڑی ہوئی عادت کی طرح ہے

حافظہ کیسرا...... 157 این بی
ہمارے بعد نہیں آئے گا لسے چاہت کا ایسا مزہ
وہ لوگوں سے کہتا پھرے گا مجھے چاہو اُس کی طرح

امبر گل...... جھڈو، سندھ
جب بھی اِک شام یاد آتی ہے
جیسے دنیا ٹھہر سی جاتی ہے
حادثے ایک پل نہیں رکتے
زندگی ہے کہ چلتی جاتی ہے

رمشا نور...... کراچی
کچھ ایسی تیز نہ تھی اس کے انتظار کی آنچ
یہ زندگی ہی میری برف تھی پگھلتی رہی

ارم صابرہ...... تلہ گنگ
جسے ناز تھا اپنی محبت پہ بہت
بھلا دیا ہے اسی سرو قد نے مجھے

عائشہ سلیم...... کراچی
بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ کٹ نہ جائیں کہیں بینائی کے ریشے
آنکھوں نے کبھی تیری راہوں سے ہٹ کر نہیں دیکھا

رانی اسلام...... گوجرانوالہ
میرے لہو میں کھلے ہیں تیرے ہجر کے پھول

کب آئے اُن پہ تیرا موسم وفا دیکھیں
کبھی ہو یوں بھی کہ وہ آئے اور ہم نہ ملے
کبھی تو اہلِ جفا کا بھی حوصلہ دیکھیں

اسماءربانی......ٹکہ توت پنڈی گھیپ

تمام شب جہاں جلتا ہے ایک اداس دیا
ہوا کی راہ میں اِک ایسا گھر بھی آتا ہے
وفا کی کون سی منزل پہ اس نے چھوڑا تھا
کہ وہ تو یاد ہمیں بھول کر بھی آتا ہے

دلکش مریم......چنیوٹ

چھوڑو یہ سرسری وعدے کبھی پورے نہیں ہوتے
میں اسی وقت جو مر جاؤں تو کیا مر جاؤ گے؟

عائشہ پرویز......کراچی

پُر سکون سے اِک منظر میں
چاندی کے دیپ جلتے ہیں

پروین افضل شاہین......بہاولنگر

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اِس میں رونے کی کچھ جگہ رکھنا

شاہ زندگی......پنڈی

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہوگی تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

نور سحر شاہ......مانسہرہ

تنہا اداس چاند کو سمجھو نا بے خبر
سب کچھ وہ سن رہا ہے مگر بولتا نہیں

حنا مریم......نامعلوم

ہم تو موجود تھے راتوں میں اجالوں کی طرح
لوگ نکلے ہی نہیں ڈھونڈنے والوں کی طرح
ہم دل تو کیا روح میں اتر جاتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

بشریٰ نوید باجوہ......اوکاڑہ

تم آؤ تو زندگی کٹ جائے ہمدم
کہاں کوئی اب ہم نوا ہے
یزیدیت کا دور ہے چار سو نوید
حسینی لشکر اب کہاں ہے

اقصیٰ زرگر، سنیاں زرگر......جوڑہ

آغازِ عشق تو خوب تھا یارو کیا کہوں
پہلے تو تھی دل گی اب دل کو جا لگی

صالحہ امتیاز......چیچہ وطنی

تُو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا ہوں
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا ہے
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

سحرش خان بھٹو......کراچی

وہ کر نہیں رہا تھا میری بات کا یقین
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے
اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

سعدیہ رمضان سعدی......186 پی

توڑ گیا وہ ہم سے ہر تعلق فقط اتنا کہہ کر
کہ اجڑے ہوئے لوگوں میں ہم بسا نہیں کرتے

حافظہ راشدہ......وہاڑی،ساہیوال

محبت اور چاہت کی شناسائی دے گیا
بڑی درد ناک ہم کو تنہائی دے گیا
اُس شخص کے نام تھی سب ہی رونقیں
جو ہم سے بچھڑ کر داغ جدائی دے گیا

بنت پاکستان آبشار......بھکر

ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیابان میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی پچھتائی بہت

مونا شاہ قریشی......کبیروالا

تیری صورت کو جب سے دیکھا ہے
لوگ میری آنکھوں پر مرتے ہیں

شیریں گل......ٹمن

بے نور ہوگئی میری چشم انتظار
تکمیل ہوسکی نہ تیرے انتظار کی

چکن ڈنر

زہرہ جبین

دھابہ چکن

اجزاء:

قیمہ	ایک پاؤ
مرغی	آدھا کلو
پیاز	تین عدد
ٹماٹر	پانچ عدد
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ	دو کھانے کے چمچ
لہسن	دو کھانے کے چمچ
گرم مسالہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
دہی	چوتھائی پیالی
دیسی گھی	آدھا پیالی
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

ایک پین میں تیل گرم کریں اور پیاز کو سنہرا کرلیں، لہسن ادرک شامل کرکے بھونیں جب خوشبوں آنے لگے تب تمام مصالحے، قیمہ، مرغی شامل کردیں اور بھون کر سرخ کرلیں۔ دھابہ چکن میں ٹماٹر ڈالیں اور پین کو ڈھک کر دم پر رکھیں جب پانی خشک ہوجائے اور مصالحہ تیل چھوڑ دے تو ڈش میں نکالیں اور ہرا مصالحہ، گرم مصالحہ چھڑک کر پیش کریں۔

طلعت نظامی.....کراچی

چکن بریانی

اجزاء:

چکن	سوا کلو
چاول	ایک کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	تین عدد درمیانی
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	چھ عدد درمیانے
دہی (پھینٹا ہوا)	ایک پیالی
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
دھنیا پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	چھ سے آٹھ عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
پودینہ (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
ثابت گرم مصالحہ	دو کھانے کے چمچ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
دودھ	ایک پیالی
کیوڑہ	چند قطرے
کوکنگ آئل	ایک پیالی

ترکیب:

دیگچی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے پانچ منٹ گرم کرکے ثابت گرم مصالحہ ڈال دیں۔ جب کڑکڑانے لگے تو پیاز ڈال کر سنہرا فرائی کرلیں۔ ادرک، لہسن، ہلدی اور زیرہ ڈال کر دو سے تین منٹ تک چمچ چلائیں اور پھر ٹماٹر شامل کرکے اتنی دیر پکائیں کہ ٹماٹر گل جائیں۔ جب ٹماٹر اچھی طرح گل جائیں اور ایک پیسٹ کی شکل میں آجائیں تو چکن، نمک، لال مرچ پسا ہوا، دھنیا پسا ہوا گرم مصالحہ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال دیں پھر دہی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور درمیانی آنچ پر بارہ سے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ چاولوں کو تھوڑے سے ثابت گرم مصالحے کے ساتھ ایک کنی (مکمل ابلنے سے تین چار منٹ پہلے) ابال کر چھلنی سے پانی چھان لیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں چکن کو پھیلا کر رکھیں اور اس کے اوپر چاولوں کی تہہ لگادیں۔

دودھ میں زردے کا رنگ اور کیوڑہ ملا کر چاولوں پر چھڑک دیں۔ دیگچی کو ڈھک کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے گرم توے پر رکھ کر ہلکی آنچ پر دم پر دیں۔

ارم صابرہ..... تلہ گنگ

چکن کارن سوپ

اجزاء:

مرغی کی یخنی	چار سے چھ پیالی
چکن (ریشہ کی ہوئی)	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچ
چینی	ایک چائے کا چمچ
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچ
مکئی کے دانے	آدھی پیالی
انڈے	دو عدد
سرکہ	دو کھانے کے چمچ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ
کارن فلار	دو سے تین کھانے کے چمچ
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچ

ترکیب:۔

یخنی بنانے کے لیے دیگچی میں آدھا کلو مرغی کو آٹھ سے دس پیالی پانی کے ساتھ اتنی دیر ابالیں کے تقریباً چار پیالی یخنی رہ جائے، یخنی کو بیک سے محفوظ رکھنے کے لیے اس میں ابال آنے کے بعد ایک چھوٹی چھلی ہوئی ثابت پیاز اور دو چار ثابت کالی مرچیں شامل کردیں۔ ایک علیحدہ دیگچی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ تک ہلکا گرم کر کے اس میں لہسن ڈال کر ایک منٹ فرائی کریں۔ چکن ڈال کر اس کا پانی خشک ہونے تک فرائی کریں پھر اس میں یخنی شامل کرلیں۔ مکئی کے دانوں کو ہلکا سا کوٹ لیں اور یخنی میں ڈال دیں۔ کارن فلا کو چار کھانے کے چمچ پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ یخنی میں ڈالیں اور مسلسل چمچ چلائیں تاکہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ نمک، سفید مرچ، چینی اور چائنیز نمک ڈالیں اور انڈوں کو ہلکا سا پھینٹ کر شامل کردیں۔ آخر میں سرکہ اور سویا ساس شامل کرلیں۔

ہالہ سلیم..... کراچی

گوبھی آلو کا سالن

اجزاء:

پھول گوبھی	آدھی
دہی	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن، ادرک کا پیسٹ	دو چائے کے چمچ
آلو	دو عدد
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
پانی	ایک کپ
تیل	چوتھائی کپ
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	ایک کھانے کا چمچ
پسی لال مرچ	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

پہلے تھوڑے سے پانی میں آدھا پھول گوبھی کو ابال لیں۔ ساتھ میں دو عدد آلو بھی ابال لیں اور دونوں کو ایک طرف رکھ دیں۔ اب ہانڈی میں چوتھائی کپ تیل گرم کر کے باریک سلائس میں کٹی ہوئی ایک عدد پیاز کو گولڈن براؤن کرلیں پھر اس میں ایک پاؤ دہی، چار عدد ہری مرچ، تھوڑا سا ہرا دھنیا، دو کھانے کے چمچے پسی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچہ ہلدی، ایک چائے کا چمچہ پسا زیرہ، ایک چائے کا چمچہ پسا دھنیا اور لہسن، ادرک کا پیسٹ، نمک حسب ذائقہ اور ایک کپ پانی شامل کر کے ہلکی آنچ پر پکنے کے لئے چھوڑ دیں۔ دس سے پندرہ منٹ بعد جب تیل نظر آنے لگے تو اس میں ابلتے ہوئے آلو اور پھول گوبھی ڈال کر آنچ تیز کر کے بھون لیں۔ مزےدار گوبھی آلو سالن تیار ہے۔

حنا اشرف..... کوٹ ادو

فرائیڈ بنگالی مرچ

اجزا:

چنے کی دال	آدھا کپ
مونگ کی دال	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچ
ہری مرچ	دو عدد
نمک	آدھا چائے کا چمچ
شملہ مرچ	ایک سے دو عدد
چاٹ مصالحہ	دو کھانے کے چمچ
بھنا زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
کچی ادرک	ایک چائے کا چمچ
کالا نمک	آدھا چائے کا چمچ
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچ
براؤن شوگر	ایک کھانے کا چمچ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچ
تیل تلنے کے لیے	حسب ضرورت

ترکیب:

چنے کی دال اور مونگ کی دال کو الگ سے پانچ گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر پیاز، زیرہ، ہری مرچ اور نمک ڈال کر باریک پیس لیں۔ تلنے کے لیے ایک برتن میں چاٹ مصالحہ، بھنا زیرہ، کچی ادرک، کالا نمک، لیموں کا رس، براؤن شوگر اور پسی لال مرچ شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب ہری مرچوں کو چاک کر کے بیج نکال دیں اور ہاتھ میں رکھ کر دال والے مصالحے سے کوٹ کر لیں اور گرم تیل میں فرائی کر لیں۔

عرشی نبیل — کراچی

قیمہ کریلے

اجزا:

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
ہری مرچ	۶ عدد
کریلے	ایک کلو
ٹماٹر	تین عدد
لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچ
لال مرچ	ایک کھانے کے چمچ
زیرہ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب:

کریلے چاک کر کے بیج نکال کر فرائی کر لیں۔ اور چھیل کر کریلے چھیلنے میں ہیں۔ ایک پیاز کو چوپ کر کے فرائی کر لیں۔ لہسن ادرک، ٹماٹر، چوپ ہری مرچ ڈال کر تمام مصالحے ڈال دیں۔ تھوڑا پانی ڈال کر بھونیں اور قیمہ شامل کر کے اچھی طرح بھونیں۔ اب فرائی کریلے اور ایک پیاز ڈال کر دم دیں۔

نزہت جبین ضیاء — کراچی

ہرا مصالحہ مٹر

اجزا:

ابلے مٹر	دو کپ
تیل	ڈیڑھ ٹی سپون
زیرہ	ایک ٹی سپون
چاٹ مصالحہ	آدھا ٹی سپون

ہری چٹنی بنانے کے لیے

املی کا پیسٹ	ڈیڑھ ٹی سپون
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچ	ایک سے دو عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

تیل گرم کریں اور اس میں زیرہ ڈال دیں۔ ہلکا فرائی ہو تو اس میں مٹر ڈال کر فرائی کر لیں۔ آخر میں ہری چٹنی اور چاٹ مصالحہ ملا کر تھوڑا اور فرائی کریں۔ دو منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ آلو کے چپس کے ساتھ سرو کریں۔

سعدیہ شاہین — ساہیوال

www.naeyufaq.com

عالمی انتخاب

زینب احمد

غزل

شام سے آج سانس بھاری ہے
بے قراری سی بے قراری ہے
آپ کے بعد ہم نے ہر گھڑی
آپ کے ساتھ گزاری ہے
رات کو دے دو چاندنی کی ردا
دن کی چادر ابھی اتاری ہے
شاخ پہ کوئی قہقہہ تو کھلے
کیسی چپ سی چمن پہ طاری ہے
کل کا ہر واقعہ تمہارا تھا
آج کی داستان ہماری ہے

شاعر: گلزار

انتخاب: تبسم بشیر حسین ..... ڈنگہ

غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
تیرے وعدوں پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے جو ہم رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

شاعر: مرزا اسد اللہ خان غالب

انتخاب: جویریہ ضیاء ..... کراچی

غزل

ہمارا دل سویرے کا سنہرا جام ہو جائے
چراغوں کی طرح آنکھیں جلیں جب شام ہو جائے
کبھی تو آسمان سے چاند اترے جام ہو جائے
تمہارے نام کی اِک خوب صورت شام ہو جائے
عجب حالات تھے یوں دل کا سودا ہو گیا آخر
محبت کی حویلی جس طرح نیلام ہو جائے
سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دے ہم کو
ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے
مجھے معلوم ہے اس کا ٹھکانہ پھر کہاں ہوگا
پرندہ آسمان چھونے میں جب ناکام ہو جائے
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

شاعر: بشیر بدر

انتخاب: اقرا وکیل ..... سرگودھا

گاؤں

بہت دور گاؤں ہے میرا
جہاں میرے بچپن کے جگنو
ابھی تک گھنے پیلوں پر چمکتے ہیں
میری زبان سے گرے تو تلے لفظ اب بھی
کئی سال سے غیر آباد گھر کی
پرانی جھکی آخری سانس لیتی ہوئی
سیڑھیوں پر پڑے ہیں
کہ جیسے خموشی کے سینے میں خنجر گڑھے ہیں
بہت دور گاؤں ہے میرا
جہاں شام ہوتے ہی تاریکیاں پھیل جاتی ہیں
جہاں لال ٹینوں کی مدہم لرزتی ہوئی روشنی میں
سبق یاد کرتے ہوئے
میں نے اچھے دنوں کے کئی خواب دیکھے ہیں
بہت دور گاؤں ہے میرا
جہاں میری پہلی محبت کی پرچھائیاں ہیں

اداسی میں ڈوبے ہوئے راستے
کھیت، اسکول، جوہڑ، درختوں کے جھرمٹ
پراسرار تنہائیاں ہیں
بہت دور گاؤں ہے میرا
جہاں چاندراتوں میں خاموش گلیوں سے
بوڑھے درختوں کی شاخوں سے
سوئے ہوئے آنگنوں سے گزر کر
ہوا اب بھی آتی ہے
چپکے سے مجھ کو بلاتی ہے
لیکن نہ پا کر مجھے
لوٹ جاتی ہے
عادت ہوا کی اب تک وہی ہے
کہ
فطرت ہوا کی ابھی تک وہی ہے
مگر
زندگی نے مجھے روند ڈالا ہے
شہروں کی بے راستہ بھیڑ میں

شاعر: نصیر احمد نصیر

انتخاب: نورے ایمان چوہدری...... کمالیہ

غزل

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تُو نے مجھے کھو دیا، میں نے تجھے کھویا نہیں
نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں
ہر طرف دیوار و در اور ان میں آنکھوں کے ہجوم
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لب گویا نہیں
جرم آدم نے کیا اور نسل آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں
جانتا ہوں اِک ایسے شخص کو میں بھی منیر
غم سے پتھر ہوگیا لیکن کبھی رویا نہیں

شاعر: منیر نیازی

انتخاب: عائشہ شکیل...... گوجرہ

غزل

سمندر میں اترتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
تری آنکھوں کو پڑھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھن گئی جب سے
کوئی بھی لفظ لکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ترے کوچے سے اب میرا تعلق واجبی سا ہے
مگر جب بھی گزرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے میرے دل پر
وصی میں جب بھی ہنستا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

شاعر: وصی شاہ

انتخاب: سیما آصف...... کراچی

غزل

آج اِس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی
اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوقِ آوارگی
کوئی پیغامِ گل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
ناز بادِ چمن کے اٹھاتا رہا شوقِ آوارگی
کوئی ہنس کے ملے غنچۂ دل کھلے دل کے سلسلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی
دشمن جاں فلک غیر ہے یہ زمیں، کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

شاعر: حبیب جالب

انتخاب: کرن آفتاب...... کہروڑ پکا

غزل

تیری خوش بو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے
شب کی تنہائی میں اب تو اکثر
گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے
دل کو اس راہ پر چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے
زندگی میری تھی لیکن اب تو

تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے
اس نے دیکھا ہی نہیں ورنہ یہ آنکھ
دل کا احوال کہا کرتی ہے

شاعرہ: پروین شاکر

انتخاب: ماہ رخ...... ڈگری، سندھ

غزل

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے' لٹ بھی چکے
اور محبت ہی انداز پرانے مانگے
زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جان فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

شاعر: احمد فراز

انتخاب: شبنم نور...... گجرات

غزل

نظر نظر بے قراری ہے' نفس نفس میں شرار سا ہے
میں جانتا ہوں کہ تم نہ آؤ گے پھر بھی کچھ انتظار سا ہے
مرے عزیز و مرے رفیقو کوئی نئی داستان چھیڑو
غم زمانہ کی بات چھوڑو یہ غم تو اب سازگار سا ہے
کبھی تو آؤ' کبھی تو بیٹھو' کبھی تو دیکھو' کبھی تو پوچھو
تمہاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے
چلو کہ جشنِ بہار دیکھیں' چلو کہ ظرفِ بہار جانچیں
چمن چمن روشنی ہوئی' کلی کلی پر نکھار سا ہے
یہ زلف بردوش کون آیا یہ کس کی آہٹ سے گل کھلے ہیں
مہک رہی ہے فضائے ہستی تمام عالم بہار سا ہے

شاعر: ساغر صدیقی

انتخاب: فرح عالم...... کراچی

غزل

کنج حیرت سے چلے دشتِ زیاں تک لائے
کون لا سکتا ہے ہم دل کو جہاں تک لائے
ایک ہنگامہ بپا ہے پسِ دیوار بدلنا
ہے کسے تابِ سخن کون زباں تک لائے
ٹھیک ہے چشم تغافل یہ تری دین سہی
تاب زخموں کی مگر کوئی کہاں تک لائے
آنکھ ویراں تھی کسی دشتِ تپاں کی صورت
ہم اسے سلسلہ آب رواں تک لائے
چل نکلتی ہے تو لب پہ بھی آجاتی ہے
لانے والے کی یہ مرضی ہے جہاں تک لائے

شاعر: بدر منیر

انتخاب: مہک چوہدری...... لاہور

غزل

وہ باتیں تری' وہ فسانے ترے
شگفتہ شگفتہ بہانے ترے
مظالم ترے عافیت آفریں
مراسم سہانے سہانے ترے
فقیروں کی جھولی نہ ہوگی تہی
ہیں بھرپور جب تک خزانے ترے
دلوں کو جراحت کا لطف آگیا
لگے ہیں کچھ ایسے نشانے ترے
اسیروں کی دولت اسیری کا غم
نئے دام تیرے پرانے ترے
عدم بھی ہے ترا حکایت کدہ
کہاں تک گئے ہیں فسانے ترے

شاعر: عبدالحمید عدم

انتخاب: طلعت نظامی...... کراچی

غزل

ہو ہستی مری افتخارِ غزل
میں رکھوں گی قائم وقارِ غزل

سبھی کو وہ کہتا ہے جانِ غزل
یوں کرتا ہے وہ کاروبارِ غزل
میں نظمیں بھی کہتی رہی ہوں یہاں
ہے مجھ کو پسند انحصارِ غزل
محبت، عداوت، وفا، دشمنی
ہاں ایسا ہی پایا دیارِ غزل
جو اُن کی مجھے یاد آنے لگے
اترتی ہے پھر آبشارِ غزل
ہیں باتیں کبھی ان کی یادیں کبھی
مہکتا رہا ہے دیارِ غزل
نہ جانے شگفتہ کہاں کھو گیا
جو کہتا تھا سب کو بہارِ غزل
شاعر: شگفتہ شفیق

انتخاب: منزہ عالم......لاہور

غزل

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہاں کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
شاعر: میر تقی میر

انتخاب: نزہت جبین ضیاء......کراچی

غزل

مدت کے بعد لوٹ آیا ہوں گاؤں میں
ماضی سمٹ کے آ گیا ہے برگد کی چھاؤں میں
انسانیت کا سانس بھی لینا محال ہے
یہ کس نے زہر گھول دیا ہے ہواؤں میں
ہم لوگ نسلِ آدم و حوا ہیں اس لیے
آتا ہے لطف آج بھی ہم کو خطاؤں میں
شاید کسی نے یاد کیا ہے ابھی مجھے
پھیلی ہوئی ہے عشق کی خوش بو فضاؤں میں
برسات ہو رہی ہے مگر تُو نہیں ملا
تصویر تری ڈھونڈ رہا ہوں گھٹاؤں میں
دنیا کی مشکلات کی کیا فکر ہو حسن
ہم نے سکون پایا ہے ماں کی دعاؤں میں
شاعر: حسن فتح پوری

انتخاب: مہرین جلال......کراچی

غزل

نگاہوں کے تصادم سے عجب تکرار کرتا ہے
یقین کامل نہیں لیکن گماں ہے پیار کرتا ہے
لرز جاتی ہوں میں یہ سوچ کر کہیں کافر نہ ہو جاؤں
دل اس کی پوجا پہ بڑا اصرار کرتا ہے
اسے معلوم ہے شاید میرا دل ہے نشانے پر
لبوں سے کچھ نہیں کہا نظر سے وار کرتا ہے
میں اسے پوچھتی ہوں خواب میں مجھ سے محبت ہے
پھر آنکھیں کھول دیتی ہوں وہ جب اظہار کرتا ہے
شاعرہ: پروین شاکر

انتخاب: ارم صابرہ......تلہ گنگ

www.naeyufaq.com